میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو

حصہ اول

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

قیمت حصہ اول

طبع دوم سنہ ۱۹۳۹ء ۳۰۰۰
مطبوعہ جید برقی پریس دہلی



کملا نہرو

میری کہانی

(جلد اول)

فہرست مضامین

جان ہار کملا
کے نام

پہلی بات

یہ ساری کتاب میں نے جون ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء تک جیل میں لکھی تھی۔ اب سوا اس کے کہ کہیں کہیں ایک آدھ لفظ بدلا، یا جو باتیں بعد میں کہنے کی تھیں انھیں ایک الگ باب میں لکھ دیا، اور کچھ گھٹایا بڑھایا نہیں۔ اس کے لکھنے میں اصل میں دو چیزیں میرے سامنے تھیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے لئے کوئی خاص کام ٹھہرالوں، اور اسی میں لگا رہوں، کیونکہ بے اس کے جیل میں تنہائی کے پہاڑ سے دن کاٹے نہیں کٹتے، دوسرے یہ کہ ان واقعات کا جائزہ لے ڈالوں جو ہندستان میں پچھلے زمانے میں پیش آئے اور جن سے مجھے بھی تعلق رہا، تاکہ انھیں صاف اور سلجھی ہوئی نظر سے دیکھ سکوں۔ میں نے یہ کام اس طرح شروع کیا جیسے کوئی اپنے آپ سے اپنے دل کی باتیں کھود کھود کر پوچھتا ہے اور یہی رنگ بڑی حد تک ساری کتاب میں قائم رہا۔ اس کے لکھنے میں میں نے کوئی خاص اہتمام پڑھنے والوں کا لحاظ رکھ کر نہیں کیا۔ اگر مجھے پڑھنے والوں کا دھیان آیا بھی تو صرف اپنے دیس کے مردوں اور عورتوں کا۔ بدیسیوں کے لئے لکھنا ہوتا تو شاید میں اور طرح لکھتا یا اور چیزوں

پر زور دینا۔ اس صورت میں بعض باتوں کو جن کا یہاں رواروی میں ذکر کردیا ہے زیادہ صراحت سے بیان کرنا اور بعض کو جنھیں یہاں تفصیل سے لکھا ہے محض سرسری طور پر لکھنا ممکن ہے کہ ہندوستان کے باہر کے لوگوں کو ان چیزوں سے جو تفصیل سے لکھی گئی ہیں دلچسپی نہ ہو یا ان کے نزدیک یہ معمولی یا ایسی کھلی ہوئی باتیں ہوں جن میں بحث کی گنجائش نہیں مگر میرے خیال میں آج کل کے ہندوستانیوں کے لئے یہ کسی قدر اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح شاید ہمارے ملک کے بعض سیاسی معاملات اور بعض اشخاص کا ذکر بھی باہر والوں کے لئے دلچسپی سے خالی ہوگا۔

امید ہے کہ پڑھنے والے اس بات کا لحاظ رکھیں گے کہ یہ کتاب ایسے زمانے میں لکھی گئی جو میری زندگی میں بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ اس کا اثر کتاب میں صاف نظر آتا ہے۔ اگر میں معمولی حالت میں لکھتا تو تحریر کا رنگ کچھ اور ہوتا اور میں بعض موقعوں پر زیادہ ضبط سے کام لیتا۔ مگر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ جیسی ہے ویسی ہی رہنے دوں کیونکہ شاید لوگوں کے لئے یہی شکل زیادہ دلچسپ ہو جس سے وہ جذبات ظاہر ہوتے ہیں جو لکھتے وقت میرے دل میں تھے۔

میں نے صرف یہ کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہوسکے اپنے ذہن کی نشوونما دکھاؤں۔ ہندوستان کی پچھلے زمانے کی تاریخ لکھنا مقصود نہیں۔ دیکھنے میں یہ کتاب تاریخ سی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس سے پڑھنے والوں کو غلط فہمی ہو اور وہ اسے اتنی اہمیت دیں جس کی یہ مستحق نہیں۔ اس لئے میں یہ جتائے دیتا ہوں کہ اس میں بات کا صرف ایک ہی پہلو دکھایا گیا ہے اور وہ لازمی طور پر شخصی اور ذاتی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے بہت سے اہم واقعات کا اور بہت سے اشخاص کا جنھوں نے واقعات پر اثر ڈالا ذکر تک نہیں ہے۔ اگر یہ سچ مچ تاریخ ہوتی تو یہ طریقہ سخت قابل اعتراض تھا لیکن یہ تاریخ نہیں آپ بیتی ہے اس لئے اتنی رعایت کی ضرور مستحق ہے جو لوگ پچھلے دنوں کے واقعات

کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انھیں اور ڈھکانے ڈھونڈنے پڑیں گے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انھیں اس کتاب سے اور اس قسم کی اور آپ بیتیوں سے تاریخ کی کڑیاں ملانے میں اور واقعات کی لڑیاں پرونے میں مدد ملے۔

میں نے اپنے بعض رفیقوں کے متعلق، جن کے ساتھ میں برسوں سے کام کر رہا ہوں اور جو مجھے دل سے عزیز ہیں، آزادی سے اظہار رائے کیا ہے۔ میں نے جماعتوں اور شخصوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور اس میں بعض جگہ سختی سے کام لیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جو لوگ قومی معاملات میں قدم رکھتے ہیں انھیں ایک دوسرے سے، اور قوم سے جس کی خدمت کا یہ دعویٰ کرتے ہیں، صاف گوئی برتنی چاہیئے۔ آپس میں ظاہر داری کا برتاؤ کرنے سے، ٹیڑھے سوالوں کو ٹال جانے سے نہ تو ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان معاملات کو جو ہمیں درپیش ہیں سچے اتحاد عمل کی بنیاد اس پر ہونی چاہیئے کہ جن باتوں میں ہم میں اتفاق ہے اور جن میں اختلاف ہے ان سب کو اچھی طرح جان لیں اور واقعات کو چاہے وہ کتنے ہی بے ڈھب ہوں آنکھ سے آنکھ ملا کر دیکھیں۔ مگر اپنے نزدیک میں نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس میں کسی شخص سے بیر یا جلن کی جھلک پائی جاتی ہو۔

میں نے جان بوجھ کر ہندوستان کے آج کل کے معاملات کو نہیں چھیڑا ہاں کہیں کہیں اور باتوں کی ذیل میں سرسری طور پر ان کا ذکر آگیا ہے۔ جیل میں اس کا موقع نہ تھا کہ ان معاملات کی چھان بین کر کے ان سے پوری طرح بحث کر سکوں یہاں تک کہ میں خود اپنے دل میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان سے کس طرح نبٹنا چاہیئے۔ رہائی کے بعد بھی میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھوں کیونکہ یہ کتاب کے مضمون کے ساتھ کھپتا نہیں تھا، غرض یہ آپ بیتی پچھلے زمانے کے واقعات کا ایک شخصی سرسری اور ادھورا بیان ہے

جو موجودہ زمانے کے لگ بھگ آ پہنچا ہے مگر اسے چھونے سے احتیاط کے ساتھ دامن بچائے ہوئے ہے۔

جواہر لال نہرو

بادن وائلر
۲ جنوری ۱۹۳۶ء

(۱)

خاندان کا کشمیر سے آنا

اپنے حالات آپ لکھنا بڑا مشکل اور نازک معاملہ ہے۔ اگر انسان اپنی برائی کرے تو اپنا دل دکھتا ہے اور تعریف کرے تو پڑھنے والوں کو برا لگتا ہے۔ (ابراہم کاؤلے)

خوش حال ماں باپ کا اکلوتا بچہ، خصوصاً ہندوستان کے گھرانوں میں اکثر لاڈ پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے۔ اور جب گیارہ برس کی عمر تک اس کے کوئی بھائی بہن نہ ہو، پھر تو وہ بگڑنے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ میری دونوں بہنیں مجھ سے بہت چھوٹی ہیں اور ان میں بھی کئی سال کا فرق ہے۔ اس لئے میرا بچپن تنہائی میں گذرا اور مجھے اپنی عمر کا کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اسکول کے بچوں کی صحبت سے بھی محروم رہا، کیونکہ مجھے کنڈر گارٹن یا کسی اور مکتب میں داخل نہیں کیا گیا بلکہ گھر پہ اُستانیاں اور اتالیق رکھ کر تعلیم دلائی گئی۔

ہمارے گھر میں تنہائی نہیں بلکہ خوب چہل پہل تھی۔ میرے رشتے کے بھائی بہن اور قریبی عزیز ملا کر بہت بڑا کنبہ تھا اور یہ سب ہندو خاندان کے دستور کے مطابق ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ مگر میرے بھائی مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے ان میں کچھ اسکول میں اور کچھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور مجھے بچہ سمجھ کر اپنے کام میں اور کھیل میں شریک نہیں کرتے تھے۔ غرض میں اتنے بڑے گھرانے میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا پاتا تھا اور زیادہ تر اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا یا کہیں الگ بیٹھ کر کھیلا کرتا تھا۔

ہم لوگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے۔ اب سے کوئی سوا دو سو برس پہلے، اٹھارھویں صدی کے شروع میں، ہمارے پردادا کے باپ کشمیر کی پہاڑی وادی کو چھوڑ کر دولت اور شہرت کی تلاش میں نیچے کے زرخیز میدان میں آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ فرخ سیر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ ہمارے بزرگ جن کا نام راج کول تھا کشمیر میں سنسکرت اور فارسی کے عالم کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ جب فرخ سیر کشمیر گیا تو اس کی نظر عنایت راج کول پر پڑی اور غالباً اسی کے حکم سے وہ ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ترک وطن کر کے دلی آ گئے۔ بادشاہ نے انھیں جاگیر عطا کی جس میں ایک مکان بھی تھا۔ یہ مکان نہر کے کنارے واقع تھا جس کی وجہ سے راج کول نہرو کہلانے لگے۔ اب خاندان کا نام "کول" کی جگہ "کول نہرو" قرار پایا۔ آگے چل کر کول تو اڑ گیا اور صرف نہرو باقی رہ گیا۔

اس کے بعد جو بدامنی کا زمانہ آیا اس میں ہمارے خاندان کو تقدیر نے بہت سے نشیب و فراز دکھائے۔ ہماری جاگیر گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہو گئی۔ میرے پردادا لکشمی نراین نہرو نے "سرکار کمپنی" کی ملازمت اختیار کی اور اس کی طرف سے دلی کے برائے نام دربار میں وکیل بنا کر بھیجے گئے۔ میرے دادا گنگا دھر نہرو ۱۸۵۷ء کی شورش سے پہلے، کچھ دن دلی کے کوتوال رہے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں ۳۴ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہم لوگوں سے دلی ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی اور ہمارے پرانے خاندانی کاغذات اور دستاویزیں بھی اسی گڑبڑ میں تلف ہو گئیں۔ ہمارا خاندان اپنی ساری املاک کھو کر اور بہت سے لوگوں کی طرح جو دلی کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، آگرے پہنچا۔ میرے والد اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے مگر میرے دونوں چچا خاصے جوان تھے۔ ان کو تھوڑی بہت انگریزی بھی آتی تھی جس کی بدولت

چھوٹے بھائی نے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان والوں کو ناگہانی اور ذلت کی موت سے بچالیا۔ وہ چند عزیزوں کے ساتھ، جن میں ان کی ننھی سی بہن بھی تھی دلی سے جا رہے تھے یہ لڑکی بعض کشمیری بچوں کی طرح بہت صاف رنگ کی تھی۔ رستے میں کچھ گورے ملے جنھیں شبہ ہوا کہ یہ کسی انگریز کی لڑکی ہے جسے میرے چچا چرا کر لیے جا رہے ہیں ان دنوں الزام لگانا، سرسری تحقیقات کرنا اور سزا دینا یہ سارے مرحلے چند منٹ میں طے ہو جاتے تھے اور کچھ تعجب نہیں تھا کہ میرے چچا اور دوسرے عزیزوں کو سب سے قریب کے درخت پر پھانسی دے دی جاتی۔ مگر خوش قسمتی سے چچا جان کی انگریزی دانی کام آگئی اور تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ اتنے میں کوئی شخص جو ان لوگوں سے واقف تھا ادھر سے گذرا اور اس نے انھیں رہائی دلائی۔

چند سال ہمارا خاندان آگرے میں رہا اور اسی شہر میں[1] ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو میرے والد پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے تین مہینے پہلے دادا جان کا انتقال ہو چکا تھا ان کی ایک قلمی تصویر ہمارے یہاں اب تک موجود ہے۔ وہ مغل دربار کا لباس پہنے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک خمدار تلوار ہے۔ ان کا چہرہ مہرہ بالکل کشمیری ہے پھر بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی مغل امیر کی تصویر ہے۔ اب خاندان کی پرورش کا بوجھ میرے دونوں چچاؤں پر پڑا جو عمر میں والد سے بہت بڑے تھے۔ بڑے چچا بنسی دھر نہرو حکومت برطانیہ کے محکمۂ عدالت میں نوکر ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتے رہے اور ان کا تعلق ایک حد تک خاندان سے قطع ہو گیا۔ چھوٹے چچا نندلال نہرو نے ایک ہندوستانی ریاست کی ملازمت اختیار کی اور دس برس تک راجپوتانے کی ریاست کھیتری میں دیوان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے قانون سیکھا اور

---

(۱) یہ عجیب اتفاق ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کی ولادت بھی ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو ہوئی۔

آگرے میں وکالت کرنے لگے۔

میرے والد نے انھیں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور ان کے تعلقات میں برادرانہ الفت نے باپ بیٹے کی سی محبت کے ساتھ مل کر ایک عجیب شان پیدا کر دی تھی۔ والد اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ وہی اپنی ماں کے لاڈلے تھے۔ دادی جان اپنے ارادے کی پکی تھیں اور مجال نہ تھی کہ کوئی ان کی بات کو ٹال دے۔ ان کی وفات کو پچاس برس ہوگئے مگر ابھی تک بوڑھی کشمیری خواتین ان کا ذکر کرتی ہیں کہ وہ بڑے طنطنے کی نابی تھیں اور اگر کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہو تو آفت مچا دیتی تھیں۔

میرے چچا ہائی کورٹ میں جو نیا نیا قائم ہوا تھا، وکالت کرنے لگے اور جب وہ گرے سے الہ آباد منتقل ہوا تو ہمارا خاندان بھی وہیں چلا گیا۔ اس وقت سے الہ آباد ارا وطن ہو گیا۔ اسی شہر میں ایک مدت کے بعد میں پیدا ہوا۔ میرے چچا کا کام رفتہ نتہ بہت بڑھ گیا اور ان کا شمار ہائی کورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ اس رصے میں میرے والد کانپور اور الہ آباد میں اسکول اور کالج کی تعلیم کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے صرف عربی فارسی پڑھی اور انگریزی کہیں بارہ چودہ برس کی میں جاکر شروع کی۔ اس کم سنی میں وہ فارسی کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں ان کی شہرت زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے ں۔ وہ کوئی قابل تقلید طالب علم نہ تھے۔ پڑھنے لکھنے سے زیادہ انھیں کھیل کود اور من چلے ن کی حرکتوں سے دلچسپی تھی۔ کالج میں وہ فسادی لڑکوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے یں مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا بہت شوق تھا حالانکہ اس وقت تک کلکتہ ی جیسے شہروں کے سوا اور جگہ ہندوستانیوں میں ان چیزوں کا رواج بہت ہی کم تھا ا کر شوخیوں کے باوجود انگریز پروفیسر ان پر مہربان تھے اور اکثر ان مشکلوں میں

ان کی مدد کرتے تھے جن میں وہ اپنی شرارت کی وجہ سے پھنس جاتے تھے۔ ان میں سے ایک میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پرنسپل مسٹر ہیریسن بھی تھے۔ ان کا ذکر میرے والد آخر عمر میں ہم لوگوں کے سامنے بڑی محبت سے کیا کرتے تھے اور اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک خط جو ان بزرگ نے انھیں لکھا تھا، انھوں نے بڑی احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔

یونیورسٹی کے ابتدائی امتحانوں میں انھوں نے کوئی خاص امتیاز تو حاصل نہیں کیا مگر پاس ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ بی۔ اے کے امتحان کی نوبت آئی اس کے لئے انھوں نے بہت کم محنت کی تھی اور پہلے پرچے کے جواب جو انھوں نے دئے، ان کے خیال میں بالکل ناقابل اطمینان تھے۔ یہ سمجھ کر کہ پہلا پرچہ بگڑ گیا ہے وہ کامیابی سے مایوس ہو گئے اور امتحان چھوڑ چھاڑ تاج محل کی سیر کرنے لگے۔ (ان دنوں یونیورسٹی کے امتحان آگرے میں ہوتے تھے) بعد میں ان کے پروفیسر نے انھیں بلا کر بہت ڈانٹا اور کہا کہ تمھارا پہلا پرچہ اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ تم نے سخت حماقت کی، کہ دوسرے پرچوں میں شریک نہیں ہوئے۔ بہرحال میرے والد کی یونیورسٹی کی تعلیم یہیں ختم ہو گئی۔ بی۔ اے انھوں نے پاس نہیں کیا۔

ان کے دل میں ترقی کی امنگ تھی اور وہ کوئی علمی پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نظر قانون کے پیشے پر پڑی کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں یہی ایک پیشہ تھا جس میں قابل آدمی کھپ سکتے تھے اور جسے اس میں کامیابی حاصل ہو جائے اس کے پو بارے تھے۔ پھر ان کے سامنے بھائی کی مثال بھی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا اور اس میں اول نمبر پہ پاس ہو کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اب انھیں اپنی پسند کا کام مل گیا یا یوں کہئے کہ جو کام ایک بار اختیار کر لیا اس میں کامیابی حاصل کرنے پر تل گئے۔

انھوں نے کانپور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کر دی۔ ترقی کی

دُھن میں انھوں نے خوب محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا کام چل نکلا مگر کھیل تماشوں کے شوق کا وہی حال تھا اور اب بھی ان کا تھوڑا بہت وقت اس میں صرف ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپی انھیں کشتی سے تھی۔ کانپور کے دنگل اس زمانے میں مشہور تھے۔

کانپور میں تین سال کام سیکھنے کے بعد وہ الہ آباد آ گئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان کے بھائی پنڈت نندلال نہرو کا یکایک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ میرے والد کے لئے بہت سخت تھا۔ ایک طرف تو یہ غم کہ وہ پیارا بھائی جس نے بیٹے کی طرح پالا تھا جدا ہو گیا دوسری طرف یہ فکر کہ خاندان کا سردار اور سب سے زیادہ کمانے والا فرد اُٹھ گیا۔ اس دن سے ایک بہت بڑے کنبے کی پرورش کا بہت سا بوجھ اس کم عمری میں میرے والد پہ پڑ گیا۔

انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ وکالت میں کامیابی حاصل کر کے رہیں گے، اور کئی مہینے تک اور سب کچھ چھوڑ کر اسی میں محو رہے۔ چچا کے قریب قریب کل مقدمے انھیں کو ملے اور چونکہ انھوں نے اس کام کو بڑی عمدگی سے انجام دیا اس لئے ان کی وکالت خوب چمکی اور وہ بات جس کی انھیں دلی تمنا تھی حاصل ہو گئی یعنی انھیں کام بھی زیادہ ملنے لگا اور آمدنی بھی بڑھ گئی۔ نوجوانی میں کامیاب وکیل ہو جانے کا خمیازہ انھیں یہ بھگتنا پڑا کہ ان کے محبوب پیشے نے جسے اپنی محبت میں شرکت گوارا نہیں ان کی ساری زندگی پر قبضہ کر لیا۔ انھیں اور کسی ذاتی یا قومی کام کا وقت ہی نہیں ملتا تھا اور چھوٹی بڑی تعطیلوں کا زمانہ بھی وکالت ہی کی نذر ہو جاتا تھا۔ انھیں دنوں نیشنل کانگرس انگریزی جاننے والے اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی میرے والد بھی اس کے بعض جلسوں میں شریک ہوئے اور اصولی طور پر اس کے حامی بن گئے مگر اس زمانے میں انھیں اس کے کام سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایک تو انھیں اپنے پیشے سے فرصت نہیں ملتی تھی دوسرے وہ سیاسی مسئلوں اور قومی کاموں

ہیں کچھ اٹکل بھی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ابھی تک ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور ان سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ کسی ایسی تحریک یا انجمن میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے جس میں انھیں دوسرے کی پیروی کرنی پڑے۔ ان میں جو خودسری بچپن اور نوجوانی میں تھی، وہ بظاہر دب گئی تھی، مگر اصل میں اس نے ایک نئی یعنی طلب قوت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے انھیں ان کے پیشے میں کامیاب کیا اور ان کے دل میں خودداری اور اعتماد نفس کے جذبات پیدا کئے۔ انھیں لڑنے کا خصوصاً زبردست سے مقابلہ کرنے کا شوق تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں وہ سیاسی میدان کے قریب تک نہ آتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اس وقت تک نیشنل کانگرس کی سیاست میں لڑائی کو دخل بھی نہ تھا۔ بہرحال وہ اس کوچے سے نابلد تھے اور ان کے دل میں ہر وقت اپنے کٹھن پیشے کا خیال بسا رہتا تھا۔ انھوں نے ترقی کے زینے پر مضبوطی سے قدم جما لیا تھا اور ایک ایک سیڑھی کرکے اوپر چڑھتے چلے جاتے تھے۔ انھیں اس پر فخر تھا کہ اس میں کسی کے احسان یا عنایت کو دخل نہیں بلکہ یہ خود ان کے دماغ اور ارادے کا کرشمہ ہے۔

گو وہ ایک معنی میں قوم پرست تھے مگر انگریزوں کو اور ان کے طور طریقے کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم ہندوستانیوں کا اخلاق اس قدر پست ہو چکا ہے کہ جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہم ایک حد تک اس کے مستحق ہیں۔ وہ ان سیاسیوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو باتیں بہت بناتے ہیں اور کرتے کچھ نہیں، حالانکہ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ آخر اور کیا کیا جائے۔ پھر ان کی ذاتی کامیابی نے ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا کر دیا تھا کہ سب تو نہیں مگر بہت سے لوگ جب اور پیشوں میں ناکام رہتے ہیں تو سیاست کو لے بیٹھتے ہیں۔

آمدنی میں روز بروز اضافہ ہونے سے ہمارا زندگی کا طریقہ بہت کچھ

بدل گیا۔ اِدھر آمدنی بڑھتی گئی، اُدھر خرچ بڑھتا گیا۔ روپیہ جمع کرنے کو میرے والد اپنی کمانے کی قوت کی توہین سمجھتے تھے۔ انھیں بھروسا تھا کہ میں جب چاہوں اور جتنا چاہوں پیدا کر سکتا ہوں۔ کھیل تماشے کے شوق اور عیش و عشرت کے ذوق میں جو کچھ ملتا سب اڑا دیتے۔ رفتہ رفتہ ہمارے طرز زندگی میں مغربی رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔

یہ تھا ہمارے گھر کا نقشہ جو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا۔[1]

---

(۱) میری پیدائش الہ آباد میں ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو ہوئی۔

(۳)

بچپن کا زمانہ

میرا بچپن دنیا کے بکھیڑوں سے محفوظ، اور واقعات سے خالی تھا۔ میں اپنے رشتے کے بھائیوں کی بات چیت، جو میرے سِن سے اونچی تھی سُنا کرتا تھا اور بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یہ لوگ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے کہ انگریز اور گرانی ہندوستانیوں سے حقارت کا برتاؤ کرتے ہیں اور ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس ذلت کو چپ چاپ نہ سہے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ حاکم اور محکوم میں آئے دن اس طرح کے جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ اور ان کے قصّے ہمارے گھر میں چھڑے رہتے تھے۔ یہ چرچا عام تھا کہ جب کبھی انگریز ہندوستانی کو مار ڈالتا ہے، اس کے ہم قوموں کی جوری اسے بری کر دیتی ہے۔ ریلوں میں کچھ ڈبّے انگریزوں کے لئے محفوظ ہوتے تھے اور چاہے گاڑی میں کتنی ہی بھیڑ ہو (ان دنوں بھیڑ ہوتی بھی بہت تھی) کسی ہندوستانی کی مجال نہ تھی کہ ان ڈبوں میں گو وہ خالی ہی کیوں نہ ہوں سفر کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ انگریز غیر محفوظ ڈبّے پر بھی قبضہ کر لیتا تھا اور کسی ہندوستانی کو اس میں قدم رکھنے نہیں دیتا تھا۔ اسی طرح پارک وغیرہ میں بھی یورپیوں کے لئے محفوظ بنچیں ہوتی تھیں۔ مجھے بدیسی حاکموں کی ان بیہودہ حرکتوں پر بڑا غصّہ آتا تھا اور جب کوئی ہندوستانی کلّہ بہ کلّہ جواب دیتا تھا تو میں بہت خوش ہوتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود میرے بھائیوں یا ان کے دوستوں میں سے کسی کی جھڑپ انگریز سے ہو جائے۔ پھر تو ظاہر ہے کہ ہم سب کو بڑا جوش آتا تھا۔ میرے ایک رشتے

کے بھائی جو گھر بھر میں سب سے مضبوط تھے، او بڑا کر انگریزوں سے اور اس سے زیادہ کرانیوں سے لڑ بیٹھتے تھے، اس لئے کہ کرانی، شاید یہ دکھانے کو کہ ہم بھی حاکم قوم میں سے ہیں، انگریز عہدہ داروں اور تاجروں سے زیادہ بدتمیزی کرتے تھے یہ جھگڑے خاص طور پر ریل کے سفر میں پیش آتے تھے۔

اگرچہ مجھے بدیسی حاکموں کا ہونا اور ان کا یہ برتاؤ بہت برا لگتا تھا لیکن جہاں تک یاد ہے، افراد کی حیثیت سے مجھے انگریزوں سے کوئی کد نہیں تھی میں ہم استانیوں کی نگرانی میں رہ چکا تھا اور ابا جان کے انگریز دوستوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں دل میں انگریزوں کو اچھا سمجھتا تھا۔

شام کو والد سے ملنے بہت سے دوست آجاتے تھے۔ وہ اس بوجھ کو جو دن بھر دل پر رہتا تھا اتار پھینکتے تھے اور سارا گھر ان کے قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھتا تھا۔ ان کی ہنسی سارے الہ آباد میں مشہور تھی بعض اوقات میں پردے کے پیچھے سے جھانک کر انھیں اور ان کے دوستوں کو دیکھتا تھا اور اس سوچ میں رہتا تھا کہ یہ بڑے بڑے لوگ آپس میں کیا باتیں کیا کرتے ہیں۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میں پکڑ کر باہر لایا جاتا تھا۔ والد مجھے کچھ دیر اپنے گھٹنے پر بٹھا لیتے تھے اور میں ذرا سہما ہوا بیٹھا رہتا تھا ایک بار میں نے انھیں کلیرٹ یا کوئی اور لال رنگ کی شراب پیتے ہوئے دیکھا وہسکی کو تو میں پہچانتا تھا اس لئے کہ میں نے والد کو اور ان کے دوستوں کو اکثر اسے پیتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس نئی سرخ چیز کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے دوڑ کر اماں جان سے کہا کہ ابا جان خون پی رہے ہیں۔

میرے دل میں والد کی بے حد عظمت تھی میں انھیں قوت ہمت اور عقل کا پتلا جانتا تھا اور جتنے آدمی میں نے دیکھے تھے سب سے برتر سمجھتا تھا۔ مجھے آرزو تھی کہ میں بھی بڑا ہو کر ان جیسا ہو جاؤں۔ مگر عظمت اور محبت کے ساتھ ساتھ میرے

دل میں ان کا ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا میں نے انھیں نوکروں وغیرہ پر خفا ہوتے دیکھا تھا اس وقت وہ مجھے بہت ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے اور میں خوف سے اور کبھی کبھی طیش سے کانپنے لگتا تھا کہ نوکروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ان کا غصّہ واقعی بہت بُرا تھا اور میں نے اس وقت کیا اس کے بعد بھی اس کی ٹکّر کا غصّہ نہیں دیکھا مگر یہ اچھا تھا کہ ان میں ظرافت کا مادّہ تھا اور ارادے کے بہت مضبوط تھے، اس لئے عام طور پر ضبط سے کام لیتے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ ضبط کی قوت بڑھتی گئی اور آخر عمر میں شاید ہی کبھی انھیں پہلا سا غصّہ آیا ہو۔

مجھے بچپن کی جو سب سے پہلی باتیں یاد ہیں ان میں والد کا غصّہ بھی ہے اس لئے کہ یہ مجھی پر نازل ہوا تھا میں ان دنوں کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی کام کی میز پر دو سونت قلم (فاؤنٹن پن) رکھے ہوئے دیکھ کر میرا دل للچا گیا میں نے کہا انھیں ایک ساتھ دو قلموں کی تو ضرورت ہونے سے رہی۔ اس لئے ایک میں نے لے لیا۔ بعد میں جب یہ دیکھا کہ اس قلم کی زور شور سے تلاش ہو رہی ہے تو میں بہت ڈرا مگر میں نے اقرار نہیں کیا۔ آخر پتہ چل گیا اور میرے جُرم کا ڈھنڈورا پٹ گیا۔ والد بے حد خفا ہوئے اور میری خوب مرمّت کی۔ میں درد کی تکلیف اور ذلت کے رنج سے بے تاب سیدھا ماں کے پاس پہنچا اور کئی روز تک میرے چھوٹے سے دُکھتے ہوئے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی مالش ہوتی رہی۔

مجھے یاد نہیں کہ اس سزا کی وجہ سے مجھے والد سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو غالباً میرا یہی خیال رہا سزا تھی تو بالکل بجا، مگر حد سے بڑھ گئی تھی لیکن باوجود اس کے کہ میرے دل میں ان کی عظمت اور محبت اسی طرح قائم رہی، اب میں ان سے ڈرنے بھی لگا۔ البتہ والدہ سے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ چاہے میں کچھ بھی کروں وہ درگذر سے کام لیں گی۔ ان کی بے اندازہ محبت کی وجہ سے میں ان کے

ساتھ کسی قدر تحکم کا برتاؤ کرنے لگا تھا۔ والد سے تو کبھی کبھی ملنا ہوتا تھا اور ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا اس لئے ان سے میں زیادہ مانوس تھا۔ اور اپنے دل کی بات جو والد سے کبھی نہ کہتا ان سے کہہ دیا کرتا تھا۔ وہ چھریرے جسم اور چھوٹے سے قد کی تھیں، اور تھوڑے دن میں میرا قد ان کے لگ بھگ جا پہنچا اس لئے میرے دل میں عمر کے فرق کا احساس کم ہو گیا اور وہ مجھے اپنے برابر کی معلوم ہونے لگیں۔ مجھے ان کی پیاری صورت اور ننھے منے ہاتھ پاؤں بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ ایک نووارد کشمیری گھرانے کی تھیں جسے اپنا وطن چھوڑے دو ہی پشتیں گذری تھیں۔

میرے دوسرے ہمراز والد کے ایک محرر منشی مبارک علی تھے۔ وہ بدایوں کے ایک آسودہ حال خاندان سے تھے بے ۱۸۵۷ء کی شورش میں ان کا گھر اُجڑ گیا اور انگریزوں کی فوج نے ان کے خاندان کو قریب قریب ختم کر دیا۔ مصیبت نے ان کے قلب میں رقّت اور درد پیدا کر دیا تھا، اور وہ سب سے خصوصاً بچوں سے بڑی نرمی سے پیش آتے تھے۔ میرے لئے ان کا دامن ایک جانا بوجھا امن کا ٹھکانا تھا۔ جب کبھی اُداس یا پریشان ہوتا انھیں کے پاس پہنچتا۔ اُن کی شاندار سفید داڑھی کو دیکھ کر میں بچپن کی سادگی سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ پرانے دفتوں کے آدمی ہیں جنھیں کئی جُگ کی باتیں یاد ہیں۔ ان کی گود میں بیٹھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائے میں ان کی بے شمار کہانیوں میں سے الف لیلہ اور دوسری کتابوں کے قصّے یا ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے حالات سنا کرتا تھا۔ منشی جی کا انتقال بہت برسوں کے بعد میری جوانی کے زمانے میں ہوا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہیں اور ان کی یاد کو میں دل و جان سے عزیز رکھتا ہوں۔

میری والدہ اور چچی ہندوؤں کی دیو مالا کی کہانیاں اور رامائن اور مہابھارت کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔ میری چچی یعنی پنڈت نند لال کی بیوہ کو ہندوستان

کی پُرانی کتابوں پر عبور تھا اور انھیں اس طرح کے ہزاروں قصّے یاد تھے۔ اس لئے میری معلومات ہندوستان کی دیومالا اور کتھا مالا میں بہت بڑھ گئی۔

مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچیرے بھائی مذہبی امور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ گھر کی عورتیں طرح طرح کی رسمیں مناتی تھیں اور پوجا پاٹ کیا کرتی تھیں۔ مجھے یہ باتیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اگرچہ میں اپنے بڑوں کی تقلید میں کسی حد تک بے پروائی کا اظہار کرتا تھا کبھی کبھی میں والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے الہ آباد، بنارس اور شہروں کے مندروں میں یا ان سنیاسیوں کی خدمت میں جو بڑے مہاتما سمجھے جاتے تھے، لے جاتی تھیں۔ مگر میرے دل پر ان چیزوں کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔

پھر بڑے بڑے تہوار تھے جیسے ہولی جس میں سارا شہر رنگ رلیاں مناتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر خوب پانی پھینکتے تھے۔ یا دیوالی جس میں ایک ایک مکان میں ہزاروں دئے بارے جاتے تھے۔ جنم اشٹمی میں، آدھی رات کو کرشن کے قید خانہ میں پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے لئے آدھی رات تک جاگنا بہت مشکل تھا۔ دسہرے اور رام لیلا میں رام چندر جی کے لنکا جیتنے کی پرانی کہانی، جلوس اور سوانگ کی شکل میں دہرائی جاتی تھی اور تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ہم سب بچے محرم کا جلوس دیکھنے بھی جایا کرتے تھے جس میں علموں کے ریشمی پھریرے لہراتے تھے اور حسنؑ حسینؑ کی شہادت کا ماتم ہوتا تھا۔ دونوں عیدوں کو منشی جی اچھے اچھے کپڑے پہن کر عیدگاہ میں نماز پڑھنے جاتے تھے اور میں ان کے گھر جاکر سویّاں اور دوسرے لذیذ کھانے اڑاتا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوؤں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے تہوار تھے جیسے رکھشا بندھن، بھیا دوج وغیرہ۔

ہم کشمیریوں کے بعض خاص تہوار بھی تھے جو اور ہندوؤں میں نہیں منائے جاتے تھے۔ ان میں سب سے بڑا نوروز یعنی ہمارے سمّت کے شروع ہونے کا تہوار تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لئے خاص خوشی کا دن ہوتا تھا۔ گھر بھر نئے کپڑے پہنتا تھا اور بچوں کو نقدی ملتی تھی۔

مگر ان سب تہواروں سے زیادہ مجھے اس تقریب سے دلچسپی تھی جو ہر سال خاص میرے لئے ہوا کرتی تھی یعنی میری سالگرہ۔ اس دن میرے جوش کو کچھ نہ پوچھئے صبح تڑکے میں ایک بڑی ترازو میں گیہوں وغیرہ سے تلتا تھا اور یہ چیزیں غریبوں کو بانٹ دی جاتی تھیں۔ پھر نئی پوشاک سج کر میں لوگوں سے تحفے لیتا تھا اور شام کو دعوت ہوتی تھی جس میں بہت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو اس برات کا دولھا سمجھ کر میں فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ میری سالگرہ بہت دن کے بعد آتی ہے بلکہ میں نے بہت کچھ شور بھی مچایا کہ یہ تقریب سال میں کئی بار ہوا کرے۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن وہ آئے گا، جب سالگرہ بڑھتی ہوئی عمر کی نشانی بن کر ناگوار ہوا کرے گی۔

بعض اوقات ہمارا سارا خاندان دور کا سفر کر کے دوسرے شہر میں جاتا تھا کہ کسی عزیز یا دوست کی شادی میں شریک ہو۔ ہم بچوں کو اس قسم کے سفر سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ شادی کے زمانے میں قاعدوں کی بندشیں ڈھیلی پڑ جاتیں اور ہم گھر بھر میں آزادی سے پھرتے۔ شادی کے گھر میں کئی خاندان اکٹھے رہتے تھے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو جاتی تھیں۔ ان موقعوں پر مجھے تنہائی کی شکایت نہیں ہو سکتی تھی ہم دل بھر کر کھیل کود اور شرارت کا لطف اٹھاتے اور کبھی کبھی بڑوں کی ڈانٹ بھی کھاتے۔

ہندوستان کے غریبوں اور امیروں کی شادیوں کو لے جا نمائش اور

فضول خرچی کی وجہ سے بہت کچھ برا بھلا کہا گیا ہے اور وہ اس کی مستحق بھی ہیں۔ فضول خرچی کے علاوہ اس عامیانہ آرائش کو دیکھ کر جس میں نفاست اور خوش مذاقی کا نام تک نہیں ہوتا، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ بھی ہوتی ہیں۔ اس کا الزام اصل میں اوسط طبقے کے لوگوں پر ہے۔ غریب لوگ بھی فضول خرچ ہوتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اکثر قرض کے بوجھ میں دب جاتے ہیں۔ مگر یہ بات جو بعض حضرات کہا کرتے ہیں، بالکل مہمل ہے کہ ان کا افلاس ان رسموں کی وجہ سے ہے۔ لوگ اس کو نہیں دیکھتے کہ غریبوں کی زندگی بالکل پھیکی اور سپاٹ ہوتی ہے اور شادی کے موقع پر جو تھوڑا سا گانا بجانا، کھانا کھلانا ہوتا ہے وہ ان کی بے روح مشقت کی خشکی میں ذرا سا رس پیدا کر دیتا ہے اور دم بھر کے لئے انھیں گھر میں گھٹے رہنے اور بے لطف کام میں جتے رہنے سے نجات دے دیتا ہے۔ ایسا کون بے درد ہوگا کہ ان بیچاروں کو جو کبھی کبھار ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے اس سے بھی انھیں محروم کر دے؟ آپ شوق سے فضول خرچی کو روکئے۔ تکلفات کو کم کیجئے۔ (ان بیچاروں کی غریبانہ خوشیوں کے لئے اتنے بڑے بڑے لفظ استعمال کرنا حماقت معلوم ہوتا ہے) مگر خدا کے لئے ان کی زندگی کو اور زیادہ بے رنگ اور اداس نہ بنایئے۔

اسی طرح اوسط طبقوں میں بھی، فضول خرچی اور تکلف سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو یہ شادیاں وہ صحبتیں ہیں جن میں دور افتادہ عزیز اور دوست مدت کے بعد مل بیٹھتے ہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ یہاں دوستوں سے ملنا سہل نہیں ہے خصوصاً بہت سے دوستوں کا ایک جگہ اکٹھا ہونا بہت دشوار ہے اسی وجہ سے شادی کی تقریبیں اس قدر دلعزیز ہیں۔ صرف سیاسی مجلسیں یعنی کانگرس یا اس قسم کی اور کانفرنسیں ان کا مقابلہ کر سکتی ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو لطف صحبت

کے لحاظ سے بھی ان سے بڑھ گئی ہیں۔

کشمیری ایک لحاظ سے اور ہندوستانیوں خصوصاً شمال کے رہنے والوں سے فائدے میں ہیں۔ ان کے یہاں پردے کی رسم کبھی نہیں تھی۔ جب وہ نیچے کے میدانوں میں آئے اور انھوں نے یہاں پردے کا رواج دیکھا تو انھوں نے بھی اسے اختیار کر لیا اس لئے کہ وہ عموماً شمالی ہند میں رہے اور یہاں یہ شرافت کی لازمی شرط سمجھی جاتی تھی مگر پھر بھی ان میں زیادہ گہرا پردہ نہیں اور جو ہے وہ بھی صرف غیر کشمیریوں کے مقابلے میں ہے۔ آپس میں ان کے یہاں عورت مرد آزادی سے ملتے ہیں اور ہر کشمیری بے تکلف دوسرے کشمیریوں کے گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔ ان کی تقریبوں اور دعوتوں میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ شریک ہوتے ہیں اگرچہ عموماً عورتوں کی ٹولی الگ بیٹھتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں کم و بیش برابری کے ساتھ ملتی جلتی ہیں۔ البتہ مغرب کی سی آزادی ان میں نہیں ہے۔

اس طرح سے میری زندگی کے ابتدائی سال گذرے۔ بعض اوقات جیسا کہ بڑے خاندانوں میں لازمی طور پہ ہوتا ہے، آپس میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ جب یہ بہت بڑھ جاتی تو میرے والد کو خبر ہوتی، وہ بہت خفا ہوتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ سب عورتوں کی بے وقوفی کا نتیجہ ہے۔ یہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصہ کیا ہے مگر میں دیکھتا تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے بُری طرح گفتگو کرتے ہیں یا کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ مجھے اس سے بہت رنج ہوتا تھا اگر والد نے دخل دیا تو گھر بھر تھرّا اٹھتا تھا۔

اس زمانے کا ایک چھوٹا سا واقعہ میرے حافظے میں اب تک نقش ہے میری عمر کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی۔ میں روز چھاؤنی کے ایک سوار کے ساتھ گھوڑے پہ سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن شام کو میں گر پڑا، اور میرا ٹٹو

(یہ بڑا خوب صورت جانور تھا جس میں عرب خون بھی شامل تھا) میرے بغیر گھر واپس گیا۔ والد کے یہاں اس وقت ٹینس پارٹی تھی۔ ایک ہل چل مچ گئی اور پارٹی کے سب کے سب لوگ میرے والد کے پیچھے مختلف سواریوں کا ایک جلوس بنا کر مجھے ڈھونڈھنے نکلے۔ میں انھیں راستے میں مل گیا اور انھوں نے مجھے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے میں نے کوئی بڑا بہادری کا کام کیا ہو!۔

(۳)

تھیوسوفی

جب میں دس سال کا ہوا تو ہم لوگ ایک نئے گھر میں اُٹھ گئے جو پہلے گھر سے بہت بڑا تھا۔ اس کا نام میرے والد نے "آنند بھون" رکھا۔ اس میں ایک بہت بڑا باغ اور ایک تیرنے کا حوض تھا اور میں بڑے جوش میں روز نئی نئی چیزیں دریافت کرتا تھا۔ عمارت میں اضافہ ہو رہا تھا اور کھدوانے بنانے کا کام زوروں پر تھا۔ میں بڑے شوق سے مزدوروں کو کام کرتے دیکھا کرتا تھا۔

تیرنے کا بڑا سا حوض گھر میں تھا ہی اس لئے میں نے بہت جلد تیرنا سیکھ لیا اور پانی سے مانوس ہو گیا۔ گرمی کے لمبے تپتے دنوں میں وقت بے وقت حوض میں جا کر ڈبکی لگاتا تھا۔ یہ میرے لئے ایک انوکھا تماشا تھا اور بجلی کی روشنی جو اس میں اور سارے گھر میں لگی تھی ان دنوں الہ آباد میں نئی چیز سمجھی جاتی تھی۔ سب کے ساتھ مل کر نہانے سے میں بہت خوش ہوتا تھا اور جو لوگ تیرنا نہیں جانتے تھے، انھیں پانی میں ڈھکیل کر یا کھینچ کر ڈرانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ ان میں ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کی حالت مجھے خاص طور پر یاد ہے جو اس زمانے میں الہ آباد میں وکالت کا کام سیکھ رہے تھے۔ وہ تیرنا جانتے بھی نہیں تھے اور سیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ پہلی سیڑھی پر، ڈیڑھ فٹ پانی میں بیٹھے رہتے اور دوسری سیڑھی تک جانے پر بھی کسی طرح راضی نہ ہوتے۔ اگر کوئی انھیں سرکانا چاہتا تو بہت چیختے چلاتے۔ میرے والد کو بھی تیرنا کچھ یوں ہی سا آتا تھا۔ مگر وہ دانت بھینچ کر اور تن بدن کا زور لگا کر

کسی نہ کسی طرح حوض کو پار کر لیتے تھے۔

ان دنوں جنوبی افریقہ میں بوئر لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس سے بڑی دلچسپی تھی اور میں دل و جان سے بوئروں کا طرفدار تھا۔ لڑائی کی خبروں کے شوق میں، میں نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

مگر اسی زمانے میں ہمارے گھر میں ایک نئی بات ہوئی جس نے میری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی، یعنی میری چھوٹی بہن پیدا ہوئی۔ میں دل ہی دل میں کڑھا کرتا کہ میرے کوئی بھائی بہن نہیں اور سب کے ہیں اس لئے یہ امید بڑی خوش گوار تھی کہ ایک ننھا سا بھائی یا ننھی سی بہن ہونے والی ہے جو خاص میری ہی ہوگی۔ والدان دنوں یورپ گئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں برآمدے میں بڑی بے چینی سے اس واقعے کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر نے آکر مجھے یہ خبر سنائی اور کہا کہ تم خوش ہوگے کہ لڑکا نہیں ہوا ورنہ وہ باپ کے ترکے میں حصہ بٹاتا۔ اس نے یہ بات مذاق میں کہی ہوگی مگر مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ شخص سمجھتا ہے کہ میں ایسا ناپاک خیال دل میں لا سکتا ہوں۔

والد کے یورپ جانے سے ہندوستان کے کشمیری برہمنوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ انھوں نے واپس آکر پراشچت یعنی پاک کئے جانے کی رسم ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ چند سال پہلے ایک اور کشمیری برہمن یعنی پنڈت بشن نرائن در جو آگے چل کر کانگرس کے صدر ہوئے، بیرسٹری پاس کرنے انگلستان گئے تھے۔ ان کی واپسی پر برادری کے کٹر لوگوں نے انھیں ذات سے باہر کر دیا حالانکہ انھوں نے تو پراشچت بھی کر لیا تھا اس بنا پر برادری قریب قریب برابر کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد بہت سے کشمیری نوجوان یورپ گئے اور وہاں سے آکر اصلاح پسند فرقے میں شامل ہوگئے مگر اسی وقت جب وہ پراشچت کر چکے تھے۔ اس رسم

کا خالی ایک ڈھکوسلا تھا جسے مذہب سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اس کے معنی محض یہ تھے کہ انسان جماعت کے آگے سر جھکائے اور اس کے دستور کی ظاہری پابندی کرے پھر وہ دھرم کے خلاف جو چاہتا کرتا اور غیر برہمن اور غیر ہندو لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھاتا پیتا۔

والد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کسی قسم کی رسم ادا کرنے سے یہاں تک کہ نام کے لئے پرائشچت کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ اس پر بڑی برہمی پھیلی خصوصاً اس وجہ سے کہ والد کا طرز عمل بہت سخت اور کسی قدر حقارت آمیز تھا۔ آخر میں بہت سے کشمیری والد کے ساتھ ہو گئے اور ایک تیسرا فرقہ بن گیا۔ چند سال کے اندر جوں جوں خیالات بدلتے گئے اور پرانی بندشیں ٹوٹتی گئیں۔ ان فرقوں میں رفتہ رفتہ میل ہوتا گیا۔ کشمیری لڑکے اور لڑکیاں بہت بڑی تعداد میں یورپ اور امریکہ میں تعلیم پا کر آئے اور پرائشچت کا کوئی سوال نہیں اٹھا۔ کھانے پینے کی قید بھی قریب قریب اٹھ گئی اور چند کٹر آدمیوں خصوصاً بوڑھی عورتوں کے سوا سب غیر کشمیریوں مسلمانوں اور بدیسیوں کے ساتھ مل کر کھانے لگے۔ پردہ کشمیری عورتوں میں دوسرے فرقوں سے بھی باقی نہیں رہا۔ اس کا رہا سہا کھوج ۱۹۳۰ء کی سیاسی تحریک نے مٹا دیا۔ دوسرے فرقوں سے شادی بیاہ ابھی عام نہیں ہے مگر اس کی مثالیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ میری دونوں بہنوں کی شادی غیر کشمیریوں میں ہوئی ہے اور ہمارے خاندان کے ایک نوجوان نے ایک ہنگری کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ برادری کے باہر شادی کرنے کی مخالفت مذہبی حکم نہیں بلکہ معاشرتی مسئلہ ہے۔ بہت سے کشمیری یہ چاہتے ہیں کہ اپنی جماعت کی "شخصیت" اور اپنے خاص آریائی خط و خال قائم رکھیں اور انھیں ڈر ہے کہ ہندوستانی اور غیر ہندوستانی انسانوں کے سمندر میں ملنے کے بعد ان چیزوں کا پتہ بھی نہ لگے گا۔ ہم لوگوں کی تعداد

اس عظیم الشان ملک کی کل آبادی کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔

غالباً زمانۂ حال میں کشمیری برہمنوں میں سب سے پہلے مرزا موہن لال کشمیری اب سے کوئی سو برس پہلے مغربی ملکوں میں گئے۔ یہ ایک ذہین اور خوش رو نوجوان تھے اور دلی کے مشن کالج میں پڑھتے تھے۔ جب برطانوی مہم کابل بھیجی گئی تو فارسی کے ترجمان کی حیثیت سے اس کے ساتھ جانے کے لئے منتخب کئے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے سارے وسط ایشیا اور ایران کا سفر کیا۔ جہاں کہیں جاتے ایک نئی شادی کرتے اور وہ بھی عموماً کسی اونچے گھرانے میں۔ انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور ایران میں ان کی شادی شاہی خاندان کی ایک لڑکی سے ہوگئی۔ اسی وجہ سے انھیں مرزا کا خطاب ملا۔ وہ یورپ گئے اور نوجوان ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے حالات اور سفر کے واقعات بڑے دلچسپ انداز میں لکھے ہیں۔

کوئی گیارہ برس کی عمر میں میں ایک نئے اتالیق فرڈنینڈ ٹ۔ بروکس کے سپرد کیا گیا۔ ان کے باپ آئرستان کے اور ماں فرانس یا بلجیم کی تھیں وہ بڑے پرجوش تھیو سوف تھے اور مسز اینی بیسنٹ نے والد سے ان کی سفارش کی تھی تین سال تک وہ میرے ساتھ رہے اور ان کا مجھ پر کئی طرح سے بہت گہرا اثر پڑا۔ اس زمانے میں میرے صرف ایک ہی اتالیق اور تھے یہ ایک نیک دل بوڑھے پنڈت تھے جو مجھے ہندی اور سنسکرت پڑھانے کے لئے رکھے گئے تھے۔ کئی سال کی کوشش میں پنڈت جی مجھے جو کچھ پڑھا سکے وہ اتنا تھوڑا تھا کہ لاطینی کی طرح جو میں نے آگے چل کر ہیرو میں سیکھی، سنسکرت میں بھی میں شُد بُد سے آگے نہیں بڑھا۔ قصور یقیناً میرا ہی تھا۔ میں زبانیں سیکھنے میں کچا تھا خصوصاً قواعد سے مجھے مطلق دلچسپی نہ تھی۔

ف۔ ٹ۔ بروکس نے میرے دل میں مطالعے کا ذوق پیدا کر دیا اور میں نے انگریزی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں مگر بغیر کسی سلسلے یا مقصد کے۔ بچوں اور لڑکوں کی کتابوں پر مجھے خاصا عبور تھا۔ میری محبوب کتابیں لیوئس کیرول کی تصانیف اور "جنگل کی داستان"[1] اور "نظمیں"۔ ڈان کوئشوٹ میں گستاو دورے نے جو تصویریں بنائی ہیں وہ مجھے بہت پسند تھیں۔ فرڈیوف نانسن کی کتاب "شمال کا آخری سرا"[2] پڑھ کر مَیں چلے پن کے کاموں کا ایک نیا عالم میری نظروں میں پھرنے لگا، اسکاٹ، ڈکنس اور تھیکرے کے ناول، مارک ٹوین کی کتاب ایچ۔ جی ویلس کے رومان اور شیرلاک ہومس والے قصے بھی میں نے پڑھے تھے۔ "زنڈا کے قیدی"[3] کے مطالعے سے مجھے بڑی عبرت ہوئی اور جیروم کے جیروم کی کتاب "تین آدمی ایک کشتی میں" میرے نزدیک ظرافت کی انتہا تھی دوسرے کی "ٹربلی" اور "ریپٹر ابٹن" کا نقش بھی اب تک میرے حافظے میں موجود ہے۔ شعر سے مجھے بہت شوق تھا اور گو میری زندگی نے بہت سے پلٹے کھائے مگر یہ شوق تھوڑا بہت اب تک موجود ہے۔

بروکس نے مجھے سائنس کے اسرار سے بھی آشنا کر دیا۔ ہم دونوں نے مل کر ایک چھوٹا سا معمل[4] بنا لیا۔ میں اس میں بڑی دلچسپی کے ساتھ گھنٹوں کیمیا اور طبعیات کے تجربے کرتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ، بروکس نے میری زندگی

---

(1) The Jungle book.
(2) Farthest North.
(3) The Prisoners of Zenda.
(4) Laboratory.

پھر ایک نیا اثر ڈالا جس سے میں ایک عرصہ تک بہت متاثر رہا۔ وہ اپنی قیام گاہ میں ہر ہفتے تھیوسوفیوں کی صحبت منعقد کرتے تھے جس میں میں بھی شریک ہوتا تھا رفتہ رفتہ ان کی اصطلاحیں اور خیالات میرے دل میں بس گئے۔ وہاں فلسفے کے مسئلے چھڑے رہتے تھے، اوتاروں، ہمزادوں، نور کے حلقوں[1] اور کرما[2] کے نظریے کی بحث ہوا کرتی تھی۔ میڈم بلاواٹسکی اور دوسرے تھیوسوفیوں کی موٹی موٹی کتابوں کے علاوہ ہندو شاستروں، بدھ مت کے "دھام پد" فیثاغورث، اپولونیس اور مختلف فلسفیوں اور باطنیوں کی تصانیف کے حوالے دیئے جاتے تھے۔ بہت سی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں، مگر سننے میں یہ ساری راگ مالا بہت پُراسرار اور دلکش معلوم ہوتی تھی اور میں دل میں کہتا تھا کہ دنیا بھر کے بھیدوں کی کنجی یہی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جان بوجھ کر مذہب اور دوسری دنیا کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ خصوصاً ہندو دھرم کی وقعت میری نظر میں بہت بڑھ گئی، اس کی رسموں کی نہیں بلکہ اس کی جید کتابوں اپنشد اور بھگوت گیتا کی۔ ظاہر ہے کہ میں ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا مگر ان کی عبارت بڑی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ میں خواب میں ہمزادوں کو دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی اپنے آپ کو آسمان پر اڑتا ہوا پاتا تھا۔ یہ خواب کہ میرا جسم آپ ہی آپ اڑتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں اکثر نظر آیا ہے۔ بعض اوقات تو یہ بہت ہی صاف اور واضح ہوتا تھا اور مجھے زمین اپنے قدموں کے نیچے دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں آج کل کے تعبیر بتانے والے فرائیڈ وغیرہ ان خوابوں کی کیا تعبیر کریں گے۔

---

(۱) Auras نور کے حلقے جو تھیوسوفیوں اور دوسرے باطنیوں کے نزدیک انسانوں کو گھیرے رہتے ہیں، ہر انسان کا حلقہ الگ ہوتا ہے۔

(۲) جزا اور سزا کا ابدی دور۔

اسی زمانے میں مسز اینی بیسنٹ الہ آباد آئیں اور انھوں نے تھیوسوفی کے موضوع پر کئی لکچر دئے۔ میں ان کی خطابت سے بہت متاثر ہوا اور جب ان کی تقریروں سے لوٹتا تو مجھ پر ایک بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا، گویا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تھیوسوفی کی انجمن میں شریک ہونے کا ارادہ کر لیا اگرچہ میری عمر اس زمانے میں صرف تیرہ برس کی تھی۔ جب میں نے والد سے پوچھا تو انھوں نے ہنس کر اجازت دے دی۔ ان کے نزدیک اس مسئلے کی کوئی اہمیت نہ تھی، نہ وہ اس کی مخالفت کی ضرورت سمجھتے تھے اور نہ موافقت کی۔ مجھے اس سرد مہری سے کسی قدر تکلیف ہوئی اگرچہ اور باتوں کے لحاظ سے میری نظر میں ان کی بڑی عظمت تھی مگر میں یہ سمجھتا تھا کہ ان میں روحانیت کی کمی ہے۔ اصل میں وہ خود تھیوسوف رہ چکے تھے اور ابتدائی زمانے میں جب میڈم بلاواٹسکی ہندوستان آئی تھیں اس جماعت میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے مذہبی جذبے کی بنا پر نہیں بلکہ ایک نئی چیز کے شوق میں شرکت کر لی تھی اور تھوڑے ہی دن بعد الگ ہو گئے۔ مگر ان کے بعض دوست جو انھیں کے ساتھ ممبر ہوئے تھے، جمے رہے اور جماعت کے اعلیٰ روحانی مدارج پر پہنچ گئے۔

غرض میں تیرہ برس کی عمر میں تھیوسوفی انجمن کا رکن ہو گیا اور خود مسز بیسنٹ نے میرے داخلے کی رسم ادا کی۔ انھوں نے مجھے اچھی اچھی نصیحتیں کیں اور بعض پُراسرار نشانیاں تعلیم کیں جو غالباً فراماشنوں سے لی گئی تھیں۔ میرے جسم میں اس وقت ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کے بعد بنارس میں تھیوسوفوں کی کانفرنس میں شریک ہوا جہاں مجھے کرنل الکاٹ اور ان کی شان دار داڑھی کی زیارت نصیب ہوئی۔

اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اب سے تیس برس پہلے لڑکپن کے زمانے

ہیں میری صورت کیسی تھی اور خیالات کیا تھے۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے اس تھیوسوفی دور میں میرے چہرے پر وہ افسردگی اور بے رونقی چھا گئی تھی جو پرہیزگاری کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اور تھیوسوف مردوں اور عورتوں میں اکثر نظر آتی ہے یا کم سے کم اس زمانے میں نظر آتی تھی۔ ایک برگزیدہ ہستی ہونے کے احساس نے میری صورت اور سیرت میں کچھ عجیب روڑھاپن پیدا کر دیا تھا غرض میری عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو میری صحبت ایک مصیبت معلوم ہوتی ہوگی۔

کچھ عرصے کے بعد ف۔ ٹ۔ بروکس رخصت ہو گئے۔ اور مجھے تھیوسوفی سے زیادہ سابقہ نہیں رہا اس کے تھوڑے ہی دن بعد میری زندگی کا تھیوسوفی کا دور بالکل ختم ہو گیا جس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہوا کہ میں اسکول کی تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا مگر جو زمانہ ف۔ ٹ۔ بروکس کے ساتھ گذرا تھا اس کا گہرا نقش میرے دل پر باقی ہے اور میں ان کے اور تھیوسوفی کے احسان سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر سچ پوچھئے تو اس عرصے میں تھیوسوفی کی وقعت میری نظر میں بہت کم ہو گئی ہے۔ اب وہ مجھے برگزیدہ ہستیاں نہیں بلکہ بہت معمولی قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جو سلامتی کو خطرے پر اور آسائش کو شہادت پر ترجیح دیتے ہیں البتہ مسز بیسینٹ کا میں ہمیشہ دل سے قائل رہا۔

اس کے بعد جس اہم واقعے سے میں متاثر ہوا وہ روس اور جاپان کی لڑائی تھی۔ جاپان کی فتوحات سے مجھے بڑا جوش آتا اور میں نئی خبریں معلوم کرنے کے لئے بے چینی سے اخباروں کا انتظار کیا کرتا تھا میں نے جاپان کے متعلق بہت سی کتابیں خریدیں اور ان میں سے بعض کو پڑھنے کی کوشش بھی کی۔ جاپان کی تاریخ میں تو میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر قدیم جاپان کے سورماؤں کے قصوں اور لیف کیڈیو ہارن کی شگفتہ عبارت میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔

میرا دل قومیت کے جذبے سے معمور تھا اور سوچا کرتا تھا کہ کاش ہندوستان اور سارے ایشیا کو یورپ کی غلامی سے نجات مل جائے۔ میں بہادری کے کاموں کے منصوبے باندھا کرتا تھا کہ یوں تلوار ہاتھ میں لے کر ہندوستان کی خاطر لڑوں گا اور اسے آزاد کراؤں گا۔

اب میری عمر چودہ برس کی ہو گئی تھی۔ ہمارے گھر میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ میرے رشتے کے بھائی جو مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے، اپنے اپنے کاروبار میں لگ گئے تھے اور اب وہ مشترکہ مکان کو چھوڑ کر اپنے گھر بار الگ کر رہے تھے۔ میرے دل میں نئے خیالات اور دھندلے تصورات منڈلا رہے تھے اور مجھے عورتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔ میں اب تک لڑکوں کی صحبت میں رہنے کو ترجیح دیتا تھا اور لڑکیوں سے ملنا جلنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ مگر کبھی کبھی کشمیریوں کی دعوتوں اور تقریبوں میں جہاں حسین لڑکیاں کثرت سے ہوتی تھیں، یا اور مقامات پر نظر سے نظر مل جانے، یا بدن سے بدن چھو جانے سے میرے جسم میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔

مئی ۱۹۰۵ء میں جب میری عمر پندرہ برس کی تھی میرے والد مجھے میری والدہ اور میری چھوٹی بہن کو لے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔

(۴)

ہیرو اور کیمبرج

آخر مئی کی کسی تاریخ کو ہم لندن پہنچے۔ ڈوور سے ریل روانہ ہونے کے بعد رستے میں ہم نے یہ خبر پڑھی کہ جاپان کو ٹوشیما کے مقام پر بڑی زبردست بحری فتح حاصل ہوئی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ دوسرے ہی دن ڈربی کی گھوڑدوڑ تھی اور ہم سب اس کا تماشا دیکھنے گئے وہاں سے لوٹ کر ہماری ملاقات ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوئی جو اس زمانے میں ایک ذہین اور مستعد نوجوان تھے اور اپنی تعلیم میں نہایت اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ان دنوں وہ لندن کے ایک ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔

میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ہیرو میں جگہ مل گئی کیونکہ میری عمر پندرہ برس کی ہو چکی تھی اور ہیرو داخلے کی مقررہ عمر سے کچھ تھوڑی سی زیادہ تھی۔ میرے خاندان کے لوگ یورپ کے اور ملکوں کو چلے گئے اور وہاں سے ہندوستان واپس ہو گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے آپ کو غیروں میں بالکل اکیلا پایا۔ مجھے تنہائی اور گھر کی یاد ستانے لگی۔ مگر یہ حالت زیادہ دن نہیں رہی۔ میرا قدم اسکول میں تھوڑا بہت جم گیا، اور پڑھنے میں اور کھیل میں وقت گزرنے لگا۔ مگر میں وہاں پوری طرح کبھی نہیں کھپ سکا۔ ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں اور شاید وہ لوگ بھی مجھے غیر سمجھتے ہوں گے۔ پھر بھی میں کھیلوں میں پورا حصہ لیتا تھا اگرچہ ان میں کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں کر سکا۔ میرے خیال میں یہ بات مان لی گئی

تھی کہ میں کسی کام سے جی چُرانے والا نہیں۔

شروع میں میرا داخلہ چھوٹے درجے میں ہوا اس لئے کہ میں لاطینی بہت کم جانتا تھا مگر تھوڑے ہی دن میں مجھے ترقی مل گئی۔ بہت سے مضمونوں میں خصوصاً عام معلومات میں مَیں اپنی عمر کے لڑکوں سے آگے تھا۔ میرا ذوق زیادہ وسیع تھا اور میں اپنے اکثر ساتھیوں سے زیادہ کتابیں اور اخبار پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے والد کو ایک خط میں لکھا تھا کہ انگریز لڑکے اکثر ٹھس ہوتے ہیں اور سوائے اپنے کھیلوں کے اور کسی چیز کے متعلق گفتگو نہیں کر سکتے۔ تاہم مجھے بعض تیز لڑکے بھی نظر آئے خصوصاً اونچی جماعتوں میں پہنچنے کے بعد۔

مجھے پارلیمنٹ کے عام انتخاب سے جو غالباً سنہ ۱۹۰۵ء کے آخر میں ہوا بہت دلچسپی تھی اس میں لبرل جماعت نے بڑی زبردست فتح پائی۔ سنہ ۱۹۰۶ء کے شروع میں ہمارے استاد نے ہم سے نئی حکومت کے بارے میں سوال کیا اور انھیں بڑا تعجب ہوا کہ ساری جماعت میں صرف میں ہی نے ان کے سوال کا اچھی طرح جواب دیا۔ بلکہ کیمبل بیزمین کی مجلس وزرا کی قریب قریب پوری فہرست زبانی سنا دی۔ سیاست کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی مجھے خاص شوق تھا اور وہ ہوائی جہاز رانی کی ابتدائی نشو و نما تھی۔ یہ رائٹ برادران اور سینٹوس ڈومونٹ کا زمانہ تھا (جس کے بعد ہی فارمین، لیتھم اور بلیریو کا دور آیا) اور میں نے اپنے جوش میں ہیرو سے والد کو لکھا تھا کہ بہت جلد میں سنیچر اتوار کی چھٹی میں ہوائی جہاز سے ہندوستان آیا کروں گا۔

میرے زمانے میں ہیرو میں چار پانچ ہندوستانی لڑکے تھے۔ ان میں سے جو اور ہوسٹلوں میں رہتے تھے ان سے مجھ سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ خود میرے ہوسٹل میں جس کے نگراں ہیڈ ماسٹر تھے، مہاراج بڑودہ کے صاحبزادے تھے اور بعد میں مہاراج کپورتھلہ کے بڑے صاحبزادے پرم جیت سنگھ بھی آ گئے جواب ٹکا

صاحب ہوگئے ہیں۔ وہ اس مدرسے میں بالکل نہیں کھپتے تھے ہمیشہ اداس رہا کرتے اور دوسرے لڑکوں سے ملنے جلنے سے گھبراتے۔ جب یہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تو وہ بہت خفا ہوتے اور کہتے کہ کبھی کپورتھلے آئے تو سمجھ لوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے معاملہ اور بگڑ جاتا تھا۔ وہ یہاں آنے سے پہلے کچھ دن فرانس میں رہ چکے تھے اور فرانسیسی زبان روانی سے بولتے تھے مگر یہ لطف، دیکھئے کہ اس سے انھیں اپنے فرانسیسی کے سبق میں کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔ یہ اس طریقہ تعلیم کی برکت تھی جو انگلستان کے پبلک اسکولوں میں غیر زبانوں کی تعلیم دینے کے لئے اختیار کیا جاتا تھا۔

ایک بار عجیب واقعہ ہوا۔ آدھی رات کو یکایک ہوسٹل کے نگراں ہمارے کمروں میں پہنچے اور سب کی تلاشی لی گئی۔ معلوم ہوا کہ پرم جیت سنگھ کی سونے کی شام کی خوشنما چھڑی غائب ہو گئی ہے۔ تلاشی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دو تین دن میں لارڈس کے میدان میں ایٹن اور ہیرو کا میچ ہوا اور اس کے بعد ہی وہ چھڑی مالک کے کمرے میں پائی گئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب اسے لے کر میچ دیکھنے گئے تھے اور پھر واپس کر گئے۔

ہمارے ہوسٹل میں اور دوسرے ہوسٹلوں میں چند یہودی بھی تھے ان لوگوں سے اچھی خاصی دشمنی تھی مگر لوگوں میں سامی نسل سے کسی قدر نفرت ضرور موجود تھی۔ یہ "ملعون یہودی" کہلاتے تھے اور قریب قریب غیر شعوری طور پر میں بھی یہ سمجھنے لگا کہ ان سے نفرت کرنا فیشن میں داخل ہے۔ مگر اصل میں مجھے سامی نسل سے کوئی کد نہ تھی اور آگے چل کر کئی یہودیوں سے میری بڑی دوستی ہو گئی۔

میں ہیرو سے مانوس ہو گیا تھا اور اسے بہت پسند کرتا تھا مگر اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ میں اس کی سطح سے اونچا ہوتا جاتا ہوں میرا دل یونیورسٹی کی طرف کھنچ رہا تھا۔ سنہ ۱۹۰۶ء اور سنہ ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کی خبریں انگلستان کے اخباروں

میں بہت مجمل طور پر آتی تھیں مگر ان سے بھی یہ پتہ چلتا تھا کہ بنگال، پنجاب اور مہاراشٹر میں بڑے بڑے واقعات ہو رہے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ جی جلاوطن کر دئے گئے تھے، بنگال میں شورش برپا تھی۔ پونا سے تلک کی جدوجہد کے متعلق تار آرہے تھے سودیشی اور بائیکاٹ کا زور تھا۔ ان سب باتوں نے میرے دل میں سخت ہیجان پیدا کر دیا تھا مگر ہیرو میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس سے میں اس کا ذکر کر سکوں۔ البتہ چھٹیوں میں اپنے رشتے کے بھائیوں سے یا اور ہندوستانی دوستوں سے ملنا ہوتا تھا اور میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا تھا۔

اسکول میں اچھا کام کرنے کے انعام میں مجھے ایک بار ج م ٹریویلین گاری بالڈی کی کتابیں ملیں۔ انھیں میں نے بہت شوق سے پڑھا اور بہت جلد اس سلسلے کی باقی دو کتابیں بھی مہیا کر کے گاری بالڈی کے سارے حالات کا غور سے مطالعہ کیا میری نظروں میں یہ نقشے پھرنے لگے کہ ہندوستان میں ایسے ہی کارنمایاں انجام پا رہے ہیں اور آزادی کی خاطر بڑی بہادری سے جنگ ہو رہی ہے۔ ان خیالات کی وسعت کے آگے ہیرو ایک تنگ اور محدود جگہ معلوم ہونے لگی اور میرا دل یونیورسٹی کی وسیع تر فضا کو ڈھونڈھنے لگا۔ چنانچہ میں اپنے والد کی اجازت حاصل کر کے ہیرو سے رخصت ہو گیا۔ یہاں میرا قیام صرف دو برس رہا جو مقررہ میعاد سے بہت کم تھا۔ میں ہیرو سے اپنی خوشی سے جا رہا تھا مگر مجھے یاد ہے کہ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو میرا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجھے اس سے ایک گونہ انس ہو گیا تھا اور اس کے چھوڑنے سے میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا۔ مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے واقعی رنج تھا یا نہیں، شاید مجھے یہ احساس تھا کہ اس موقع پر اداس ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہیرو کی روایات اور گیتوں کا یہی تقاضا ہے میں ان روایات سے متاثر تھا اس لئے میں نے جان بوجھ کر ان روایات کے اثر سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی تاکہ جس جگہ رہتا ہوں اس سے ہم آہنگ ہو جاؤں۔

شروع اکتوبر ۱۹[illegible]ء، سترہ اٹھارہ برس کی عمر، ٹرینٹی کالج، کیمبرج کا منظر۔ میرا دل فخر و مسرت سے معمور تھا۔ اب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، اور اسکول کے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ لڑکپن کی بیڑیاں کٹ چکی تھیں اور وہ دن آگیا تھا کہ میں اپنے آپ کو بالغ کہہ سکوں۔ میں کیمبرج کے چوڑے چوکوں اور تنگ گلیوں میں اکڑتا پھرتا تھا اور اگر کوئی جاننے والا مل جاتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

تین سال میں کیمبرج میں رہا اور یہ تین سال بے خلل سکون اور خاموشی سے گذر گئے جیسے کیم ندی دھیرے دھیرے بہتی ہے۔ یہ بھی کیا خوش گوار زمانہ تھا: بہت سے دوست، تھوڑا سا کام، تھوڑا سا کھیل اور دائرہ نظر کا آہستہ آہستہ بڑھنا۔ میں نے سائنس کی سند حاصل کی جس میں میرے مضمون کیمیا، ارضیات اور نباتیات تھے مگر میری دلچسپی انھیں مضامین تک محدود نہ تھی۔ میں جن لوگوں سے کیمبرج میں یا تعطیل کے زمانے میں لندن میں ملتا تھا وہ عالمانہ انداز سے ادب، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو ان علمیت جتانے والوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر جب میں نے تھوڑی سی کتابیں پڑھ ڈالیں تو مجھے اس کا ڈھب آگیا اور کم سے کم اتنا ہو گیا کہ میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھ سکتا تھا اور معمولی موضوعوں سے اپنی ناواقفیت کا اظہار نہیں ہونے دیتا تھا چنانچہ ہم نٹشے کے فلسفے (جس کا ان دنوں کیمبرج میں زور تھا) برنارڈ شا کے دیباچوں اور لوالیس ڈکنسن کی نئی کتابوں پر بحث کیا کرتے تھے۔ ہم اپنے آپ کو بہت پختہ کار سمجھتے تھے۔ عورت مرد کے تعلقات اور اخلاقی مسئلوں کا ذکر اس طرح کرتے تھے گویا ہم عام معیار سے بہت اونچے ہیں اور ایوان بلاک، ہیولاک ایلیس، کرافٹ ایبنگ، اٹو وائننگر کے حوالے اس بے پروائی سے دیتے تھے جیسے ان کی سب کتابیں چاٹے بیٹھے ہیں۔ اپنے نزدیک ہم اس موضوع سے اتنی واقفیت رکھتے

تھے جتنی ایک غیر ماہر فن کو ہونی چاہیئے۔

مگر سچ پوچھئے تو اس قدر بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے کے باوجود ہم میں سے اکثر جنسی معاملات میں کچے اور جھینپو تھے۔ کم سے کم میرا یہی حال تھا اور بہت عرصے تک یعنی کیمبرج چھوڑنے کے بعد تک جنسی مسائل کے متعلق میری واقفیت محض نظری پہلو تک محدود رہی اس کی وجہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ ہم میں سے اکثر میں جنسی رغبت بہت قوی تھی اور گناہ کا خیال شاید ہی کسی کو ہو۔ مجھے تو بالکل نہیں تھا۔ مذہب کی روک کو اس میں مطلق دخل نہ تھا۔ ہم لوگ ان چیزوں کو غیر اخلاقی کہا کرتے تھے یعنی نہ اچھی نہ بری مگر باوجود ان سب باتوں کے کچھ تو میرے شرمیلے پن نے اور کچھ اس کراہت نے جو عشق بازی کے مروجہ طریقوں کو دیکھ کر ہوتی تھی، مجھے روکے رکھا میں ان دنوں بہت شرمیلا تھا شاید اس سبب سے کہ میرا بچپن تنہائی میں گذرا تھا۔

میرا عام تصور زندگی اس زمانہ میں ایک طرح کی دھندلی سی لذت پرستی تھی۔ اس میں کچھ تو جوانی کی ترنگ شامل تھی اور کچھ آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کا اثر لطف و مسرت کی خواہش کا موٹا سا فلسفیانہ نام رکھ دینا سہل ہے مگر اصل میں میرا مقصد لذت پرستی سے اونچا تھا اس لیے کہ عیش اور آرام کی زندگی سے مجھے کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ میری طبیعت میں مذہبی رنگ نہیں تھا اور میں مذہب کی سختیوں کو ناپسند کرتا تھا اس لیئے ظاہر ہے کہ مجھے کوئی اور معیار زندگی تلاش کرنا تھا۔ مگر میری نظر بالکل سطحی تھی اور میں کسی چیز کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا اس لیئے زندگی کے جمالی پہلو نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور یہ بات دل کو لگتی ہوئی معلوم ہوئی کہ انسان عامیانہ طریقے سے دنیا کی لذتوں پر نہ گرے بلکہ اپنا وقار قائم رکھے مگر اسی کے ساتھ ہر طرح کی نعمتوں کے مزے لیتا رہے اور بھری پری وسیع اور ہمہ گیر زندگی بسر کرے۔ میں زندگی کا لطف اٹھاتا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں

گناہ کی کیا بات ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ خطرے کی زندگی اور منچلے پن کے کام بھی
میرے لئے ایک خاص کشش رکھتے تھے۔ مجھے اپنے والد کی طرح ہمیشہ جوا کھیلنے کا شوق رہا۔
پہلے روپے کا داؤ لگاتا تھا پھر زندگی کے بڑے بڑے مقاصد کی بازی لگانے لگا۔
۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کی سیاست سخت ہیجان کی حالت میں تھی اور میں
اس میں بہادری سے حصہ لینے کی آرزو رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ راہ کوئی آرام کی راہ
نہیں تھی۔ ان ملی جلی خواہشوں کی وجہ سے جو کبھی کبھی آپس میں لڑ بھی جاتی تھیں
میرے خیالات کچھ عجیب طرح سے گڈمڈ ہو گئے تھے مگر باوجودیکہ میرے خیالات دھندلے
اور الجھے ہوئے تھے۔ مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں تھی اس لئے کہ فیصلے کا زمانہ ابھی
دور تھا۔ اس وقت تو میں جسمانی حیثیت سے بھی اور ذہنی حیثیت سے بھی بڑی خوش گوار
زندگی بسر کر رہا تھا۔ زندگی کے نئے نئے منظر میری نظر سے گذر رہے تھے۔ بہت کچھ کرنا
تھا بہت کچھ دیکھنا تھا بہت سے کونوں کی سیر کرنی تھی۔ ہم جاڑوں کی لمبی راتوں
میں آگ کے گرد بیٹھے اطمینان سے بات چیت اور بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے
یہاں تک کہ آگ بجھنے لگتی تھی اور ہم کانپتے ہوئے بستروں میں جا گھستے تھے۔ کبھی
کبھی بحث کے دوران میں ہماری آوازیں بلند ہو جاتی تھیں اور ہم جوش میں
آکر جھگڑنے لگتے تھے مگر یہ سب بیہودہ سی باتیں تھیں ہم انسانی زندگی کے
مسئلوں سے مصنوعی سنجیدگی سے کھیلتے تھے اس لئے کہ یہ ابھی ہمارے لئے حقیقی
مسئلے نہیں تھے اور ہم دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتے تھے۔ یہ بیسویں صدی کے
شروع کی، یعنی جنگ عظیم سے پہلے کی دنیا تھی۔ اس دنیا کا خاتمہ قریب تھا اور ایک
دوسری دنیا پیدا ہونے کو تھی۔ ہلاکت، اور تباہی اور مصیبت سے معمور، نوجوانوں
کے دل کو درد والم سے بھر دینے والی۔ مگر یہ انقلاب ابھی تک مستقبل کے پردے
میں چھپا ہوا تھا اور ہمیں اپنے آس پاس ترقی و انتظام دکھائی دیتا تھا جو بے فکروں

کو خوش رکھنے کے لئے کافی تھا۔

میں نے لذت پرستی کا اور مختلف تصورات کا ذکر کیا ہے جن سے میں اس زمانے میں متاثر تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں ان چیزوں پر وضاحت سے غور کیا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ان کا کوئی واضح اور معین تصور انسان کے ذہن میں ہو۔ یہ محض دھندلے سے خیالات تھے جو میرے دل میں آتے جاتے تھے اور اپنا تھوڑا بہت نقش چھوڑ جایا کرتے تھے۔ میں کبھی ان فکروں میں سر نہیں کھپاتا تھا۔ میرا سارا وقت پڑھائی کھیل اور تفریح میں گذرتا تھا اور میرے سکون میں خلل ڈالنے والی صرف ایک ہی چیز تھی یعنی ہندوستان کی سیاسی کشمکش۔ کیمبرج میں جن کتابوں کا اثر میرے سیاسی خیالات پر پڑا، ان میں ٹاؤنسینڈ کی کتاب "ایشیا اور یورپ" بھی تھی۔

۱۹۰۷ء سے کئی سال تک ہندوستان میں ایک ہیجان کی سی کیفیت رہی۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد پہلا موقع تھا کہ یہ ملک بدیسی حکومت کے آگے چپ چاپ سر جھکانے کے بجائے اس سے لڑنے پر آمادہ تھا۔ تلک کی جدوجہد اور ان کا قید ہونا، آروند گھوش کی کوشش اور بنگال کے لوگوں کا سودیشی اور بائیکاٹ کا حلف اٹھانا، ان واقعات کی خبریں انگلستان پہنچتی تھیں اور ہم ہندوستانیوں کے دلوں کو جوش سے بھر دیتی تھیں ہم سب کے سب تلک کے پیرو تھے جو ہندوستان میں انتہا پسند کہلاتے تھے۔

کیمبرج کے ہندوستانیوں کی ایک انجمن تھی جو "مجلس" کے نام سے مشہور تھی اس میں ہم اکثر سیاسی مسئلوں پر بحث کرتے تھے مگر محض نمائش کے طور پر ساری کوشش پارلیمنٹ اور یونیورسٹی یونین کے طور طریقوں کی نقل میں صرف ہوتی تھی اور بحث کے مضمون کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ میں مجلس میں اکثر جایا کرتا تھا مگر تین برس کے زمانے میں شاید ہی کوئی تقریر کی ہو۔ میں

اپنی جھجک اور جھینپ کو کسی طرح دور نہیں کر سکتا تھا۔ یہی مشکل مجھے اپنے کالج کی ڈبیٹنگ سوسائٹی The Maghpie and Stump میں پیش آتی تھی۔ وہاں یہ قاعدہ تھا کہ جو ممبر پوری ٹرم تقریر نہ کرے اسے جرمانہ دینا پڑتا تھا چنانچہ میں نے اکثر جرمانہ دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایڈون مانٹیگو جو آگے چل کر وزیر ہند ہوئے اکثر کالج کی انجمن میں آیا کرتے تھے۔ وہ ٹرینٹی کالج کے قدیم طالب علم تھے اور کیمبرج کی طرف سے پارلیمنٹ میں ممبر تھے۔ انھیں کی زبان سے میں نے پہلی بار عقیدے کی جدید تعریف سُنی۔ یعنی اس چیز کا ماننا جسے عقل نہ مانتی ہو اس لئے اگر عقل نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر عقیدے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ مجھ پر سائنس کے مطالعے کا بہت اثر تھا اور اسی اثر کی وجہ سے میں اپنی رائے کو قطعی سمجھتا تھا، اس لئے کہ انیسویں صدی کے شروع کی سائنس، بخلاف آج کل کی سائنس کے اپنے آپ پر اور اپنی دنیا پر بڑا وثوق رکھتی تھی۔

"مجلس" میں بھی اور نجی گفتگو میں بھی ہندوستانی طالب علم اپنے ملک کی سیاست کا ذکر کرتے وقت اکثر سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے تھے یہاں تک کہ بنگال والے جو تشدد کے کام شروع کر رہے تھے ان کی تعریف سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ آگے چل کر میں نے دیکھا کہ یہی حضرات ہندوستان کی سول سروس کے ارکان، ہائی کورٹ کے جج، بہت متین اور ثقہ وکیل وغیرہ بن گئے۔ ان قائلین کے شیروں میں بہت کم ایسے نکلے، جنھوں نے آگے چل کر ہندوستانی سیاست میں کچھ مؤثر حصہ لیا ہو۔

اس زمانے کے بعض مشہور ہندوستانی سیاسی ہمارے یہاں کیمبرج میں آئے۔ ہم لوگ ان سے ادب سے پیش آئے مگر اس میں ایک جھلک برتری

ایک احساس کی بھی تھی ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ذہنی تربیت کا دائرہ بڑا ہے اور ہم ہر چیز کو زیادہ وسیع نظر سے دیکھتے ہیں، جو حضرات ہمارے یہاں تشریف لائے اُن میں بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور گوکھلے بھی تھے۔ بپن پال سے ملنے کے لئے ہم میں سے کسی سرِ نشست کے کمرے میں سب ہندوستانی طالب علم جمع ہوئے۔ ہماری تعداد ایک سو تین سے زیادہ نہ تھی مگر بپن پال اس طرح گرج رہے تھے جیسے دس ہزار کے مجمع میں تقریر کر رہے ہوں۔ آواز کا گھن اس قیامت کا تھا کہ میں ان کے الفاظ مشکل سے سمجھ سکتا تھا۔ لالہ جی کا اندازِ گفتگو زیادہ معقول تھا اور مجھ پر اس کا اثر ہوا۔ میں نے والد کو لکھا کہ مجھے لالہ جی کی تقریر بپن پال کی تقریر سے زیادہ پسند آئی۔ وہ اس سے خوش ہوئے اس لئے کہ ان دنوں بنگال کے شورش پسند انھیں ذرا بھی نہ بھاتے تھے۔ گوکھلے نے کیمبرج میں عام جلسے میں تقریر کی اور مجھے اس جلسے کی جو بات خاص طور پر یاد ہے وہ عبدالمجید خواجہ کا ایک سوال تھا جو انھوں نے گوکھلے کی تقریر کے بعد پوچھا۔ خواجہ نے ہال کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک طول طویل سوال چھیڑ دیا جس کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ ہم میں سے اکثر یہ بھول گئے کہ بات کیا تھی اور شروع کیونکر ہوئی تھی۔

ہندوستانیوں میں ہر دیال کی بڑی شہرت تھی مگر وہ آکسفورڈ میں تھے اور وہ بھی میرے کیمبرج کے زمانے سے پہلے۔ جن دنوں میں ہیرو میں تھا ان سے ایک دو مرتبہ لندن میں ملاقات ہوئی۔

میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگریس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ جے ایم سین گپتا میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سیف الدین کچلو سید محمود اور تصدق احمد خاں شروانی، کم و بیش میرے ہم عصر تھے۔ شاہ محمد سلیمان بھی

جواب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں میرے زمانے میں وہاں پڑھتے تھے میرے اور بہت سے دوسرے سول سروس کے رکن یا فربہ بن کر پھلے پھولے۔

لندن میں ہم شیام جی کرشن ورما اور ان کے انڈیا ہاؤس کا ذکر سنا کرتے تھے مگر مجھ سے ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی ان کا رسالہ Indian Sociologist ہماری نظر سے گزرتا تھا۔ ایک عرصے کے بعد یعنی ۱۹۲۶ء میں مجھے شیام جی سے جنیوا میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی جیب میں اب تک Indian Sociologist کی پرانی کاپیاں بھری ہوئی تھیں اور وہ ہر شخص کو جو ان کے قریب آتا تھا، برطانوی حکومت کا جاسوس جانتے تھے۔ لندن میں ایک طالب علموں کا مرکز بھی تھا جو انڈیا آفس نے قائم کیا تھا۔ اس کو ہم سب لوگ ہندوستانی طالب علموں کی مخبری کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور یہ خیال بڑی حد تک بجا تھا مگر بہت سے ہندوستانیوں کو چار و ناچار اس سے واسطہ رکھنا پڑتا تھا، اس لئے کہ اس کی سفارش کے بغیر یونیورسٹیوں میں داخلہ قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی حالت نے میرے والد کو بھی عملی سیاست میں کھینچ لیا میں اس سے خوش تھا اگرچہ مجھے ان کے سیاسی اصولوں سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ قدرتی طور پر اعتدال پسندوں کے ساتھ شریک ہو گئے جن میں سے اکثر ان کے دوست اور وکالت میں ان کے رفیق کار تھے، انھوں نے اپنے صوبے کی ایک کانفرنس میں صدارت کی اور اپنی تقریر میں بنگال اور مہاراشٹر کے انتہا پسندوں کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ وہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہو گئے سنہ ۱۹۰۷ء میں وہ سورت کے اجلاس میں موجود تھے جس میں کانگریس درہم برہم ہو گئی اور اس کے بعد خالص اعتدال پسند جماعت بن گئی۔

سورت کے جلسے کے بعد ہی ۱۹۰۵ء میں نیوٹن الٰہ آباد میں کچھ دن والد کے مہمان رہے اور انھوں نے جو کتاب ہندوستان کے متعلق لکھی اس میں والد کا ذکر ان الفاظ میں کیا "سخاوت کے سوا وہ ہر معاملے میں اعتدال پسند ہیں" یہ اندازہ بالکل غلط تھا۔ والد کسی چیز میں اعتدال پسند نہ تھے بجز سیاست کے اور اس میں بھی ان کی طبیعت اپنا رنگ دکھا کر رہی یعنی رفتہ رفتہ یہ رہا سہا اعتدال بھی غائب ہو گیا۔ ان جیسا قوی جذبات، جوشیلے مزاج، مغرور طبیعت اور مضبوط ارادے کا آدمی اعتدال پسندی سے کوسوں دور تھا۔ پھر بھی ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں اور اس کے کئی سال بعد تک وہ دُھر کے اعتدال پسند اور انتہا پسندوں کے سخت مخالف رہے اگرچہ میرے خیال میں تلک کے وہ قائل تھے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کے ذہن کی تربیت قانون اور دستور کی بنیادوں پر ہوئی تھی اس لئے وہ قدرتی طور پر ہر چیز کو قانونی اور آئینی نظر سے دیکھتے تھے اپنی معاملہ فہمی کی بدولت انھوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ سخت اور شدید الفاظ بالکل بیکار ہیں جب تک کہ عمل بھی زبان کا ہم رنگ نہ ہو اور موثر عمل کی انھیں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سودیشی اور بائیکاٹ سے کچھ کام چلتا معلوم نہیں ہوتا تھا اور پھر ان تحریکوں کی تہ میں مذہبی رنگ کی قومیت تھی جو ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی۔ وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کے حامی نہیں تھے۔ نہ وہ اسے سمجھ سکتے تھے اور نہ وہ اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ذات پات کی پابندی اور بہت سی اور قدیم رسمیں رجعت پسندی کی دلیل تھیں اور وہ انھیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کی نظر میں مغرب سمایا ہوا تھا۔ مغربی ممالک کی ترقی نے ان کے دل کو موہ لیا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ انگلستان کے تعلق کی بدولت ہم بھی ترقی کر سکیں گے۔

سماجی حیثیت سے دیکھئے تو ۱۹۰۷ء میں ہندوستانی قومیت کا نئے سرے

سے ابھرنا کھلی ہوئی رجعت پسندانہ تحریک تھی۔ جیسا کہ مشرق کے اور ملکوں میں ہوا تھا ہندوستان میں بھی قومیت کی نئی تحریک لازمی طور پر مذہبی چیز بن گئی۔ اعتدال پسندوں کی جماعت سماجی معاملات میں زیادہ آزاد خیال تھی مگر اس میں صرف اونچے طبقے کے مٹھی بھر آدمی تھے جنھیں عام لوگوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ یہ حضرات معاشی مسئلوں پر جو کچھ غور کرتے تھے وہ صرف اونچے اوسط طبقے کے لحاظ سے جس کے ایک حصے کے وہ نمائندے تھے اور جس کی ترقی انھیں مقصود تھی، وہ چھوٹی چھوٹی سماجی اصلاحوں کی کوشش کر رہے تھے تاکہ ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ہوں اور پرانی رسمیں، جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں، موقوف ہو جائیں۔

اعتدال پسندوں کے ساتھ شریک ہو کر والد نے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا بنگال اور پونا کے چند لیڈروں کو چھوڑ کر اکثر انتہا پسند نوجوان تھے اور والد کو نہایت ناگوار تھا کہ یہ کل کے چھوکرے الگ راہ پر چلنے کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ مخالفت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور جن لوگوں کو احمق سمجھتے تھے ان کے ساتھ نبھانا ان کیلئے غیر ممکن تھا۔ انھیں ان لوگوں سے لڑنے میں لطف آتا تھا اور جہاں موقع پایا حملہ کر دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کیمبرج سے رخصت ہونے کے بعد میں نے ان کا ایک مضمون پڑھا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے انھیں کسی قدر گستاخی کے لہجے میں خط لکھا جس میں چبھتا ہوا فقرہ تھا کہ برطانوی حکومت یقیناً آپ کے سیاسی کاموں سے بہت خوش ہوگی۔ یہی باتیں تھیں جن پر انھیں بے حد طیش آجاتا تھا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گئے اور قریب تھا کہ مجھے فوراً انگلستان سے واپس آنے کا حکم دیں۔

کیمبرج کے قیام کے زمانے میں یہ سوال اٹھا کہ مجھے کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے کچھ دن انڈین سول سروس کا خیال رہا کیونکہ اس وقت تک یہ بڑی چیز سمجھی جاتی تھی مگر یہ تجویز نہ والد کو پسند تھی اور نہ مجھ کو اس لئے ترک کر دی گئی۔ میرے خیال میں اس کی

اصل وجہ یہ تھی کہ میری عمر سول سروس کے مقررہ معیار سے کم تھی اور اگر میں اس کا امتحان دینا چاہتا تو مجھے سند لینے کے بعد انگلستان میں تین چار برس اور قیام کرنا پڑتا۔ جب میں نے کیمبرج سے سند حاصل کی تو میری عمر بیس برس کی تھی اور سول سروس کے امتحان کیلئے اس زمانے میں ۲۲ سے ۲۴ سال تک کی قید تھی اور پھر کامیابی کے بعد ایک سال اور ٹھہرنا پڑتا تھا۔ میرے عزیز میرے انگلستان کے طویل قیام سے گھبرا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ میں جلد لوٹ آؤں۔ ایک اور وجہ جو والد کے نزدیک اہمیت رکھتی تھی یہ تھی کہ اگر مجھے سول سروس میں جگہ ملتی تو گھر سے دور مختلف مقامات پر رہنا پڑتا۔ لیکن والد اور والدہ دونوں اتنے عرصے کی جدائی کے بعد مجھے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ غرض فیصلہ یہ ہوا کہ میں اپنا آبائی پیشہ یعنی بیرسٹری اختیار کروں اور میں انر ٹیمپل میں داخل ہو گیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ سیاست میں تو میری انتہا پسندی روز بروز بڑھتی جاتی تھی، مگر سول سروس کی ملازمت یعنی ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مشین کا ایک پرزہ بن جانے کی تجویز مجھے کچھ زیادہ ناپسند نہ تھی۔ چند سال کے بعد یہ خیال مجھے بہت مکروہ معلوم ہوتا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں میں کیمبرج سے سند لے کر رخصت ہو گیا۔ میں نے سائنس کے سندی امتحانات میں اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی یعنی سیکنڈ کلاس آنرز پائے۔ اس کے بعد دو برس تک لندن میں سرگشت کرتا رہا۔ قانون کے مطالعہ میں مجھے بہت کم وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ بیرسٹری کے امتحانات میں نے ایک ایک کر کے پاس کر لئے اور بہت اچھا نہیں تو بہت برا بھی نہیں رہا۔ اور باتوں کے لحاظ سے میری زندگی بغیر کسی خاص مقصد کے گذر رہی تھی۔ ادھر ادھر کی کتابیں پڑھ کر وقت کاٹتا تھا۔ فیبین جماعت اور اشتراکیوں کے خیالات کا کچھ دھندلا سا اثر مجھ پر پڑا تھا، اور اس زمانے کی سیاسی تحریکوں کی طرف توجہ رہا کرتی تھی۔ آئرستان کے مسئلے اور عورتوں کے

دوسٹ کی تحریکات سے مجھے خاص طور پر دلچسپی تھی سنہ ۱۹۱۰ء میں گرمی کی تعطیل میں آئرستان جانے کا اتفاق ہوا اور سن فین جماعت کا جو نئی نئی قائم ہوئی تھی، اثر دل پر لے کر آیا۔

لندن میں میرے کچھ چند اپنے دوست مل گئے اور ان کی صحبت میں فضول خرچی کی عادت پڑ گئی۔ میرے والد مجھے بہت معقول جیب خرچ دیتے تھے مگر میں اکثر اس سے زیادہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ میرے والد بہت گھبرائے کہ لڑکا تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے مگر میں اصل میں یہ کار نمایاں انجام نہیں دے رہا تھا بلکہ صرف ان گانٹھ کے پورے آنکھ کے اندھے انگریزوں کی تقلید کی کوشش کر رہا تھا جو لندن کے "چھیلے" کہلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عیش و آرام کی اس بے ہستی زندگی سے مجھے کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا۔ میرا جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا۔ البتہ میری خود بینی اور بڑھ گئی۔

تعطیل کے زمانے میں کبھی کبھی میں یورپ کے اور ملکوں کا سفر بھی کیا کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۹ء کی گرمیوں میں جب کاؤنٹ زیپلین، فریڈرش ہافن سے اپنے نئے ہوائی جہاز میں اڑ کر برلن آئے تو میں اور والد برلن میں موجود تھے۔ میرے خیال میں یہ زیپلین کی پہلی لمبی اڑان تھی اس لئے اس کے اعزاز میں بڑا زبردست مظاہرہ کیا گیا اور خود قیصر نے باضابطہ طور پر اس کا استقبال کیا۔ بہت بڑا مجمع جس کا اندازہ دس لاکھ اور بیس لاکھ کے درمیان کیا جاتا تھا، برلن کے ٹیمپل ہوف کے میدان میں اکٹھا تھا۔ زیپلین مقررہ وقت پر پہنچا اور خوبصورتی کے ساتھ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہا۔ ہوٹل آدلان نے اس روز اپنے ہر مہمان کو کاؤنٹ زیپلین کی ایک نہایت عمدہ تصویر تحفے کے طور پر دی اور میرے پاس یہ تصویر اب تک موجود ہے۔ اس کے دو مہینے کے بعد ہم نے پیرس میں ایک طیارے کو پہلے پہل سارے شہر کا چکر لگاتے اور ایفل ٹاور کے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس کے چلانے والے کا نام میرے خیال میں کونت دولامبیر تھا۔ اتفاق سے اٹھارہ برس بعد جب لنڈبرگ بحر اوقیانوس کو پار کر کے چمکتے ہوئے

تیر کی طرح پیرس پہنچا تو میں پھر وہیں موجود تھا۔

ایک بار بارے میں بال بال بچ گیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں کیمبرج سے سند لینے کے بعد میں وہاں ایک جماعت کے ساتھ سیر کرنے گیا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم لوگ ایک پہاڑی خطے میں پیدل سفر کر رہے تھے۔ دن بھر کے تھکے ماندے اور گرمی سے پریشان ہم اپنی منزل پر یعنی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچے اور پہنچتے ہی یہ کہا کہ ہم نہانا چاہتے ہیں، وہاں نہانے کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا اور ہوٹل میں اس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ البتہ یہ معلوم ہوا کہ وہاں سے قریب ایک چشمہ ہے اور ہم چاہیں تو اس میں غسل کر سکتے ہیں چنانچہ ایک انگریز اور میں دو آدمی میز کی چادریں یا شاید ہاتھ منہ پونچھنے کے تولیے جو ہوٹل والوں نے اپنی فیاضی سے عنایت کئے تھے لے کر وہاں پہنچے۔ یہ ایک پُر شور نالہ تھا جو ایک قریب کی برف کی چٹان سے نکلا تھا۔ میں نے اس میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ پانی گہرا نہیں مگر برف کی طرح ٹھنڈا ہے اور اس کی تہ میں غضب کی پھسلن ہے میں پھسل کر گرا اور سردی سے بیہوش ہو گیا یعنی نہ تو کچھ حس باقی رہی اور نہ ہاتھ پاؤں پر قابو رہا۔ میں نے قدم جمانا چاہا مگر نہیں جما اور پانی مجھے تیزی سے بہا کر لے چلا۔ میرا انگریز ساتھی کسی نہ کسی طرح پانی سے نکلا اور چشمے کے کنارے کنارے دوڑتا رہا یہاں تک کہ اس نے میری ٹانگ پکڑ پائی اور مجھے کھینچ کر باہر نکالا۔ مجھے اپنے خطرے کا اندازہ بعد میں ہوا، اس لئے کہ کوئی دو تین سو گز کے فاصلے پر یہ پہاڑی چشمہ بہت بڑی بلندی سے نیچے گرتا تھا اور ایک آبشار بن جاتا تھا جو اس مقام کے دلچسپ مناظر میں شمار ہوتا تھا۔

سنہ ۱۹۱۲ء کی گرمی میں، میں نے بیرسٹری کی سند حاصل کر لی اور اسی سال خزاں کے موسم میں سات برس کے قیام کے بعد انگلستان سے ہندوستان روانہ ہوا۔ اس عرصے میں دو مرتبہ تعطیل میں گھر آ چکا تھا مگر اب کی بار مستقل طور پر واپس آ رہا تھا جب میں نے
۱۰ بمبئی میں قدم رکھا تو سوا خود بینی کے کوئی صفت مجھ میں نظر نہیں آتی تھی۔

(۵)

انگلستان سے واپسی

اور زمانہ جنگ کی سیاست

سنہ ۱۹۱۲ء کے آخر میں سارے ہندوستان پہ خاموشی چھائی ہوئی تھی تلک جیل میں تھے۔ انتہا پسند اچھی طرح کچلے جا چکے تھے اور ان کی حالت بے چرواہے کی بھیڑوں کی سی تھی۔ تقسیم بنگالہ کو منسوخ کرانے کی کوشش میں ناکامی ہونے کے بعد بنگال میں بھی ایک سناٹا چھا گیا تھا اور اعتدال پسند جماعت منٹو مارلے اسکیم کے نفاذ کے بعد کونسلوں کے جال میں پھنس چکی تھی۔ البتہ ان ہندوستانیوں کا کچھ خیال لوگوں کو ضرور تھا جو بیچارے پردیس میں پڑے تھے۔ خاص کر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا۔ کانگریس بھی اس زمانے میں معتدل خیال کی جماعت تھی۔ بس سال کے سال جلسہ ہو جاتا اور چند بے جان سی تجویزیں منظور ہو جاتیں غرض اس میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں بانکی پور کانگریس کے جلسے میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے میں بھی شریک ہوا تھا۔ اس وقت یہ انگریزی داں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا ایک میلہ معلوم ہوتی تھی۔ جدھر دیکھو بس کوٹ پتلونوں کی نمائش تھی۔ اس پر کسی سیاسی جلسے کا شبہ تک نہ ہوتا تھا۔ نہ کوئی جوش و خروش تھا اور نہ کشاکش۔ معلوم ہوتا تھا کہ دوستوں کی بے تکلف صحبت ہے۔ گوکھلے جو اسی زمانے میں افریقہ سے واپس آئے تھے اس جلسے میں موجود تھے اور سب سے نمایاں تھے وہ بےچین طبیعت کے آدمی تھے۔ سرگرمی اور جوش عمل کے

نکلے معلوم ہونے تھے۔ اس سارے مجمع میں وہی ایک ایسے شخص تھے جو سیاست کی سچ مچ کوئی اہمیت سمجھتے تھے اور قومی کام کو کام کی طرح کرنا چاہتے تھے بہرحال میں ان سے بہت متاثر ہوا۔

جب وہ بانکی پور سے روانہ ہوئے تو بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ وہ اس وقت پبلک سروس کمیشن کے رکن تھے، اس لئے سفر میں فرسٹ کلاس کا ایک پورا ڈبہ انھیں مل جاتا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اور یوں بھی وہ ناموس صحبت سے گھبراتے تھے اس لئے چاہتے تھے کہ تنہائی میں ذرا سکون مل جائے۔ کانگریس کی مصروفیت کے بعد انھیں امید بھی کہ ریل میں یہ سکون میسر آجائے گا۔ بہرحال انھیں ایک اکیلا ڈبہ مل گیا۔ لیکن باقی گاڑی کلکتہ جانے والے ڈیلی گیٹوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر بھوپیندر ناتھ باسو جو بعد میں انڈیا کونسل کے ممبر رہے ہیں ان کے پاس تشریف لائے اور باتوں باتوں میں ان سے اسی ڈبے میں آجانے کی اجازت چاہی۔ مسٹر گوکھلے گو مگو میں پڑ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ مسٹر باسو بڑے باتونی ہیں لیکن بیچارے آخر کرتے کیا۔ اخلاقاً اجازت دینا پڑی۔ چند منٹ بعد مسٹر باسو پھر آئے اور پوچھا کہ اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو میں اپنے ایک دوست کو بھی ساتھ لیتا آؤں۔ مسٹر گوکھلے کو ناچار پھر ہاں کرنا پڑی۔ گاڑی روانہ ہونے سے پہلے مسٹر باسو یہ بھی کہہ گذرے کہ مجھے اور میرے دوست کو اوپر والے گدے پر سونے میں بڑی تکلیف ہوگی اس لئے اگر زحمت نہ ہو تو آپ اوپر چلے جائیں تاکہ ہم دونوں نیچے کے گدوں پر لیٹ سکیں۔ غالباً یہی صورت طے ہوئی اور بیچارے گوکھلے کو ساری رات بڑی بے چینی سے اوپر گذارنی پڑی۔

میں نے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی اور اس نئے کام میں میرا تھوڑا بہت جی بھی لگنے لگا۔ یورپ سے واپسی پر شروع شروع میں چند مہینے تو لطف سے کٹے۔ کیونکہ مجھے وطن واپس آنے اور بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی بڑی خوشی تھی لیکن رفتہ

رفتہ رفتہ یہ زندگی جو میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ گذار رہا تھا بے کیف معلوم ہونے لگی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ میں لایعنی اور بے مقصد زندگی کے جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ شاید میری دورخی تعلیم اس بے اطمینانی اور پریشانی کا باعث ہو۔ میں انگلستان میں سات برس تک رہا تھا اس لئے مجھ پر وہاں کی تہذیب و تمدن کا کافی اثر تھا۔ ممکن ہے اسی وجہ سے میرا یہاں دل نہ لگتا ہو۔ خوش قسمتی سے گھر کی فضا کچھ غنیمت تھی اس لئے یہاں مجھے سکون ملتا تھا لیکن سارے دن گھر ہی میں تو رہتا نہ تھا۔ اکثر وقت بار لائبریری اور کلب میں گذرتا تھا۔ یہاں دونوں جگہ زیادہ تر وکیل ہی ہوتے تھے اور ان میں ہر وقت بس اپنے پیشے اور قانون کی باتیں چھڑی رہتی تھیں۔ غرض ذہنی نشو و نما کی کوئی صورت نہ تھی اور نہ تفریح یا دل بہلانے کا کوئی معقول انتظام تھا اس لئے میری طبیعت پر ایک اُداسی سی طاری رہنے لگی۔

ای۔ ایف۔ فارسٹر نے حال ہی میں جی۔ لوئس۔ ڈکنسن کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ڈکنسن نے ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ فرمائے تھے کہ "ان دونوں قوموں میں میل جول کیوں نہیں ہو سکتا؟ محض اس لئے کہ ہندوستانی انگریزوں پر اجیرن ہو جاتے ہیں یہ ایک صاف اور صریح حقیقت ہے"۔ بہت ممکن ہے کہ اکثر انگریزوں کا بھی خیال ہو اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ فارسٹر اپنی ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کا رہنے والا ہر انگریز یہ سمجھتا ہے اور صحیح سمجھتا ہے کہ وہ ایک فاتح فوج کا سپاہی ہے چنانچہ اسی کے مطابق وہ اپنا رویہ بھی رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں ان قوموں کے درمیان باہمی مراسم اور بے تکلفی کیسے بڑھ سکتی ہے۔ انگریز اور ہندوستانی دونوں ایک دوسرے کے سامنے بنتے ہیں اس لئے انھیں ایک دوسرے کی صحبت کھل جاتی ہے۔ ہر ایک دوسرے پر بار ہوتا ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اس سے جس قدر جلد چھٹکارا

مل جائے اچھا ہے تاکہ اطمینان کا سانس لے اور آزادی سے اُٹھ بیٹھ سکے۔

عموماً انگریزوں کو ایک ہی قسم کے ہندوستانیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے یعنی سرکاری لوگوں سے۔ باذاق اور معقول ہندوستانیوں کی صحبت انھیں کہاں نصیب ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ انھیں اس ڈھب پر نہیں لاسکتا کہ گھل مل کر باتیں کریں۔ برطانوی حکومت نے ہمارے یہاں سرکاری طبقہ کو چاہے وہ انگریز ہو یا ہندوستانی سماجی حیثیت سے بھی بہت زیادہ اہمیت دیدی ہے لیکن یہ طبقہ بے انتہا تنگ نظر اور نامردہ دل واقع ہوا ہے۔ نوجوان اور ہونہار انگریز بھی ہندوستان آتے ہی ذہنی اور علمی اعتبار سے مجہول بن جاتا ہے اور زندہ دلی سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ دن بھر وہ دفتر کی ان مسلوں میں سر کھپاتا ہے جو ہمیشہ گشت میں رہا کرتی ہیں اور کبھی ختم ہونے کو نہیں آتیں۔ اس کے بعد وہ تھوڑی سی ورزش کرتا ہے پھر اپنے ہمجنسوں کے پاس کلب میں چلا جاتا ہے وہاں وہسکی پیتا ہے اور برج اور لندن کے دوسرے ہفتہ وار رسائل پڑھتا ہے یہی اس کا روز کا معمول ہے۔ کتابیں تو وہ شاید ہی کبھی پڑھتا ہو۔ اور اگر کبھی جی چاہا بھی تو اپنی کوئی پرانی محبوب کتاب اٹھا لیتا ہے اور تھوڑی دیر اس سے دل بہلاتا ہے۔ پھر جب رفتہ رفتہ اس کا دماغ شل اور ذہن کند ہو جاتا ہے تو ہندوستان کو الزام دیتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کو کوستا ہے اور شورش کرنے والوں کی اس جماعت کو برا بھلا کہتا ہے جو اس کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیتی ہے لیکن وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس ذہنی اور دماغی تنزل کی اصل وجہ ہندوستان کا بے لگام استبدادی طرز حکومت ہے اور وہ خود اس مشین کا ایک چھوٹا سا پُرزہ ہے۔

انگریز افسروں کو یورپ جانے کے لئے جلد جلد رخصت ملتی رہتی ہے اس کے باوجود اگر ان کی یہ کیفیت ہے تو سمجھ لیجیے کہ ان کے ہمسر یا ماتحت ہندوستانی افسروں کی کیا حالت ہوگی جو انھی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اگر آپ کو کبھی

نئی دہلی کے انگریز اور ہندوستانی اعلیٰ حکام کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ترقی، تبادلہ، رخصت اور اسی قسم کی لغویاتِ ملازمت کے متعلق اُن کی رام کہانی سنی ہے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شاید ہی کوئی دوسری چیز اس سے زیادہ سوہانِ روح ہوتی ہو۔

ہندوستان کے متوسط طبقے خاص کر انگریزی جاننے والوں کی زندگی پر اس سرکاری فضا نے کافی اثر کیا اور اسی سانچے میں اسے ڈھال دیا کلکتہ بمبئی جیسے بڑے شہر تو ایک حد تک اس سے محفوظ ہیں۔ باقی ہر جگہ کے غیر سرکاری لوگ یعنی وکیل ڈاکٹر وغیرہ بھی اس کا شکار ہوگئے ہیں حتیٰ کہ نیم سرکاری یونیورسٹیوں کی ادبی فضا بھی اس سے مسموم نظر آتی ہے۔ یہ سب لوگ باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور عوام سے حتیٰ کہ متوسط طبقے کے نسبتاً نیچے درجے کے لوگوں سے بھی انھیں کوئی تعلق نہیں رہتا۔ سیاسیات متوسط طبقے کے اونچے لوگوں تک محدود تھی ۱۹۰۶ء کے بعد سے بنگال میں قومی تحریک نے پہلے پہل اس کفر کو توڑا۔ اور اس طبقے کے ادنیٰ درجے کے لوگوں میں بلکہ ایک حد تک عوام میں بھی نئی روح پھونک دی۔ یہ رفتار آگے چل کر گاندھی جی[1] کی رہبری میں زیادہ تیز ہوگئی۔ قومی تحریک اگرچہ حیات بخش ہوتی

---

(۱) میں نے اس کتاب میں اکثر جگہ مسٹر گاندھی یا مہاتما گاندھی کو گاندھی جی لکھا ہے کیونکہ وہ خود اپنے نام کے ساتھ مہاتما کا استعمال پسند نہیں کرتے اور "جی" کو ترجیح دیتے ہیں لیکن انگریز مصنفوں کے مضامین اور کتابوں میں اکثر اس کی عجیب عجیب تاویلیں میری نظر سے گذری ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ محبت کا کلمہ ہے یعنی گاندھی جی کے معنی ہیں "اچھے پیارے گاندھی" یہ بالکل لغو ہے اور ہندوستانی تہذیب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہمارے یہاں "جی" ہر شخص کے نام کے ساتھ عام طور پر لگایا جاسکتا ہے۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت، لڑکا ہو، لڑکی ہو (باقی)

ہے لیکن اس کا مطمح نظر نہایت محدود ہوتا ہے اور اس میں اتنی قوت عمل اور توجہ صرف کرنی پڑتی ہے کہ دوسرے کاموں کے لئے مہلت نہیں ملتی۔

انہی وجوہ سے انگلستان سے واپسی کے بعد چند سال تک میں بہت دل برداشتہ رہا۔ اپنے پیشے میں مجھے پورا انہماک پیدا نہیں ہوا تھا اور سیاسیات میں اس وقت مجھے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ تھا کیونکہ میرے نزدیک سیاسیات کا مفہوم صرف یہ تھا کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جارحانہ کارروائی کی جائے با ایں ہمہ میں کانگرس میں داخل ہو گیا اور کبھی کبھی اس کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ جب کبھی کوئی خاص موقع پیش آتا تھا مثلاً ہندوستانی مزدوروں کو اقرارنامے لکھوا کر فی جی لے جانے کے خلاف جدوجہد کرنے کا سوال یا جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا مسئلہ تو میں سرگرمی سے اس میں کود پڑتا تھا اور دل و جان سے کوشش کرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ محض دفع الوقتی تھی کوئی مستقل شغل نہ تھا۔

مجھے سیر و شکار کی طرف کچھ رغبت تھی لیکن کوئی خاص شوق نہیں تھا در اصل میں صحرا نوردی کی خاطر شکار کو جاتا تھا۔ جانوروں کو ہلاک کرنا مقصد نہ تھا میں خاص طور پر اس کے لئے مشہور تھا کہ شکار میں، میں نے کبھی خون نہیں بہایا البتہ ایک مرتبہ کشمیر میں

(نوٹ صفحہ ۵۹) یا بچہ۔ اس سے محض احترام ظاہر ہوتا ہے جیسے مسٹر، مسز یا مس وغیرہ سے ہندوستانی زبان میں القاب و آداب اور اعزازی خطابوں کی کمی نہیں ہے "جی" ان میں سب سے معمولی اور تکلف سے پاک ہے لیکن اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل مکمل ہے میرے بہنوئی آر۔ ایس پنڈت نے مجھے بتلایا کہ لفظ "جی" نہایت قدیم اور وسیع تاریخ رکھتا ہے۔ یہ سنسکرت کے لفظ آریہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں معزز یا شریف النسل (وہ مفہوم نہیں جو نازی اس لفظ کا سمجھتے ہیں) رفتہ رفتہ پراکرت میں آریہ بگڑ کر اجّا ہو گیا۔ اور پھر اجّا صرف "جی" رہ گیا۔

اتفاق سے ایک ریچھ ضرور مارا تھا۔ بالآخر ایک ہرن کا ایسا واقعہ پیش آیا کہ شکار کا یہ تھوڑا بہت شوق بھی ختم ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک مرتبہ یہ بیچارہ بے ضرر جانور زخمی ہو کر میرے پانوؤں کے قریب آ کر گر پڑا اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر نہایت حسرت سے میری طرف دیکھا۔ یہ پُرنم اور غمگین آنکھیں اب تک مجھے یاد ہیں اور عرصے تک ان کا تصور مجھے ستاتا رہا۔

اس زمانے میں مسٹر گوکھلے کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی سے میں بہت متاثر تھا۔ میں نے کبھی اس میں شریک ہونے کا خیال نہیں کیا کیونکہ اول تو ان کا سیاسی نقطۂ نظر میرے معیار سے بہت کم تھا۔ دوسرے اس وقت تک میرا ارادہ وکالت ترک کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن میرے دل میں اس سوسائٹی کے اراکین کی بڑی عزت تھی کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی اور محض گذارے کے لائق تھوڑا سا معاوضہ قبول کر لیتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہاں بالکل صحیح اصولوں پر نہ بھی سہی لیکن کم سے کم یکسوئی سے ٹھوس اور مسلسل کام تو ہوتا ہے۔

ہاں! ایک مرتبہ مسٹر سرینواس شاستری کی ایک بات سے مجھے بڑا صدمہ پہنچا۔ اگرچہ اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھوں نے الہ آباد میں طالب علموں کے ایک جلسے میں تقریر فرمائی اور انھیں نصیحت کی کہ ہمیشہ اپنے استادوں کی عزت و فرماں برداری اور حاکم وقت کے بنائے ہوئے تمام قواعد و ضوابط کی سختی سے پابندی کیا کرو۔ باتیں تو یہ بڑے مزے کی تھیں لیکن مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اقتدار پرستی پر جو غیر معمولی زور دیا گیا تھا اس کی وجہ سے یہ مجھے کچھ نامناسب اور بچری سی معلوم ہوئیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ شاید اس نیم سرکاری فضا کا اثر ہے جو ہندوستان پر چھائی ہوئی ہے۔ مسٹر شاستری نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ لڑکوں سے یہ خواہش بھی کی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی حرکتوں کی فوراً اپنے افسر کو اطلاع

دیا کریں۔ دوسرے معنوں میں وہ گویا ایک دوسرے کی مخبری کیا کریں اور خفیہ پولیس کی خدمت انجام دیں۔ مسٹر شاستری نے کھلے کھلے الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا لیکن ان کا منشا یہی تھا۔ اس لئے میں اس جلیل القدر لیڈر کے دوستانہ مشورے کو حیرت سے سُن رہا تھا میں حال ہی میں انگلستان سے واپس آیا تھا۔ وہاں اسکول اور کالج میں یہ بات ہمارے ذہن نشین کرائی گئی تھی کہ اپنے ساتھی کو کبھی دغا نہ دینا۔ وہاں کی تہذیب میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا کہ اپنے ساتھی کا راز معلوم کرکے پھر مخبری کیجائے اور اس طرح اسے پریشانی میں مبتلا کیا جائے لیکن یہاں اس کے بالکل برعکس بات سنکر میں حیران رہ گیا اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ مسٹر شاستری کے اخلاقی نظریہ میں اور اس نظریہ میں جس کی مجھے انگلستان میں تعلیم دی گئی تھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

جنگ عظیم شروع ہوتے ہی ہماری توجہ کا رخ ادھر پھر گیا۔ چونکہ یہ لڑائی بہت دور ہو رہی تھی اس لئے شروع شروع میں ہم پر اس کا زیادہ اثر نہیں پڑا اور سچ پوچھئے تو ہندوستان کو اس کی تباہ کاریوں کا پورا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ بہر حال اس کی وجہ سے سیاسی تحریک رُک گئی اور اس کی اہمیت کم پڑ گئی۔ قانون تحفظ ہند نے سارے ملک کو اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا۔ جنگ کے دوسرے سال سے ملک میں گولیاں چلنی کی اور طرح طرح کی سازشوں کی خبریں آنے لگیں اور یہ معلوم ہوا کہ پنجاب میں رنگروٹ بھرتی کرنے میں انتہائی جبر و تشدد سے کام لیا جا رہا ہے۔

اگرچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کیا جاتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کے ساتھ دلی ہمدردی کسی کو نہ تھی جرمنی کی فتوحات سُن سُن کر جتنی خوشی انتہا پسندوں کو ہوتی تھی اتنی ہی اعتدال پسندوں کو جرمنی سے کسی کو الفت نہ تھی محض یہ جذبہ کام کرتا تھا کہ اپنی آنکھوں سے اپنے فاتح کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھیں یہ گویا کمزور اور مسکین شخص کے خاموش انتقام کا جذبہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس

جنگ کے متعلق بیشتر ہندوستانیوں کے دلوں میں طرح طرح کے جذبات موجود تھے۔ مجھے سب قوموں سے زیادہ فرانس سے ہمدردی تھی۔ اتحادیوں کی طرف سے برابر نہایت بیباکی سے پروپگنڈا ہورہا تھا۔ اور اگرچہ ہم اس کا زیادہ اعتبار نہیں کرتے تھے پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ سیاسی بیداری پھر شروع ہوگئی۔ لوکمانیہ تلک جیل سے رہا ہو کر آگئے اور ایک ہوم رول لیگ انھوں نے اور ایک مسز بیسنٹ نے قائم کی میں دونوں میں شریک ہوگیا لیکن زیادہ تر کام مسز بیسنٹ کی لیگ میں کیا۔ ہندوستانی سیاست میں مسز بیسنٹ کی سرگرمیاں برابر بڑھتی گئیں۔ کانگرس کے سالانہ جلسوں میں بھی کچھ جوش و خروش نظر آنے لگا اور مسلم لیگ بھی کانگرس کے قدم بہ قدم چلنے لگی معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے۔ ہم نوجوان عموماً بہت مسرور تھے کیونکہ ہمیں یہ امید تھی کہ بہت جلد کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ مسز بیسنٹ کی نظر بندی سے تعلیم یافتہ طبقے میں اور زیادہ جوش پیدا ہوگیا اور سارے ملک میں ہوم رول کی تحریک کو اس سے بہت تقویت پہنچی۔ ان دونوں لیگوں میں نہ صرف وہ پرانے انتہا پسند شریک ہوئے تھے جو سنہ ۱۹۰۷ء کے بعد کانگرس سے کنارہ کش ہوگئے تھے بلکہ متوسط طبقے کے نئے نئے کارکن بھی شامل ہوگئے لیکن عوام تک ابھی ان کا اثر نہیں پہنچا تھا۔

مسز بیسنٹ کی نظر بندی سے بوڑھوں اور اعتدال پسندوں میں بھی ہیجان پیدا ہوگیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نظر بندی سے کچھ پہلے جب میں اخباروں میں مسٹر سری نواس شاستری کی زوردار تقریریں پڑھا کرتا تھا تو میں بے انتہا متاثر ہوتا تھا۔ لیکن نظر بندی سے چند روز پہلے یا شاید چند روز بعد مسٹر شاستری نے یکایک خاموشی اختیار کر لی۔ جب عمل کا وقت آیا تو وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے اس لئے انکی

اس خاموشی پہ بہت زیادہ مایوسی اور ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔ کیونکہ اس وقت صحیح رہبری کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ شاید اسی کے بعد سے یہ بات میرے دل پہ نقش ہو گئی ہے کہ مسٹر شاستری عملی آدمی نہیں ہیں اور معرکہ آرائی سے ان کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔

بہرحال دوسرے اعتدال پسند رہنما اس وقت برابر شریک رہے لیکن کچھ عرصے بعد بعض تو پیچھے ہٹ گئے اور بعض نے جو قدم بڑھایا تھا اس پر قائم رہے۔ حکومت ہند نے اس زمانے میں یورپ کے نمونے پر متوسط طبقے میں سے ایک انڈین ڈیفنس فورس ترتیب دینا شروع کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس پہ بہت بحثیں ہوا کرتی تھیں بہت سی صورتوں میں یورپین فورس کے مقابلے میں ہندوستانی فورس کے ساتھ خراب سلوک روا رکھا گیا تھا۔ اس لئے ہم میں سے اکثر حضرات کا یہ خیال تھا کہ جب تک یہ ذلت آمیز امتیاز نہ اٹھ جائے ہمیں تعاون نہ کرنا چاہیئے۔ بالآخر بہت کچھ بحث مباحثہ کے بعد یو۔پی میں ہم نے یہ طے کیا کہ ہمیں بھی شریک ہو جانا چاہیئے کیونکہ خیال یہ تھا کہ کچھ بھی سہی ہمارے نوجوانوں کو فوجی تعلیم تو حاصل ہو گی میں نے بھی اس فورس میں نام لکھانے کے لئے اپنی درخواست بھیج دی اور اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہم نے الہ آباد میں ایک کمیٹی قائم کی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مسز بیسنٹ کی نظربندی کی خبر ملی بس اس وقتی جوش خروش سے فائدہ اٹھا کر میں نے کمیٹی کو جس کے رکن والد، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو اور مسٹر سی وائی چنتامنی تھے اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ حکومت کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنا جلسہ اور ڈیفنس فورس کے متعلق تمام کارروائی منسوخ کر دے چنانچہ فوراً اس قسم کا اعلان شائع کر دیا گیا میرا خیال ہے کہ بعض دستخط کرنے والوں کو بعد میں اس کا افسوس ہوا ہوگا کہ جنگ کے زمانے میں انھوں نے ایسی مخالفانہ حرکت کیوں کی۔

مسز بسینٹ کی نظربندی سے متاثر ہو کر میرے والد اور دوسرے اعتدال پسند رہنما بھی ہوم رول لیگ میں شریک ہو گئے۔ چند مہینے کے بعد ان میں سے اکثر حضرات مستعفی ہو گئے۔ لیکن میرے والد بدستور اس میں شریک رہے اور الہ آباد کی شاخ کے صدر منتخب ہوئے۔

رفتہ رفتہ میرے والد کو اعتدال پسند جماعت کے عقائد سے نفرت ہوتی جاتی تھی انھیں یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ جو حکومت ہماری کوئی پروا نہ کرتی ہو اور ہم سے حقارت کا برتاؤ کرے ہم خواہ مخواہ اس کی تابعداری اور خوشامد کریں۔ لیکن پرانے انتہا پسند فرقے کی طرف بھی ان کا رجحان نہ تھا کیونکہ ان کے الفاظ میں سختی اور طریقۂ کار میں شدت تھی۔ اور یہ دونوں باتیں اس وقت انھیں پسند نہ تھیں۔ مسز بسینٹ کی نظربندی اور اس کے بعد کے واقعات سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے لیکن مستقل طور پر آگے قدم بڑھانے میں انھیں تامل تھا۔ اس زمانے میں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اعتدال پسند جماعت کی ترکیبیں محض بیکار ہیں لیکن کیا کیا جائے۔ جب تک ہندو مسلم قضیہ طے نہیں ہوتا تمام کوششیں بے سود ہیں چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ اگر یہ مسئلہ حل ہو جائے تو میں تیز قدم سے تیز قدم نوجوانوں کے دوش بدوش چلنے کو تیار ہوں۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس نے کانگریس اور لیگ کی مشترکہ اسکیم منظور کر لی۔ اس کا خاکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ہمارے ہی گھر میں بیٹھ کر تیار کیا تھا۔ والد کو اس سے بے انتہا مسرت ہوئی کیونکہ اس سے متحدہ جدوجہد کے دروازے کھل گئے تھے۔ اب وہ خوشی خوشی آگے بڑھنے کو تیار تھے چاہے اعتدال پسند جماعت کے پرانے رفقا کا انھیں ساتھ چھوڑنا پڑے پھر بھی وزیر ہند کی حیثیت سے ایڈورڈ مانٹیگو کے ہندوستان آنے تک اور ان کے دورے کے زمانے میں بھی والد ان کے ساتھ رہے۔ اصل اختلاف تو مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم

کے شائع ہونے کے بعد شروع ہوا اور بالکل قطع تعلق اس وقت ہو گیا جب ۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں یو۔پی کی اسپیشل کانفرنس کا جلسہ میرے والد کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اعتدال پسندوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ کانفرنس مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کی سخت مخالفت کرے گی، پہلے ہی سے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس کے بعد اس اسکیم پر غور کرنے کے لئے کانگریس کا جو خاص اجلاس ہوا اس میں بھی یہ لوگ شریک نہیں ہوئے بس اسی زمانے سے اعتدال پسند کانگریس سے علیحدہ ہیں۔

اعتدال پسندوں کی یہ حرکت کہ وہ ہر موقع پر چپکے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے کانگریس کے اجلاس اور دوسرے عام جلسوں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے اور اگر اکثریت مخالف ہو تو اپنا نقطہ نظر پیش کرتے اور اس کے لئے لڑنے کی ہمت بھی نہ کر سکتے میرے نزدیک قومی کام کرنے والوں کو کسی طرح زیب نہ دیتی تھی۔ جہانتک میرا اندازہ ہے، ملک کے اکثر حضرات کی یہی رائے تھی اور مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ جھجک اور بزدلی بھی ایک حد تک انھیں ہندوستانی سیاسیات سے خارج کرنے کا باعث ہوئی۔ جب اعتدال پسندوں کی جماعت نے کانگریس کا بائیکاٹ کر دیا تو پھر ان میں سے کوئی شخص اس کے جلسوں میں شریک نہیں ہوا۔ البتہ کچھ عرصے تک صرف مسٹر شاستری شریک ہوتے رہے اور تنہا اپنا نقطہ نظر پیش کرتے رہے۔ اسی سبب سے لوگوں کی نظروں میں ان کی وقعت بڑھ گئی۔

جنگ کے ابتدائی زمانے تک میں سیاسی اور قومی کاموں میں کھل کر حصہ نہ لیتا تھا خاص کر جلسوں میں تقریر کرنے سے بچتا تھا کیونکہ عام مجمع میں زبان کھولتے ہوئے ابھی مجھے خوف اور جھجک سی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دوسری وجہ بھی تھی میرا خیال تھا کہ عام جلسوں میں انگریزی میں تقریریں نہ ہونا چاہئیں اور اپنے متعلق مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ میں ہندوستانی میں اچھی طرح بول سکوں گا۔ بہرحال الہ آباد میں پہلی مرتبہ میں نے

تقریر کی۔ اس وقت کا ایک معمولی سا واقعہ اب تک مجھے یاد ہے۔ غالباً یہ ۱۹۱۵ء کا ذکر ہے لیکن مجھے صحیح تاریخوں کا خیال نہیں ہے اور واقعات کا سلسلہ بھی میرے ذہن میں کچھ خلط ملط سا ہے۔ اس وقت حکومت نے پریس کا گلا دبانے کے لئے ایک نیا قانون بنایا تھا اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا گیا۔ اسی جلسے میں میں نے مجبوراً انگریزی میں نہایت مختصر تقریر کی۔ جلسہ ختم ہوتے ہی ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے ڈائس ہی پر مجھے گلے لگا لیا اور بھرے مجمع میں پیار کرنا شروع کیا۔ میں گھبرا اٹھا۔ ڈاکٹر سپرو کے جوش کی یہ وجہ نہ تھی کہ میں نے کوئی بڑی بات کہی تھی یا اچھے انداز سے کہی تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں قومی کام تقریروں تک ہی محدود تھا اس لئے وہ پھولے نہ سماتے تھے کہ میں نے مجمع کے سامنے زبان تو کھولی۔ گویا قومی کام کے لئے ایک نیا کارکن ہاتھ آگیا۔

مجھے خیال ہے کہ الہ آباد کے اکثر نوجوانوں کو اس وقت تھوڑی سی یہ امید تھی کہ شاید ڈاکٹر سپرو سیاسیات میں آگے قدم بڑھائیں۔ اعتدال پسندوں کی ساری جماعت میں انہی سے یہ توقع تھی کیونکہ وہ جذباتی آدمی تھے اور کبھی کبھی جوش میں آجاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں میرے والد بہت ٹھنڈی مٹی کے معلوم ہوتے تھے لیکن اس راکھ کے نیچے کافی آگ دبی ہوئی تھی۔ شروع شروع میں تو ہم ان کی قوت ارادی کی وجہ سے ان سے مایوس ہو چکے تھے اور ان کے مقابلہ میں ڈاکٹر سپرو سے زیادہ امیدیں رکھتے تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کی قومی خدمات بھی بہت زیادہ تھیں اس لئے ہماری نظریں ان کی طرف بھی بڑھتی تھیں۔ ہم ان سے گھنٹوں بات چیت کرتے اور اس پر زور دیتے کہ اس وقت ملک کی معقول رہبری فرمائیے۔

اس زمانے میں ہمارے گھر میں سیاسی مسائل پر خوب گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں اور جہاں یہ ذکر چھڑا فوراً جھڑپ ہو جاتی تھی۔ والد نہایت غور سے اس چیز کا مطالعہ

کررہے تھے کہ میرا رجحان انتہاپسندی کی طرف ہے اور میں سیاست میں باتیں بنانے کا سخت مخالف اور عملی کام کرنے کا حامی ہوں میں کیا عملی کام چاہتا تھا یہ اس وقت واضح نہ تھا لیکن کبھی کبھی والد کو یہ خیال ہوتا تھا کہ بنگال کے بعض نوجوانوں کی طرح میں بھی تشدد کی طرف جارہا ہوں۔ اس سے انھیں بڑی تشویش ہوتی تھی حالانکہ میرا رجحان اس طرف قطعی نہ تھا۔ صرف یہ خیال ہر وقت پریشان کیا کرتا تھا کہ موجودہ صورت ہمیں بزدلی کے ساتھ گوارا نہ کرنی چاہیے بلکہ اب کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے لیکن کوئی ایسی نتیجہ خیز کارروائی جس سے قوم کا بیڑا پار ہو آسان نہ تھی۔ تاہم میرے نزدیک ہماری انفرادی اور قومی عزت کا تقاضا یہی تھا کہ ہم غیر ملکی حکومت کے خلاف زیادہ جارحانہ کارروائی کریں۔ والد بھی اعتدال پسندوں کے نظریہ سے دل برداشتہ تھے اور ان کے دماغ میں بھی خاموش کش مکش جاری تھی۔ لیکن ان میں ایک خاص آن تھی جب تک انھیں یقین نہ ہو جاتا کہ اب کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا وہ اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہٹتے۔ ہر نیا قدم وہ خوب سوچ سمجھ کر اٹھاتے اور جو قدم آگے بڑھ جاتا اس کا پیچھے ہٹنا ناممکن تھا ان کا ہر فعل وقتی جوش کا نہیں بلکہ انتہائی غور و خوض کا نتیجہ ہوتا تھا اور ایک مرتبہ طے کر لینے کے بعد پھر ان کی غیرت اس کی اجازت بھی نہ دیتی تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں۔

ان کے سیاسی عقائد میں ظاہری تبدیلی مسز بیسنٹ کی نظربندی کے بعد سے شروع ہوئی۔ اس وقت سے وہ درجہ بدرجہ برابر آگے بڑھتے گئے اور اپنے اعتدال پسند رفقا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا حتی کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں حادثہ پنجاب کے بعد انھوں نے اپنی قدیم معاشرت اور اپنا پیشہ سب کچھ تج دیا اور گاندھی جی کی شروع کی ہوئی نئی تحریک میں تن من دھن سے شریک ہو گئے۔

لیکن یہ تو ابھی بہت بعد کا ذکر ہے سنہ ۱۹۱۵ء اور سنہ ۱۹۱۷ء کے درمیان انھوں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کچھ تو ان کے دل میں ابھی شکوک باقی

تھے اور کچھ وہ میری طرف سے بہت پریشان تھے۔ اس لئے حالاتِ حاضرہ پر وہ سکون کے ساتھ گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ اکثر و بیشتر ہماری گفتگو اس طرح یکایک ختم ہو جاتی تھی کہ وہ بگڑنے لگتے۔

گاندھی جی سے میں پہلے پہل ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس میں ملا تھا جنوبی افریقہ میں انھوں نے حکومت کا جس دلیری سے مقابلہ کیا تھا ہم سب اس کے معترف اور مداح تھے لیکن ہم نوجوانوں کو وہ عجیب و غریب شخص اور کچھ غیر سیاسی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے اس وقت کانگریس یا ملک کی سیاست میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا اور صرف جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے معاملے تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی انھوں نے چمپارن میں چائے کے کاشتکاروں کی حمایت میں جو معرکے فتح کئے ان سے ہم میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ ہندوستان میں بھی اپنے طریقِ کار پر عمل کرنے کو تیار ہیں اور اس سے کامیابی کی امید بھی ہوتی ہے۔

لکھنؤ کانگریس کے بعد مسز سروجنی نائیڈو نے الہ آباد میں چند پرجوش تقریریں کیں۔ یہ تقریریں حب الوطنی کے جذبے سے لبریز تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان سے بہت متاثر ہوا کیونکہ میں بھی اس وقت خالص قوم پرست تھا اور کالج کے زمانے کے اشتراکی خیالات کب کے دب چکے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں روجر کیس منٹ نے اپنے مقدمے کے دوران میں جو حیرت انگیز تقریر کی اس سے پوری طرح یہ اندازہ ہوا کہ غلام قوم کے ایک فرد کے کیا احساسات ہونا چاہئیں پھر آئرلینڈ میں ایسٹر کے زمانے میں ایک بغاوت ہوئی اور ناکام رہی لیکن اس ناکامی میں بھی ایک خاص سبق اور ایک خاص کشش تھی کیونکہ حقیقی جرأت ہمیشہ ناکامیوں پر ہنسا کرتی ہے اور پکار پکار کر کہتی ہے کہ کسی قوم کی روح کو جسمانی قوت سے کچلا نہیں جا سکتا۔

اس وقت میرے یہی خیال تھے لیکن مطالعہ ابھی جاری تھا اس لئے میرے دماغ میں اشتراکی عقائد کی چنگاریاں کبھی کبھی روشن ہو جاتی تھیں۔ ابھی یہ باتیں بہت مبہم سی تھیں۔ ان کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی بلکہ یہ محض قیاسی اور نوع انسانی کے مفاد سے متعلق تھیں جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی میرا محبوب مصنف برٹرینڈ رسل تھا۔

ان عقائد کی وجہ سے میرے اندر ایک عجیب کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجھے وکالت کے پیشے سے نفرت ہوتی جاتی تھی لیکن بالفعل میں نے اسے جاری رکھا کیونکہ وکالت چھوڑ دینے کے بعد کوئی اور کام ہی نہ تھا۔ بہرحال یہ مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا ہے کہ قومی کام، خاصکر جارحانہ قسم کے قومی کام کے ساتھ جس کا میں حامی تھا، وکالت نبھ نہیں سکتی۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان میں آپس میں کوئی بیر ہے بلکہ اس لئے کہ دونوں کے لئے پورے وقت اور زور کی ضرورت ہوتی ہے۔ کلکتہ کے مشہور وکیل سر راس بہاری گھوش نہ جانے کیوں مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے وکالت میں کامیابی حاصل کرنے کے سلسلہ میں بہت سی نصیحتیں کیں اور خاص طور پر یہ مشورہ دیا کہ اپنی پسند کا کوئی قانونی موضوع لے کر اس پر ایک کتاب لکھ ڈالو۔ ان کا خیال تھا کہ ایک بتدی وکیل کی تربیت کا یہ سب سے بہتر طریقہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ میں اس کتاب کے لئے تمھیں کافی مواد دوں گا اور اس پر نظر ثانی بھی کر دوں گا لیکن میری وکالت کی کامیابی کے لئے ان کے یہ سب نیک مشورے بیکار تھے۔ کیونکہ میرے نزدیک اس سے بڑی کوئی حماقت نہ تھی، کہ میں اپنا وقت اور سارا زور قانونی کتابیں لکھنے پر صرف کروں۔

بڑھاپے میں سر راس بہاری گھوش بڑے بدمزاج اور چڑچڑے ہو گئے تھے اور ان کے شاگرد وکیل ان سے خائف رہتے تھے لیکن اس کے باوجود میں انھیں پسند کرتا تھا کیونکہ ان کی کمزوریوں میں بھی کچھ نہ کچھ بانکپن ضرور تھا۔ ایک مرتبہ والد اور

میں شملہ میں ان کے مہمان تھے۔ غالباً یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔ اسی زمانے میں مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم شائع ہوئی تھی۔ ایک دن انھوں نے چند دوستوں کی دعوت کی۔ ان میں مسٹر کھاپرڈے بھی تھے۔ یہ دونوں سیاسیات میں بالکل متضاد خیالات رکھتے تھے غرض جب کھانے کے بعد بحث شروع ہوئی تو ان دونوں میں خوب تناتنی ہوگئی۔ سر راس بہاری پکے اعتدال پسند تھے اور مسٹر کھاپرڈے اس زمانے میں تلک کے خاص پیرو سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں تو وہ ایسے نرم ہوگئے کہ اعتدال پسند بھی ان سے ہزار درجے بہتر تھے۔ مسٹر کھاپرڈے نے مسٹر گوکھلے پر (جنھیں انتقال کئے ابھی چند سال ہوئے تھے) اعتراض کرنا شروع کئے اور کہا کہ وہ تو انگریزوں کے مخبر تھے اور لندن میں خود میرے خلاف انھوں نے مخبری کی۔ سر راس بہاری بھلا یہ کب برداشت کر سکتے تھے۔ وہ بپھر گئے اور کہا کہ مسٹر گوکھلے بہترین شخص اور میرے خاص دوست تھے۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ اس پر مسٹر کھاپرڈے نے مسٹر سری نواس شاستری کی طرف رُخ بدل دیا۔ سر راس بہاری نے اگرچہ اسے بھی اچھے کانوں نہیں سنا لیکن کچھ زیادہ غصہ نہ ہوئے کیونکہ وہ مسٹر شاستری کے ایسے معتقد نہ تھے جیسے مسٹر گوکھلے کے۔ بلکہ انھوں نے اس کا اقرار کیا کہ جب تک مسٹر گوکھلے زندہ رہے وہ برابر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی مالی امداد کرتے رہے لیکن ان کے انتقال کے بعد سے اپنا چندہ بند کر دیا اس کے بعد مسٹر کھاپرڈے تلک کی تعریف کرنے لگے۔ انھوں نے فرمایا کہ تلک ایک عظیم الشان ہستی اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ تو پورے سادھو تھے "سادھو!" سر راس بہاری نے جھلّا کر فوراً جواب دیا "سادھوؤں سے مجھے نفرت ہے۔ مجھے ان سے کیا واسطہ!"

(۶)

میری شادی اور ہمالیہ کا سفر

میری شادی دہلی میں سنہ ۱۹۱۶ء میں ہوئی بسنت پنچمی کا دن تھا جو ہندوستان میں موسم بہار کی آمد آمد کی خبر دیتا ہے۔ اس سال کی گرمیوں میں چند مہینے کے لئے میں کشمیر گیا اپنے کنبہ کے لوگوں کو تو میں نے نیچے وادی میں چھوڑا اور خود اپنے ایک رشتے کے بھائی کے ساتھ کئی ہفتے پہاڑوں پہ گھومتا رہا اور لداخ والی سڑک پہ بہت دور تک گیا۔

میں نے ان تنگ اور سنسان وادیوں کو جو دنیا میں سب سے اونچی ہیں اور جن کا سلسلہ تبت کی سطح مرتفع تک چلا گیا ہے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا درہ زوجیلہ کی چوٹی پر سے ایک طرف ہرے بھرے پہاڑ نظر آتے تھے اور دوسری طرف بے برگ و گیاہ چوٹیاں ہم اوپر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اس تنگ وادی کے دونوں طرف سربفلک پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور برف کے چشمے ہمارے استقبال کے لئے بڑھ رہے تھے۔ ان کی سرد ہوا تیر کی طرح لگتی تھی۔ دن میں دھوپ بھی خاصی تیز ہوتی تھی اور فضا اتنی صاف شفاف تھی کہ ہمیں اکثر چیزوں کے فاصلے کے متعلق دھوکا ہو جاتا تھا یعنی دور کی چیزیں بھی بالکل نزدیک معلوم ہوتی تھیں ویرانی بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ آگے چل کر سبزے اور درختوں نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا صرف کھری پہاڑیاں رہ گئیں یا برف۔ البتہ کہیں کہیں پھول نظر آتے تھے جن کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا۔ مجھے فطرت کے ان ویران اور سنسان رمنوں میں عجیب لطف آتا تھا۔

سبزہ زار

میری رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا اور وجد کا عالم طاری تھا۔

اس سفر میں ایک عجیب ہیجان خیز واقعہ پیش آیا جب ہم دَرّہ زوجیلہ سے آگے بڑھے تو ایک مقام پر جسے شاید متایاں کہتے ہیں یہ معلوم ہوا کہ امرناتھ کا غار یہاں سے صرف آٹھ میل ہے۔ اگرچہ بیچ میں ایک برف پوش پہاڑ حائل تھا اور اسے عبور کرنا تھا لیکن ہم نے سوچا کہ آٹھ میل کی بھلا کیا حقیقت ہے۔ اپنے جوش اور ناتجربہ کاری کی بنا پر دل میں ٹھان لی کہ وہاں ضرور پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیئے ہم اپنے کیمپ سے (جو ۱۱½ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا) روانہ ہوگئے اور ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ اسی جگہ کا ایک چرواہا ہمارا رہبر تھا۔

ہماری کمر میں رسی بندھی تھی اور اس کی مدد سے ہم برف کی چٹانوں پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہماری مشکلیں بڑھنی شروع ہوئیں اور سانس لینا بھی دوبھر ہوگیا قلیوں پر اگرچہ کم بوجھ تھا لیکن ان میں سے بعض خون تھوکنے لگے۔ اب برف پڑنی شروع ہوئی اور پہاڑوں پر بری طرح پھسلنے لگے ہم تھک کر پست ہو چکے تھے اور ایک ایک قدم اٹھانے کے لئے خاص کوشش کرنا پڑتی تھی۔ پھر بھی ہم اپنی اس احمقانہ حرکت سے باز نہ آئے۔

ہم اپنے کیمپ سے صبح ۴ بجے روانہ ہوئے تھے (بارہ گھنٹے کی مسلسل چڑھائی کے بعد برف سے ڈھکا ہوا ایک وسیع میدان نظر پڑا۔ اس کا نظارہ بڑا دلکش تھا کیونکہ برف کی چوٹیاں اس کے چاروں طرف سر نکالے کھڑی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمالیہ کے سر پر دیوتوں کا تاج رکھا ہے یا دیوتاؤں کا گول گھر ہے، جس میں بیٹھ کر وہ دنیا کا تماشا دیکھتے ہیں) برف اور کُہر کی وجہ سے بہت جلد یہ منظر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوگیا معلوم نہیں کہ جس مقام پر ہم تھے اس کی بلندی کیا تھی؟ غالباً ۱۵ یا ۱۶ ہزار فٹ سے کم نہ ہوگی۔ کیونکہ امرناتھ کے غار سے ہم بہت

اونچائی پر تھے۔ اب ہمیں اس برف کے میدان کو جو آدھ میل کے قریب تھا عبور کرنے کے بعد دوسری طرف اتر کر امرناتھ پہنچنا تھا ہم نے خیال کیا کہ اب چڑھائی ختم ہو گئی اس لئے ہماری مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ گو ہم تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن کامیابی کی خوشی میں ہم نے سفر کی یہ دوسری منزل بھی شروع کر دی۔ اب بڑی نازک صورت پیش تھی کیونکہ قدم قدم پر کھڈ تھے اور تازہ برف سے بہت سی خطرے کی جگہیں ڈھک گئی تھیں۔ ایک دفعہ تو اس برف نے میری جان ہی لی ہوتی کیونکہ جیسے ہی میں نے اس پر قدم رکھا وہ دھنس گئی اور میں ایک خوفناک کھڈ میں جا پڑا۔ یہ اتنا زبردست اور گہرا تھا کہ اگر کوئی چیز اس کی تہ تک پہنچ جائے تو ہزارہا سال تک وہاں محفوظ رہ سکتی تھی۔ لیکن میری کمر میں رسی بندھی تھی۔ دوسرے میں کھڈ کی دیوار سے چمٹ گیا تھا غرض بڑی مشکل سے مجھے باہر کھینچا گیا۔ اگرچہ اس حادثے سے ہماری ہمتوں نے بہت کچھ جواب دے دیا تھا پھر بھی ہم اپنے ارادے پر قائم رہے اور آگے قدم بڑھایا۔ لیکن اب یہ کھڈ تعداد میں جتنے زیادہ بڑھتے جاتے تھے اتنی ہی ان کی وسعت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ہمارے پاس انھیں عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس لئے مجبوراً ہم تھکے ہارے اور مایوس واپس آئے اور امرناتھ کے غار کو دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

کشمیر کی ان اونچی اونچی وادیوں اور پہاڑیوں نے میرا دل کچھ ایسا موہ لیا کہ میں نے ایک بار پھر یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے بارہا کشمیر جانے کی تجویزیں کیں اور طرح طرح سے سفر کے منصوبے باندھے لیکن کوئی پورا نہ ہوا۔ ایک مرتبہ یہ سوچا کہ تبت کی حیرت انگیز جھیل مانسروور اور کیلاش پہاڑ کو جو اس کے نزدیک ہی ہے، دیکھنے چلیں گے۔ اس خیال ہی سے میں پھولا نہ سماتا تھا، لیکن آج ایسے کوئی اٹھارہ برس ہو گئے ہیں اور اب بھی میں مانسروور اور کیلاش سے اتنا

ہی دور ہوں جتنا پہلے تھا۔ بلکہ اس قدر اشتیاق کے باوجود کشمیر جانا بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ سیاسی اور قومی کاموں کے ہجوم میں گھرتا ہی چلا گیا۔ پہاڑوں پر چڑھنے یا سمندروں کو پار کرنے کے بجائے میری جہاں گردی کی خواہش مجھے جیل خانے لے آئی۔ لیکن اب بھی میں وہاں کے خیال سے اپنا دل بہلایا کرتا ہوں کیونکہ اس سے بھی ایک مسرت حاصل ہوتی ہے اور پھر اس کے سوا جیل خانے میں کام ہی کیا ہے۔ میں اس دن کا تصور کیا کرتا ہوں جب میں ہمالیہ کی سیر کرتا پھروں گا اور اسے پار کرکے اپنی محبوب جھیل اور پہاڑ پہ پہنچ جاؤں گا۔ مگر اس عرصے میں زندگی کی دھوپ کہیں سے کہیں پہنچی۔ جوانی ڈھل چکی ہے اور ابھی اس سے بدتر وقت آنے والا ہے اس لئے کبھی کبھی تو دل میں یہ مایوس کن خیال آنے لگتا ہے کہ کیلاش اور مانسرودر دیکھنا میری قسمت میں نہیں ہے۔ شاید بڑھاپا اس کی اجازت نہ دے گا لیکن چاہے منزلِ مقصود نظر آئے یا نہ آئے سفر میں بجائے خود ایک لذت ہے۔ والیٹر ڈے لامیر نے سچ کہا ہے۔

"یہ پہاڑ میرے دل میں سمائے ہوئے ہیں۔
ان کے خطوں میں شام کے شفق کی رنگینی ہے۔
اور اب تک میری روح میری آنکھوں میں کھلی ہوئی
تمہاری پرسکون برف کی تمنا میں تڑپ رہی ہے۔"

(۷)

سیاسیات میں گاندھی جی کی آمد

ستیاگرہ اور امرتسر

جنگ عظیم کے خاتمے کے وقت ہندوستان میں ایک خاص بے چینی پائی جاتی تھی اگرچہ بہت دبی ہوئی تھی صنعتوں کو کافی فروغ ہو چکا تھا اور سرمایہ داروں کو دولت اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ چوٹی کے مٹھی بھر آدمی اس جنگ کی بدولت خوب پھلے پھولے تھے۔ قوت حاصل کرنے کی دھن میں ان کی ہوس بڑھ گئی تھی اور وہ اپنے منافع کو کسی کام میں لگانے اور اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے موقعے ڈھونڈھ رہے تھے۔ لیکن ملک کی اکثریت اتنی خوش نصیب نہ تھی۔ وہ تو اس بوجھ کے ہلکا ہونے کی آس لگائے بیٹھی تھی جو اسے کچلے ڈالتا تھا۔ اوسط طبقے میں ہر جگہ یہ امید پائی جاتی تھی کہ بہت کچھ آئینی تبدیلیاں ہونے والی ہیں جس سے اپنے ملک کی حکومت کی باگ ڈور بڑی حد تک خود ہمارے ہاتھوں میں آجائے گی۔ گویا ہمارے سامنے ترقی کی نئی نئی راہیں کھل جائیں گی اور اس طرح ہمارے دن پھر جائیں گے۔ سیاسی جدوجہد نہایت پرامن اور آئینی طریقے پر برابر بڑھ رہی تھی اور لوگ شوق کے ساتھ حکومت خود اختیاری کا ذکر کرنے لگے تھے۔ اس بے چینی کے کچھ نہ کچھ آثار عوام میں اور خاصکر کسانوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ پنجاب کے دیہات میں جبریہ بھرتی کی تلخیوں کو یاد کرکے اب تک لوگوں کے دل بے چین ہو جاتے تھے۔ حکومت نے

"کوماگاٹا مارو" وغیرہ کے لوگوں کو سازشی مقدموں کے ذریعے جس بے دردی سے کچلا تھا اس سے عام طور پر ناراضی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو سپاہی محاذِ جنگ سے واپس آئے تھے وہ پہلے کی طرح کل کے آدمی نہیں رہے تھے۔ ذہنی اعتبار سے ان میں کافی تبدیلی ہو گئی تھی اس لئے ان میں بھی بے اطمینانی کے آثار موجود تھے۔

اتحادیوں نے شرائطِ صلح میں ترکوں کے ساتھ بہت ذلت کا برتاؤ کیا تھا۔ اور خلافت کا تو قلع قمع کر دیا۔ مسلمانوں میں اس پر غم و غصہ کا اظہار کیا جا رہا تھا، اور ہیجان بڑھ رہا تھا۔ ابھی صلحنامہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے لیکن آثار برے نظر آتے تھے۔ بہرحال مسلمان اگرچہ بہت برہم تھے لیکن ہوا کا رُخ دیکھ رہے تھے۔

اس وقت سارے ہندوستان پر شدید انتظار اور امید و بیم کی کیفیت طاری تھی۔ لوگوں کو حکومت سے بڑی امیدیں تھیں لیکن ان میں شک اور تشویش کی جھلک موجود تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب رولٹ بل شائع ہوا۔ اس کی رو سے حکومت کو اندھا دھند مقدمے چلانے اور گرفتاریاں کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اور قانون میں عام طور پر جو احتیاط ہوتی ہے اور جو ضابطے برتے جاتے ہیں اس بل میں ان کا نام تک نہ تھا۔ اس کے شائع ہوتے ہی سارے ہندوستان میں غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حتیٰ کہ اعتدال پسند جماعت بھی اس تحریک میں شریک ہو گئی اور بل کی مخالفت کرنے میں اس نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سچ پوچھئے تو ملک کے گوشہ گوشہ سے ہر خیال کے ہندوستانیوں نے عام طور پر اس کی مخالفت کی۔ پھر بھی اربابِ حکومت نے اسے منظور کر لیا اور یہ قانون بن گیا۔ البتہ اتنی عنایت کی گئی کہ اس کی میعاد صرف تین سال مقرر کی گئی۔

آج پندرہ سال بعد اس بل پر ایک نظر ڈالئے اور اس کی وجہ سے جو طوفان اٹھا تھا اس پر ذرا غور کیجئے تو بہت کچھ سبق مل سکتا ہے۔ یہ قانون نافذ

تو ہو گیا لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے اس کی میعاد کے تین برس میں ایک مرتبہ
بھی اس سے کام نہیں لیا گیا حالانکہ تین سال کا یہ زمانہ امن اور سکون سے نہیں
گذرا بلکہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سب سے زیادہ شورش کا زمانہ تھا غرض حکومت
برطانیہ نے عام مخالفت کے باوجود ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جس سے اس نے
کبھی کوئی کام نہ لیا اور خواہ مخواہ چھیڑ کر شورش پیدا کی۔ اگر یہ خیال ہو تو بے جا نہیں کہ
شاید اس قانون کا مقصد ہی ہنگامہ پیدا کرنا تھا۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ آج پندرہ برس بعد یہاں ایسے متعدد قانون جو رولٹ
بل سے کہیں زیادہ سخت ہیں نافذ ہیں اور ان پر آئے دن عمل بھی ہوتا رہتا ہے اگر
موجودہ قوانین اور ہنگامی فرمانوں سے جن کے زیر سایہ ہم برطانی حکومت کی برکتوں
کا لطف اٹھا رہے ہیں، رولٹ بل کا مقابلہ کیا جائے تو وہ آزادی کا پروانہ معلوم ہوگا
ہاں ایک فرق ضرور ہے اس وقت ملک کے نظم و نسق میں ہمارا زیادہ ہاتھ نہ تھا۔
لیکن اب ۱۹۱۹ء کے بعد ہمیں نام نہاد حکومت خود اختیاری کی بہت بڑی قسط
جسے مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کہتے ہیں مل چکی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی بڑی
ایک اور قسط ملنے والی ہے۔ یعنی ہم ترقی کر رہے ہیں۔

گاندھی جی اوائل ۱۹۱۹ء میں بہت بیمار پڑ گئے۔ انھوں نے بستر علالت ہی
پر سے وائسرائے سے درخواست کی کہ وہ رولٹ بل پر اپنی منظوری صادر نہ فرمائیں
لیکن حسب معمول یہ درخواست بھی ٹھکرا دی گئی اور گاندھی جی نے ایک حد تک
اپنی مرضی کے خلاف ملک کی عام تحریک کی رہبری پہلے پہل اختیار کی انھوں نے
ستیا گرہ سبھا کی بنیاد ڈالی۔ اس کے ممبروں کو یہ عہد کرنا ہوتا تھا کہ اگر رولٹ
ایکٹ ہم پر نافذ ہوا تو ہم اس کی خلاف ورزی کریں گے۔ اس کے علاوہ ان قوانین کو
بھی جنھیں سبھا وقتاً فوقتاً قابل اعتراض قرار دے گی تسلیم نہ کریں گے۔ دوسرے

لفظوں میں گویا انھیں کھلم کھلا اور جان بوجھ کر قید گوارا کر لی تھی۔

جب پہلی مرتبہ اخباروں میں یہ تجویز میری نظر سے گذری تو اسے دیکھتے ہی جیسے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ بالآخر ہماری مشکل کا ایک حل نکل آیا یعنی ایک ایسا طریقۂ عمل معلوم ہو گیا جو سیدھا اور سچا بھی ہے اور ممکن ہے موثر بھی ثابت ہو میں جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ فوراً ستیا گرہ سبھا میں شامل ہو جاؤں مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ قانون شکنی کے نتیجے میں جیل جانا ہو گا۔ یا اگر آیا بھی تو میں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ لیکن یکایک میرا تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا میں سمجھتا تھا کیونکہ والد پر اس نئی تحریک کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ نئی نئی تجویزوں کی رو میں بہنے کے عادی نہ تھے بلکہ جب کوئی نیا قدم اٹھاتے تھے تو ہمیشہ اس کے نتائج کو اچھی طرح سوچ سمجھ لیتے تھے چنانچہ جب انھوں نے ستیا گرہ سبھا اور اس کے پروگرام پر غور کیا تو انھیں یہ چیز بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ فرماتے تھے کہ آخر چند آدمیوں کے جیل چلے جانے سے کیا فائدہ ہو گا اور حکومت پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اصولی مخالفت کے علاوہ وہ دراصل ذاتی مصلحتوں سے زیادہ متاثر تھے۔ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ میں جیل جاؤں۔ جیل میں جانے کا دستور ابھی تک عام نہیں تھا اس لئے قید کے خیال سے ہی لوگوں کو وحشت ہوتی تھی۔ والد کو اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت تھی۔ وہ اپنے جذبات کو ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن اس ضبط کے پردے میں محبت کے خزانے چھپے ہوئے تھے۔

ایک مدت تک وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے۔ چونکہ ہم دونوں کو اس کا احساس تھا کہ ایسے اہم مسائل درپیش ہیں جن سے ہماری زندگیوں میں ایک انقلاب ہو جائیگا اس لئے جہاں تک ہو سکتا تھا ہم ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ ان کی پریشانی کھلی ہوئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اگر میرے بس کی بات ہو تو میں اسے ضرور رفع کر دوں

لیکن میں دل میں ٹھان چکا تھا کہ ستیاگرہ کا راستہ ضرور اختیار کروں گا۔ غرض ہم دونوں بڑی مصیبت میں تھے۔ راتوں کو میں تنہا ٹہلا کرتا تھا اور اسی ادھیڑبن میں رہتا کہ اس مشکل کے حل ہونے کی کوئی صورت نکلے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ والد نے فرش پر سونا بھی شروع کردیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جیل خانے میں مجھے زمین ہی پر سونا پڑے گا اس لئے وہ اس کی تکلیف کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔

والد کی دعوت پر گاندھی جی الٰہ آباد تشریف لائے۔ ان دونوں میں گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں لیکن میں وہاں موجود نہ ہوتا تھا۔ اس گفتگو کا یہ نتیجہ ہوا کہ گاندھی جی نے مجھے پیش قدمی کرنے سے منع کر دیا اور نصیحت کی کہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس سے تمہارے والد پریشان ہوں۔ مجھے ان کی یہ بات کسی طرح پسند نہ آئی لیکن اس سے پیشتر کہ میں کچھ طے کروں ہندوستان میں چند واقعات ایسے پیش آئے جن سے تمام صورت حال ہی بدل گئی اور ستیاگرہ سبھا کو اپنی سرگرمیاں بند کرنا پڑیں۔

ستیاگرہ کا دن منایا گیا۔ سارے ملک میں مکمل ہڑتال ہوئی اور تمام کاروبار بند رہا دہلی اور امرتسر میں پولیس اور فوج نے عوام پر گولی چلائی اور بہت سے بے گناہ ہلاک ہوئے امرتسر اور احمد آباد میں بلوہ ہوا۔ جلیانوالے باغ میں قتل عام ہوا پھر پنجاب کا صوبہ باقی ہندوستان سے اس طرح جدا کر دیا گیا جیسے اس پر ایک بھاری پردہ پڑا ہو اور باہر والوں کو اندر کی کوئی چیز نظر نہ آئے۔ وہاں سے کوئی خبر بھی نہ آتی تھی۔ نہ وہاں کے لوگ باہر آسکتے تھے اور نہ باہر والوں کو وہاں جانے کی اجازت تھی۔

اِکا دُکا کوئی شخص جو اس آگ سے نکل بھاگتا تھا وہ اتنا بدحواس ہوتا تھا کہ وہاں کا کوئی حال بیان نہ کرسکتا تھا۔ ہم باہر والے بیکسی اور لاچاری میں ذرا ذرا سی خبر کا آسرا لگائے بیٹھے رہتے تھے اور نفرت ہمارے دلوں میں گھر کر رہی تھی ہم میں سے بعض لوگ اس پر تلے ہوئے تھے کہ کھلم کھلا پنجاب کے مصیبت زدہ علاقے میں جائیں،

اور مارشل لا کے ضابطوں کی خلاف ورزی کریں لیکن ہمیں برابر روکا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں تحقیقات کرنے اور مظلوموں کو امداد پہنچانے کے لئے ایک بہت بڑا ادارہ قائم ہوا۔

حکومت نے خاص خاص علاقوں سے مارشل لا ہٹا لیا اور باہر والوں کو وہاں جانے کی اجازت ہوئی تو بڑے بڑے کانگریسی لیڈر اور دوسرے کارکن چاروں طرف سے پنجاب پہنچ گئے اور انھوں نے امداد اور تحقیقات کے کام کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ امدادی کام تو بیشتر پنڈت مدن موہن جی مالویہ اور سوامی شردھانند جی کی رہبری میں ہوا اور تحقیقاتی کام زیادہ تر میرے والد اور مسٹر سی آر داس نے انجام دیا۔ گاندھی جی اس کام میں خاص طور پر دلچسپی لے رہے تھے اور اکثر کام کرنے والوں کو مشورے دیتے تھے۔ دیش بندھو داس نے امرتسر کے علاقے کی تحقیقات اپنے ذمے لی اور میں ان کے ساتھ کیا گیا تاکہ ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ان کے ساتھ اور ان کی ماتحتی میں کام کیا اور اس طرح مجھے جو تجربہ حاصل ہوا میں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ ان کی خوبیوں کو دیکھ کر میرے دل میں ان کی عزت بہت بڑھ گئی جلیانوالا باغ اور اس بدنصیب گلی کے متعلق جہاں انسانوں کو پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ زیادہ تر شہادتیں ہماری موجودگی میں گزریں۔ یہ شہادتیں بعد کو کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں شائع ہو گئیں۔ اس سلسلے میں ہم بارہا جلیانوالا باغ بھی گئے اور اس کے چپے چپے کا نہایت غور سے جائزہ لیا۔

جہاں تک مجھے خیال ہے ایک مرتبہ مسٹر ایڈورڈ تھامسن نے جنرل ڈائر کی حمایت میں ایک عجیب توجیہ کی تھی۔ یعنی جنرل ڈائر کو یہ گمان تھا کہ باغ میں نکاس کے دوسرے راستے بھی ہیں اسی لئے وہ اتنی دیر تک گولی چلاتے رہے۔ مانا کہ جنرل ڈائر کو یہ غلط فہمی تھی یا واقعی وہاں دوسرے دروازے موجود بھی تھے لیکن اس سے ان کی ذمہ داری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بہرحال ان کا یہ خیال کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کوئی

شخص اگر اس بلند جگہ پر کھڑا ہو جہاں وہ کھڑے تھے تو باغ کی ساری زمین اس کی نظر کے سامنے ہوگی اور اسے یہ صاف دکھائی دے گا کہ وہ چاروں طرف سے کئی کئی منزل کے مکانوں سے گھرا ہوا ہے۔ صرف ایک جگہ کوئی سو فٹ کے قریب مکان نہیں ہیں بلکہ پانچ فٹ کی ایک نیچی سی دیوار بنی ہے۔ ایک تو گولیوں کی قاتلانہ بوچھار کشتوں کے پشتے لگا رہی تھی۔ دوسرے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا اس لئے ہزاروں آدمی اس دیوار پر ٹوٹ پڑے اور اسے پھاندنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر مشین گن کا رُخ اسی طرف کر دیا گیا تاکہ لوگ زندہ نہ بچنے پائیں۔ یہ بات ہماری فراہم کردہ شہادتوں سے اور اس دیوار پر گولی کے بے شمار نشانوں سے ثابت ہوتی ہے اس کا ثبوت بھی موجود ہے کہ جب سارا قصہ ختم ہو گیا تو دیوار کے دونوں طرف مُردوں اور زخمیوں کے ڈھیر لگے تھے۔

۱۹۱۹ء کے آخر میں مجھے رات کی گاڑی سے امرتسر سے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں جس ڈبے میں داخل ہوا وہ بالکل بھرا ہوا تھا۔ اوپر کے ایک گدّے کے سوا سب پر مسافر سو رہے تھے۔ چنانچہ میں اس خالی گدّے پر لیٹ گیا۔ صبح اُٹھ کر معلوم ہوا کہ میرے سب ہم سفر فوجی افسر ہیں۔ وہ زور زور سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے جو خواہ مخواہ میرے کانوں میں پڑتی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص بڑے فاتحانہ انداز سے گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جلیانوالا باغ کے سورما جنرل ڈائر یہی ہیں اور اپنے امرتسر کے مشاہدات بیان کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی دوران میں فرمایا کہ اس وقت سارا سرکش شہر میرے رحم و کرم پر تھا اگر میں چاہتا تو اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیتا لیکن میں نے رحم کھا کر چھوڑ دیا۔ وہ لاہور میں ہنٹر کمیٹی کے روبرو اپنی شہادت دے کر واپس آ رہے تھے۔ مجھے ان کی گفتگو سن کر اور ان کی یہ شقاوت دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔ وہ دہلی کی اسٹیشن پر گلابی دھاری کا

پاجامہ اور ڈریسنگ گون پہنے ہوئے اتر گئے۔

پنجاب کی اس تحقیقات کے دوران میں گاندھی جی کو میں نے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا۔ اکثر ہماری کمیٹی کو ان کی تجویزیں عجیب و غریب معلوم ہوتی تھیں شروع میں وہ انھیں پسند بھی نہ کرتی تھی۔ لیکن گاندھی جی ہمیشہ اس طرح بحث کرتے اور ایسی ایسی دلیلیں پیش کرتے کہ انھیں تسلیم کرا کے چھوڑتے پھر بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہو جاتا کہ ان کا مشورہ واقعی نہایت معقول تھا۔ اس طرح ان کی سیاسی بصیرت پر مجھے اعتماد ہو گیا۔

والد پر پنجاب کے حادثہ اور اس کی تحقیقات کا بہت گہرا اثر پڑا۔ ان چیزوں نے جیسے ان کے قانونی اور آئینی خیالات کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اور ان کا دماغ رفتہ رفتہ اس انقلاب کے لئے تیار ہو گیا جو ایک سال بعد ان کی زندگی میں ہونے والا تھا۔ وہ اعتدال پسندی کے پرانے عقیدے کو تو کب کا ترک کر چکے تھے سب سے بڑے اعتدال پسند اخبار لیڈر (الہ آباد) سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے اوائل ۱۹۱۹ء میں الہ آباد ہی سے ایک دوسرا روزنامہ انڈیپنڈنٹ کے نام سے نکالا۔ اس اخبار کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن شروع ہی سے اس کا انتظام بہت خراب تھا اور اس کی ذمہ داری کسی نہ کسی حد تک ڈائرکٹر، ایڈیٹر، منیجر اور ان کے عملے سب پر عائد ہوتی تھی۔ میں بھی اس کا ڈائرکٹر تھا حالانکہ مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس کے جھگڑے قضیوں سے میری رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ بہرحال اس کے جاری ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد مجھے اور والد دونوں کو پنجاب جانا پڑا ہماری اس طویل غیر موجودگی میں اخبار کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی اور وہ مالی مشکلات میں پھنس گیا۔ اس مصیبت سے پھر وہ کبھی نہ نکل سکا۔ اگرچہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں اس نے کچھ سنبھالا لیا لیکن ہمارے جیل جانے کے بعد تو رہا سہا شیرازہ بھی بکھر گیا اور ۱۹۲۳ء میں

وہ بالکل بند ہو گیا۔ اخبار کی ملکیت کے اس تلخ تجربے نے میرے ایسے اوسان خطا کئے کہ اس کے بعد پھر کبھی میں نے کسی اخبار کا ڈائرکٹر بننا منظور نہ کیا۔ اس کے علاوہ میں یہ بار کیسے اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یا تو میں جیل میں رہتا تھا یا اگر باہر ہوتا تو اور کام کیا کم تھے۔

۱۹۱۹ء کے آخری ہفتہ میں والد نے امرتسر کانگریس کی صدارت فرمائی۔ انھوں نے اعتدال پسند یا لبرل لیڈروں کے نام (جنھوں نے اب یہ لقب اختیار کر لیا تھا) ایک دردناک اپیل شائع کی اور ان سے درخواست کی کہ مارشل لا کی تباہ کاریوں نے جو نئی صورت حالات پیدا کر دی ہے اس کا لحاظ کر کے آپ اس اجلاس میں ضرور شریک ہوں۔ اس اپیل میں والد نے لکھا تھا کہ پنجاب کا دل جو زخموں سے چور چور ہے آپ کو پکار رہا ہے۔ کیا آپ اس کی آواز پر لبیک نہ کہیں گے؟ لیکن انھوں نے والد کے حسب منشا جواب نہیں دیا اور شرکت سے انکار کر دیا۔ ان کی امیدیں تو ان نئی اصلاحات کی طرف لگی ہوئی تھیں جو مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ کی سفارشوں کی بنا پر نافذ ہونے والی تھیں۔ اس انکار سے والد کو بہت صدمہ ہوا اور ان کے اور لبرل جماعت کے درمیان جو خلیج حائل ہو چکی تھی وہ زیادہ وسیع ہو گئی۔

امرتسر کانگریس گویا پہلی گاندھی کانگریس تھی۔ لوکمانیہ تلک بھی اس میں شریک ہوئے اور اس کی کارروائی میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مندوبین کی اکثریت کی، اور ان سے زیادہ اس مجمع کی، جو باہر موجود تھا۔ رہنمائی کے لئے گاندھی جی پر نظر پڑتی تھی۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی مطلع پر "مہاتما گاندھی کی جے" کا نعرہ چھا رہا تھا۔ علی برادران اسی زمانے میں نظربندی سے رہا ہوئے اور فوراً کانگریس کی شرکت کے لئے امرتسر پہنچ گئے۔ اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت اور نئی حیثیت اختیار کرنا شروع کر دی۔

مولانا محمد علی اس کے بعد ہی خلافت کا وفد لیکر یورپ چلے گئے۔ ہندوستان

میں خلافت کمیٹی پر روز بروز گاندھی جی کا اثر بڑھتا گیا اور اس نے ان کے پُرامن ترک موالات کے اصولوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ مجھے خلافت کے رہنماؤں اور علماء کا ایک ابتدائی جلسہ یاد ہے جو دہلی میں جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا۔ خلافت کا ایک وفد وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہونے والا تھا اور گاندھی جی بھی اس میں شریک ہونے کو تھے۔ لیکن گاندھی جی کے دہلی پہنچنے سے پہلے مجوزہ ایڈریس کی ایک نقل حسب رواج وائسرائے کو بھیج دی گئی۔ جب گاندھی جی نے آکر مسودہ پڑھا تو اسے سخت ناپسند کیا اور یہاں تک کہا کہ اگر اس میں معقول ترمیم نہ کی گئی تو میں وفد میں شریک نہ ہوں گا۔ انکا اعتراض یہ تھا کہ یہ ایڈریس نہایت مبہم ہے اور اس میں محض لفاظی سے کام لیا گیا ہے اور مسلمانوں کے کم سے کم مطالبوں کو واضح طور پر پیش نہیں کیا ہے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ یہ نہ وائسرائے کے ساتھ انصاف ہے نہ برطانوی حکومت کے ساتھ، نہ قوم کے ساتھ اور نہ خود اپنے ساتھ۔ وہ کہتے تھے کہ آپ کو ایسے لمبے چوڑے مطالبے پیش نہ کرنا چاہئیں جن پر زور دینے کے لئے آپ تیار نہ ہوں بلکہ ایسے الفاظ میں جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو، وہ مطالبے صاف صاف پیش کر دینا چاہئیں جن سے کم پر آپ کسی طرح راضی نہ ہوں اور پھر مرتے دم تک ان کی حمایت کرنا چاہیئے۔ اگر محض باتیں بنانا مقصود نہیں ہے اور سچ مچ آپ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو صرف یہی باعزت اور سیدھا سچا راستہ ہے۔

ہندوستان کے سیاسی اور غیر سیاسی حلقوں میں یہ خیال بالکل نیا تھا ہم لوگ تو مبالغے اور لفاظی کے عادی تھے اور ہمیشہ ہمارے دماغ میں سودا چکانے کا خیال رہتا تھا۔ بہرحال گاندھی جی اپنے خیال پر جمے رہے اور وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری کو ایک خط لکھا کہ مجوزہ ایڈریس مبہم اور ناقص ہے اور اس کے ساتھ چند نئے پیراگراف اضافہ کرنے کے لئے بھیجے جن میں کم سے کم مطالبے درج کر دئے تھے۔ وائسرائے نے بہت دلچسپ جواب دیا۔ انھوں نے یہ نئے پیراگراف شامل کرنے سے انکار

کر دیا اور یہ کہا کہ اصل ایڈریس ہی میری رائے میں مناسب ہے۔ گاندھی جی کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اس مراسلت کے بعد مجھ پر اور خلافت کمیٹی پر اب کوئی ذمہ داری نہیں رہی اس لیئے وہ وفد میں شریک ہو گئے۔

یہ ظاہر ہے کہ حکومت خلافت کمیٹی کے مطالبات پورے کرنے والی نہ تھی اور لڑائی یقینی تھی اس لیئے علماء سے ترک موالات اور خصوصاً عدم تشدد پر طویل طویل بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ گاندھی جی نے ان سے یہ کہا کہ میں آپ کی خدمت کے لیئے دل وجان سے حاضر ہوں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ عدم تشدد اور اس کے تمام لوازم کو پوری طرح سے تسلیم کریں۔ یہ نہ ہو کہ دل میں شبہ باقی رہے اور آگے چلکر اس اصول کی پابندی میں ڈھیل ڈال دی جائے یا ٹال مٹول سے کام لیا جائے۔

عدم تشدد کا اصول علماء کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتا تھا۔ بہرحال وہ اس پر رضامند ہو گئے، لیکن یہ واضح کر دیا کہ ہم اسے عقیدے کی حیثیت سے نہیں بلکہ سیاسی مصلحت کے طور پر اختیار کرتے ہیں، کیونکہ ہمارا مذہب حق کی حمایت میں تشدد کی اجازت دیتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں سیاسی تحریک اور خلافت کی تحریک نے ساتھ ساتھ قوت پکڑی۔ دونوں ایک ہی راستے پر چلنے لگیں۔ آخر جب کانگریس نے گاندھی جی کے پرامن ترک موالات کا اصول تسلیم کر لیا تو دونوں بالکل مل گئیں۔ خلافت کمیٹی پہلے ہی یہ اصول تسلیم کر چکی تھی اور یکم اگست اس لڑائی کے شروع کرنے کے لیئے مقرر کی گئی تھی۔

سال کے آغاز میں اس طریقہ کار پر غور کرنے کے لیئے مسلمانوں کا ایک جلسہ (شاید یہ مسلم لیگ کی کونسل کا جلسہ تھا) الہ آباد میں سید رضا علی کے مکان پر منعقد ہوا۔ مولانا محمد علی ابھی یورپ سے واپس نہ آئے تھے البتہ مولانا شوکت علی موجود تھے۔ مجھے اس جلسہ کا منظر آج تک یاد ہے کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے انتہائی مایوسی ہوئی

تھی۔ مولانا شوکت علی تو واقعی سرتاپا جوش تھے لیکن ان کے سوا باقی سب لوگ بہت افسردہ اور گھبرائے ہوئے سے تھے۔ بظاہر وہ کوئی سخت کارروائی کرنے کو تیار نہ تھے لیکن مخالفت کرنے کی بھی ان میں ہمت نہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کیا یہی لوگ ایک انقلابی تحریک کی رہنمائی کریں گے اور سلطنت برطانیہ کا مقابلہ کریں گے؟ گاندھی جی نے انکے سامنے تقریر کی معلوم ہوتا تھا کہ اس تقریر کو سن کر وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے خاص حکیمانہ انداز میں تقریر کی۔ ان کی گفتگو میں کافی انکسار لیکن ہیرے کی سی صفائی اور سختی تھی۔ ان کا لہجہ خوشگوار اور نرم تھا لیکن انتہائی صداقت اور استقلال کو ظاہر کرتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نرمی اور گہرائی تھی لیکن ان سے طوفان خیز سرگرمی اور عزم کے شرارے نکل رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا۔ ایک زبردست دشمن سے بہت بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ اگر آپ اس جنگ میں شریک ہونا چاہتے تو آپ کو ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو جانا چاہیئے اور اپنے آپ کو عدم تشدد اور انضباط کا نہایت سختی سے خوگر کرنا چاہیئے۔ جب جنگ چھڑتی ہے تو فوجی قانون نافذ ہوتا ہے اس لئے اگر ہمیں فتح حاصل کرنا ہے تو ہماری پرامن جنگ میں بھی مختار کل کی حکومت اور فوجی قانون کا دور دورہ ہو گا۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں مجھے نکال باہر کریں مجھے سزا دیں یا میرا سر اڑا دیں۔ لیکن جب تک آپ مجھے اپنا سپہ سالار تسلیم کریں آپ کو میری شرائط ماننا پڑیں گی۔ یعنی مختار کل کے حکم کی تعمیل اور فوجی ضابطے کی پابندی کرنا پڑے گی۔ مگر یہ حکومت آپکی خوشنودی اور رضامندی پر منحصر ہوگی اور اس میں آپ کے اشتراک عمل کی ضرورت ہو گی اس لئے جس وقت آپ کا مجھ سے جی بھر جائے مجھے نکال دیجئے گا۔ کچل ڈالیے گا یقین کیجئے کہ میں شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ لاؤں گا۔

غرضکہ اسی قسم کی کچھ باتیں گاندھی جی نے کیں۔ ان فوجی اصطلاحوں سے

اور کہنے والے کے اٹل جوش صداقت سے اکثر سامعین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن مولانا شوکت علی وہاں موجود تھے تاکہ قدم نہ اکھڑنے دیں۔ چنانچہ جب رائے شماری کا وقت آیا تو اکثریت نے مشرا حضوری میں چپ چاپ اس تجویز، یعنی جنگ کے حق میں رائے دے دی۔

جلسے سے واپس ہوتے وقت میں نے گاندھی جی سے پوچھا کہ کیا جنگ اسی طرح شروع کی جاتی ہے۔ مجھے تو جوش و خروش کی توقع تھی، ولولہ انگیز تقریریں سننے کی امید تھی۔ میں آنکھوں سے شعلے نکلتے دیکھنا چاہتا تھا، لیکن اس کے خلاف وہاں تو ادھیڑ عمر کے ضعیف القلب حضرات کا بے ضرر اجتماع تھا۔ مگر انھی لوگوں کو رائے عامہ سے مجبور ہو کر اعلان جنگ کرنا پڑا۔ دراصل ان میں سے بہت تھوڑے حضرات بعد کو میدان میں آئے۔ بہتوں نے سرکاری عہدوں کی پناہ لے لی۔ مسلم لیگ نہ اس وقت مسلمانوں کی رائے عامہ کی کوئی معقول نمائندگی کرتی تھی اور نہ اب کرتی ہے۔ البتہ سنہ ۱۹۲۰ء کی خلافت کمیٹی زیادہ نمائندہ اور باثر جماعت تھی اور یہی جماعت پورے جوش و خروش کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئی۔

عدم تعاون کے افتتاح کے لیے مہاتما جی نے یکم اگست مقرر کی تھی۔ اگرچہ کانگریس نے ابھی باضابطہ اس تجویز کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسی روز لوکمانیہ تلک کا بمبئی میں انتقال ہو گیا اور اسی دن صبح گاندھی جی سندھ کا دورہ کرنے کے بعد بمبئی پہنچے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا اور اس عظیم الشان مظاہرے میں شریک ہوا جس میں اس قدر زبردست مجمع تھا کہ معلوم ہوتا تھا بمبئی کی لاکھوں کی آبادی اپنے محبوب رہنما سے اظہار عقیدت کرنے کے لیے امڈ آئی ہے۔



بال گنگا دھر تلک

(۸)

میرا مسوری سے شہر بدر ہونا اور اس کے نتیجے

شروع میں میرے سیاسی خیالات بھی وہی تھے جو شہری اوسط طبقے کے ہوتے ہیں کیونکہ میں اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس زمانے میں (بلکہ بڑی حد تک اب بھی) متوسط طبقہ ملکی سیاسیات پر حاوی تھا۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں اسی طبقے کی نمائندگی اور مختلف صورتوں سے انہی کی بہتری کی کوشش کرتے تھے۔ اعتدال پسند تو خاص کر متوسط طبقے کے اونچے درجے کے ان مٹھی بھر لوگوں کے نمائندے تھے جو برطانوی دور میں پھلے پھولے ہیں۔ اس لئے وہ ایسی فوری تبدیلی گوارا نہیں کر سکتے تھے جس سے انکی موجودہ حیثیت اور ذاتی مفاد خطرے میں پڑ جائے۔ برطانوی حکومت اور زمینداروں کے اعلیٰ طبقے سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ رہے انتہا پسند تو وہ بھی متوسط طبقے کے نیچے درجے کے لوگوں کے نمائندے تھے۔ کارخانے کے مزدوروں میں جن کی تعداد جنگ کی وجہ سے کافی بڑھ گئی تھی بعض بعض جگہ محض مقامی طور پر تنظیم تھی اور ان کا اثر بہت ہی کم تھا۔ کسان بیچارے ناسمجھ، فلاکت زدہ اور مصیبتوں کا شکار تھے، وہ اپنی بدنصیبی پر صابر و شاکر رہتے تھے اور حکومت۔ زمیندار، مہاجن، ادنیٰ عہدے دار۔ پولیس۔ وکیل مذہبی پیشوا غرض ہر ایک انھیں کچلتا اور لوٹتا تھا۔

کوئی اخبار بین شخص مشکل سے اس کا تصور کر سکتا تھا کہ ہندوستان میں لاکھوں کسان اور مزدور بھی بستے ہیں یا کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ اینگلو انڈین اخبارات تو اعلیٰ افسروں کے مشاغل کی خبروں سے بھرے ہوتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے شہروں

اور پہاڑوں کے بسنے والے انگریزوں کی تفریحوں کا ان کی دعوتوں، ناچ رنگ کی محفلوں اور کھیل تماشوں کا حال خوب تفصیل سے لکھا جاتا تھا ہندوستانی سیاسیات کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے کوئی تذکرہ نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ کانگریس کے اجلاسوں کا حال بھی کسی پچھلے صفحے پر چند سطروں میں لکھ کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ دراصل اس قسم کی خبروں کو وہ کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ ہاں اگر کوئی ہندوستانی خواہ معروف ہو یا غیر معروف کانگریس کا مذاق اڑاتا تھا یا اس پر نکتہ چینی کرتا تھا تو اسے خوب بڑھا چڑھا کر لکھتے تھے۔ کبھی کبھی کسی ہڑتال کا مختصر سا ذکر ہوتا تھا اور دیہی علاقے صرف اس وقت نمایاں ہوتے تھے جب وہاں کوئی بلوہ ہو جاتا تھا۔

ہندوستانی اخبار اپنے اینگلو انڈین معاصرین کی نقل کرتے تھے۔ لیکن قومی تحریکوں کو ذرا زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ویسے انھیں بھی چھوٹے بڑے عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر اور ان کے تبادلے اور ترقیوں سے دلچسپی تھی جب کبھی کسی افسر کا تبادلہ ہوتا تو الوداعی پارٹی کا ہونا لازمی تھا اور ایسے موقعوں پر ہمارے اخبارات یہ ضرور لکھتے کہ "بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا گیا"۔ اگر کسی زرعی علاقے کا نیا بندوبست ہوتا جس سے ہمیشہ حکومت کی مالگزاری میں اضافہ ہوا کرتا ہے تو یہ اخبار ضرور کچھ شور مچاتے کیونکہ اس کا اثر زمیندار کی جیب پر پڑتا تھا۔ غرض اس مرقع میں غریب کسان کہیں نظر نہ آتا۔ عموماً ان اخباروں کے مالک زمیندار یا کارخانہ دار ہوتے تھے اس لئے وہی ان کی پالیسی پر حاوی ہوتے تھے۔ یہ تھی ان اخباروں کی حقیقت جسے "قومی پریس" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اپنے ابتدائی زمانے میں خود کانگریس برابر یہ مطالبہ کیا کرتی تھی کہ ان علاقوں میں بھی استمراری بندوبست کر دیا جائے جہاں اب تک نہیں ہے۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ زمینداروں کے حقوق مسلم ہو جائیں۔ کسانوں کا کوئی خیال نہ تھا۔

لیکن پچھلے بیس برس میں قومی تحریک کی وجہ سے حالت بہت بدل گئی ہے اب تو اینگلو انڈین اخبار بھی ہندوستانی سیاسیات کے لیے جگہ نکالنے پر مجبور ہیں ورنہ ہندوستانی انھیں ہرگز نہ خریدیں۔ لیکن وہ ہندوستانی مسائل کو اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ہندوستانی اخباروں کی نظر بھی کچھ وسیع ہو گئی ہے۔ اب وہ بھی مزدوروں اور کسانوں کا تذکرہ مربیانہ انداز میں کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی ایک فیشن ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خریداروں کو دیہی اور صنعتی معاملات سے زیادہ دلچسپی ہوتی جاتی ہے لیکن حقیقت میں جیسے وہ پہلے اپنے مالکوں یعنی سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مفاد کی حمایت کرتے تھے اسی طرح اب بھی کرتے ہیں۔ بہت سے والیان ریاست بھی اخباروں میں روپیہ لگانے لگے ہیں۔ وہ اس ترکیب سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی کوڑی کوڑی وصول کر لیتے ہیں۔ اکثر اخباروں کے مالک اور نگراں کانگریس کے معمولی ممبر بھی نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ سب "کانگریسی اخبار" کہلاتے ہیں در اصل کانگریس کا نام لوگوں میں بہت مقبول ہے اس لیے بہت سے افراد اور بہت سی جماعتیں اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ کچھ اخبار ایسے بھی ہیں جو زیادہ آزاد خیالی سے کام لیتے ہیں لیکن انھیں مطابع کے سخت قوانین اور سنسر کا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اخبار بند نہ کر دیا جائے یا ضمانت نہ طلب کر لی جائے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں مجھے کھیتوں یا کارخانوں کے مزدوروں کی حالت کا بالکل علم نہ تھا کیونکہ میرے سیاسی خیالات بھی اوسط طبقے کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اتنا میں ضرور جانتا تھا کہ ہمارا ملک افلاس کی مصیبت میں گرفتار ہے اس لیے آزادی حاصل ہوتے ہی سب سے پہلے اسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے لیکن یہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ آزادی کے بعد متوسط طبقہ ملک کی سیاست پر حاوی ہو جائیگا چمپارن (بہار) اور کیرا (گجرات) میں گاندھی جی کی زرعی تحریکوں کے بعد مجھے

کسانوں کے مسئلے سے بھی کچھ دلچسپی ہوگئی تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے سیاسی ہنگاموں اور ترکِ موالات کی تحریک سے جو شروع ہونے والی ہی تھی۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ اس طرف کچھ توجہ کرتا۔

اسی زمانے میں مجھے ایک نئی چیز سے دلچسپی پیدا ہوگئی جو آگے چلکر میری زندگی میں خاص اہمیت اختیار کرنے والی تھی، یعنی تقریباً بلاارادے مجھے کسانوں سے سابقہ پڑا اور اس کی عجیب صورت ہوئی۔

میری ماں اور میری بیوی کملا دونوں کچھ بیمار تھیں اس لئے مئی سنہ ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتے میں، میں انھیں مسوری لے گیا۔ میرے والد اس وقت ایک بڑی ریاست کے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے اور مسٹر سی۔ آر۔ داس دوسرے فریق کے وکیل تھے۔ ہم مسوری کے سیوائے ہوٹل میں جا کر اترے۔ امان اللہ خاں کے تخت نشین ہونے کے بعد افغانستان اور برطانیہ میں سنہ ۱۹۱۹ء میں ایک مختصر سی جنگ ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں ان دونوں حکومتوں کے نمائندے مسوری میں موجود تھے اور مصالحت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ افغانی نمائندے سیوائے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے لیکن وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ الگ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ہوٹل کے عام کمرے میں کبھی قدم نہ رکھتے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک مہینے کے قیام میں ان میں سے کسی شخص کو میں نے دیکھا تک نہ تھا یا اگر دیکھا بھی ہو تو پہچانتا نہ تھا۔ یکایک ایک دن شام کے وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس ہمارے یہاں پہنچے اور صوبہ متحدہ کی حکومت کا ایک خط مجھے دکھایا جس میں مجھ سے اس قسم کے اقرارنامے کا مطالبہ کیا تھا کہ میں افغانی وفد سے کوئی راہ و رسم یا تعلق نہ رکھوں گا۔ یہ بات مجھے عجیب سی معلوم ہوئی۔ کیونکہ پچھلے ایک مہینہ کے قیام میں، میں ان میں سے کسی سے نہیں ملا تھا نہ آئندہ اس کی کوئی امید تھی۔ سپرنٹنڈنٹ موصوف بھی یہ بات اچھی طرح جانتے

تھے۔ کیونکہ وہ ان کی خاص نگرانی کر رہے تھے اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس کے سینکڑوں آدمی لگے ہوئے تھے۔ بہرحال اس طرح کا اقرار نامہ لکھنا میری طبیعت کے خلاف تھا اس لئے میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ اگر آپ دہرہ دون کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل لیں تو اچھا ہو۔ میں نے ان کی اس تجویز کو منظور کر لیا اور ان سے ملا لیکن چونکہ میں اقرار نامہ لکھنے سے برابر انکار کرتا رہا اس لئے مجھے حکم دیا گیا کہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر دہرہ دون کے ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ مسوری سے میں چند گھنٹے کے اندر روانہ ہو جاؤں۔ میرا دل تو نہ چاہتا تھا کہ اپنی بیمار ماں اور بیوی کو چھوڑ کر چلا جاؤں لیکن اس وقت سول نافرمانی شروع نہیں ہوئی تھی اس لئے میں نے اس حکم کی خلاف ورزی کرنا مناسب نہ سمجھا اور مسوری سے روانہ ہو گیا۔

اس زمانے میں سر ہارکورٹ بٹلر صوبہ متحدہ کے گورنر تھے۔ میرے والد انھیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے والد نے انھیں ایک دوستانہ خط لکھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ احمقانہ حکم یقیناً آپ نے جاری نہ کیا ہوگا بلکہ شملہ کے کسی حضرت کی یہ کارستانی ہے۔ سر ہارکورٹ نے جواب دیا کہ یہ حکم تو بالکل بےضرر سا تھا اور اگر جواہر لال اس کی تعمیل کر دیتے تو اس میں ان کی کوئی بےعزتی نہ ہوتی والد نے انھیں پھر خط لکھا اور ان کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ بالفعل اگرچہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن اس کی والدہ یا بیوی کی علالت کی وجہ سے کوئی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اس حکم کی ذرا پرواہ نہ کرے گا اور ضرور مسوری جائے گا۔ اتفاق سے میری والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ یہ اطلاع پاتے ہی والد اور میں دونوں فوراً مسوری کو روانہ ہو گئے۔ لیکن روانگی سے ذرا پہلے ہمیں حکومت کا تار ملا کہ وہ حکم منسوخ کر دیا گیا ہے اور تمہیں مسوری جانے کی آزادی ہے۔

دوسرے دن صبح ہم مسوری پہنچے تو ہوٹل کے صحن میں سب سے پہلے ہماری نظر ایک افغان پر پڑی جو میری ننھی بچی کو گود میں لئے کھلا رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ افغانستان کے وزیر اور اس وفد کے رکن ہیں۔ پھر یہ بھی پتہ چلا کہ میرے شہر بدر کئے جانے کے بعد ہی ان افغانیوں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی اور انھیں ہم لوگوں سے اتنا تعلق خاطر ہو گیا کہ سالار وفد روزانہ میری ماں کو پھلوں اور پھولوں کی ایک ٹوکری بھیجا کرتے۔

اس کے بعد والد اور میں وفد کے دو ایک اراکین سے ملے اور ان لوگوں نے ہمیں افغانستان آنے کی دعوت دی۔ افسوس ہے کہ ہمیں وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔ معلوم نہیں کہ وہاں کے جدید انقلابات کے بعد بھی ان کی وہ دعوت قائم ہے یا اب منسوخ ہو گئی۔

مسوری سے شہر بدر کئے جانے کے بعد میں دو ہفتہ تک الہ آباد میں رہا اسی زمانے میں کسانوں کی تحریک سے مجھے کچھ لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لگاؤ بڑھتا گیا اور اس سے میری ذہنیت پر بہت کچھ اثر پڑا۔ اکثر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر میں مسوری سے نکالا نہ گیا ہوتا اور اس زمانے میں الہ آباد میں بیکار نہ ہوتا تو اس وقت میرا کیا رنگ ہوتا۔ بہرحال کبھی نہ کبھی تو کسانوں کی تحریک سے مجھے ضرور سابقہ پڑتا لیکن شاید اس کی نوعیت مختلف ہوتی اور مجھ پر اس کا اثر بھی کچھ اور ہوتا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے جون ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتہ میں کوئی دو سو کسان ضلع پرتاب گڈھ سے پچاس میل چل کر الہ آباد پہنچے تاکہ مقتدر رہنماؤں کو اپنے حال زار کی طرف توجہ دلائیں۔ رام چندر نامی ایک شخص ان کا رہبر تھا۔ یہ خود کوئی مقامی کسان نہ تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ جمنا گھاٹ پر

زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں چند دوستوں کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ تعلقداران سے اتنا وحشیانہ سلوک کرتے ہیں اور اس بری طرح لوٹتے ہیں کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ انھوں نے ہم سے منتیں کیں کہ ہمارے ساتھ چل کر تحقیقات کیجیے اور ہمیں تعلقداروں کے غضب سے بچائیے کیونکہ وہ اس بات سے اور زیادہ ناراض ہو گئے ہیں کہ ہم ان کی شکایت کرنے الہ آباد کیوں آئے۔ ہم نے لاکھ عذر کیا مگر یہ کسان کسی طرح نہیں مانے اور سچ مچ ہم سے چمٹ گئے۔ آخر مجھے ان سے وعدہ کرنا پڑا کہ دو تین دن بعد میں ضرور آؤں گا۔

میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں گیا اور ریل اور پکی سڑک سے بہت دور تین دن گاؤں میں گزارے۔ اس دورے سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ سارے دیہات جوش و خروش سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور ان میں عجیب ہیجان برپا ہے۔ زبانی اطلاع پر دم بھر میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ ایک گاؤں دوسرے کو خبر کرتا تھا اور دوسرا تیسرے کو۔ اسی طرح آناً فاناً تمام گاؤں خالی ہو جاتے اور مرد، عورتیں اور بچے چاروں طرف جلسہ گاہ کی طرف بھاگتے نظر آتے۔ اس سے زیادہ تیزی سے "سیتارام" کا نعرہ کام کرتا تھا۔ جہاں یہ نعرہ بلند ہوا اور اس کی آواز فضا میں پھیلی، فوراً دوسرے گاؤں کے لوگ یہی نعرہ لگاتے ہوئے اڈ آتے تھے بلکہ بعض تو تیزی سے دوڑتے تھے۔ عورتوں اور مردوں سب کے چیتھڑے لگے تھے لیکن انکے چہرے جوش سے تمتماتے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک نمودار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا انھیں یقین ہے کہ کوئی معجزہ ہونے والا ہے جس سے ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

انھوں نے ہم پر الفت و محبت کی بارش کر دی۔ وہ ہمیں ایسی امیدوار

محبت بھری نظروں سے دیکھتے تھے جیسے ہم راحت و مسرت کا پیام لیکر آئے ہیں یا وہ خضرِ راہ ہیں جو انھیں "منزل موعود" پر پہنچا دیں گے۔ ان کی مصیبتوں اور اتھاہ محبتوں کو دیکھ کر افسوس اور شرم سے میری گردن جھک گئی۔ شرم تو مجھے خود اپنی عیش و آرام کی زندگی پر اور شہروں کی اس ادنیٰ سیاست پر محسوس ہوئی جو وطن کے ان نیم برہنہ بیٹوں اور بیٹیوں کی اتنی بڑی جماعت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور رنج اس لئے کہ ہندوستان کی مفلسی اور تنزل کو دیکھ کر دل بیٹھا جاتا تھا۔ اب میری نظروں کے سامنے مادرِ وطن کا ایک نیا تصور قائم ہو گیا یعنی ننگی۔ بھوکی ستم رسیدہ اور تباہ حال! غرض ان لوگوں کو ہم پر جو دور کے ایک شہر سے سرسری طور پر یہاں آئے تھے غیر معمولی بھروسا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوتی تھی اور ایسی نئی ذمہ داری کا بار محسوس ہوتا تھا جس کے خوف سے میں کانپا جاتا تھا۔

میں نے ان کی مصیبتوں کی ان گنت کہانیاں سنیں اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ لگان کے روز افزوں بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ ناجائز طور پر ان سے زبردستی روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ انھیں کھیت سے بیدخل کیا جاتا ہے اور انکی جھونپڑیاں تک چھین لی جاتی ہیں۔ پھر اوپر سے مار پڑتی ہے۔ غرض چاروں طرف سے خونخوار گدھ (یعنی زمینداروں کے کارندے۔ مہاجن اور پولیس وغیرہ) ان پر ٹوٹ پڑے ہیں اور ان کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ وہ بیچارے سارے دن محنت کرتے ہیں۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہاتے ہیں، لیکن شام کو انھیں پتہ چلتا ہے کہ ہم نے جو کچھ پیدا کیا وہ ہماری چیز نہیں ہے۔ ہمارا انعام تو صرف ٹھوکریں اور گالیاں ہیں اور فاقے ہماری قسمت میں لکھے ہیں جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں سے اکثر کے پاس کاشت کے لئے ایک چپہ زمین نہ تھی زمینداروں نے انھیں بیدخل کر دیا تھا۔ نہ ان کے پاس کھیت تھا کہ وہ اس پر

گذر کر سکیں اور نہ جھونپڑی کر وہاں جا کر پڑ رہیں۔ زمین خوب زرخیز ہے لیکن اس پہ بار بہت زیادہ ہے۔ جوت کا رقبہ کم ہے اور بہت سے لوگ اس کے خواستگار ہیں زمین کی اس مانگ کو دیکھ کر زمیندار ان سے ناجائز نذرانے وصول کرتے ہیں کیونکہ از روئے قانون وہ لگان نہیں بڑھا سکتے اور آسامی کے پاس کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے اس لئے وہ مہاجن سے روپیہ قرض لیتا ہے اور زمیندار کی نذر کرتا ہے۔ پھر جب یہ نوبت آتی ہے کہ نہ تو وہ قرض ادا کر سکتا ہے اور نہ لگان تو بیدخل کر دیا جاتا ہے اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

یہ صورت عرصے سے جاری تھی اور رعیت کا افلاس روز بروز بڑھ رہا تھا پھر اب کونسی ایسی بات ہوئی کہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا اور سب دیہات یکا یک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ معاشی حالت یقیناً خراب تھی لیکن یہ تو تمام اودھ میں یکساں تھی۔ پھر ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کی کسانوں کی ہلچل صرف پرتاب گڈھ رائے بریلی اور فیض آباد کے اضلاع تک کیوں محدود رہی۔ دراصل یہ جوش و خروش ایک حیرت انگیز شخص رام چندر کی بدولت پیدا ہوا۔ جسے لوگ عام طور پر بابا رام چندر کہا کرتے تھے۔

رام چندر مہا راشٹر کا رہنے والا تھا اور پابند مزدور کی حیثیت سے فیجی ہو آیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے رفتہ رفتہ اودھ کے ان اضلاع کا رُخ کیا۔ وہ یہاں کے دیہات میں گشت لگاتا، تلسی داس کی رامائن گا گا کر سناتا اور کسانوں کی تکلیفیں ہمدردی سے سنا کرتا تھا۔ وہ کچھ ایسا پڑھا لکھا نہ تھا اور کسی حد تک کسانوں سے اس نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن اس میں تنظیم کی غیر معمولی قوتیں تھیں اس نے کسانوں کو مل بیٹھنا اور اپنی مصیبتوں پر غور اور بحث کرنا سکھایا۔ گویا ان میں اتحاد عمل کا ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ کبھی کبھی بڑے بڑے جلسے بھی ہوتے تھے

اور اس طرح کسانوں کو اپنی قوت کا احساس ہوتا تھا۔ "سیتا رام" بہت پرانا اور عام نعرہ ہے لیکن اس نے اسے جنگی اہمیت دے دی۔ یہ کسی حادثے یا اہم واقعے کی اطلاع کا نشان اور مختلف دیہات میں اتحاد کا ایک ذریعہ ہو گیا فیض آباد۔ پرتاب گڈھ اور رائے بریلی میں رام چندر اور سیتا کے پرانے فسانے بہت عام ہیں۔ کیونکہ یہ اضلاع سلطنت اجودھیا میں شامل تھے اور تلسی داس کی کتاب ہندی رامائن عوام میں بہت مقبول ہے۔ اکثر لوگوں کو اسکی بہت سی نظمیں زبانی یاد ہیں۔ رام چندر اس کتاب کے اقتباسات نہایت موقع موقع سے سنایا کرتا تھا۔ اس میں اسے بہت ملکہ حاصل تھا۔ کسانوں کی تھوڑی بہت تنظیم کرنے کے بعد اس نے ان سے طرح طرح کے وعدے کئے۔ اگرچہ یہ وعدے نہایت مبہم تھے لیکن بھولے بھالے کسانوں کو ان سے بڑی بڑی امیدیں ہوگئی تھیں رام چندر کے سامنے کوئی باضابطہ لائحہ عمل نہ تھا، اس لئے جب اس نے دیکھا کہ جوش اپنے پورے شباب پر پہنچ گیا ہے تو اپنی ذمہ داری دوسروں کے سر ڈالنے کی کوشش کی۔ اسی مقصد سے وہ بہت سے کسانوں کو الہ آباد لایا تاکہ دوسرے لوگوں کو اس تحریک سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔

رام چندر ایک سال اور کسانوں کی تحریک میں نمایاں حصہ لیتا رہا اور دو تین مرتبہ جیل بھی گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نہایت غیر ذمہ دار اور ناقابل اعتماد شخص تھا۔

کسانوں کی تحریک کے لئے اودھ کا علاقہ خاص طور پر موزوں تھا۔ یہ تعلقداروں کا ملک ہے جو اپنے آپ کو "اودھ کے نواب" کہتے ہیں۔ زمینداری کے نظام کی سب سے مکروہ صورت یہاں نظر آتی ہے۔ تعلقداروں کی زیادتیاں ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھیں اور ایسے کسانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی

جاتی تھی، جن کے پاس کاشت کے لئے ایک چپہ زمین نہ تھی اور صرف مزدوری پر ان کی گذر اوقات تھی۔ وہاں صرف ایک قسم کے آسامی تھے۔ اس لئے متحدہ جدوجہد آسانی سے ممکن تھی۔

زرعی اعتبار سے ہندوستان کو سرسری طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی بڑے بڑے زمینداروں کا علاقہ اور ان چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کا علاقہ جو اپنی آراضی کے خود مالک ہیں۔ کہیں کہیں یہ دونوں خلط ملط بھی ہیں۔ بنگال، بہار اور صوبہ جات متحدہ میں زمینداری کا طریقہ رائج ہے اکثر ان کسانوں کی حالت جو خود اپنی آراضی کے مالک ہیں نسبتاً بہتر ہوتی ہے لیکن بعض جگہ وہ بھی بڑی مصیبت میں ہیں۔ عام طور پر پنجاب اور گجرات کے کسان (جنھیں مالکانہ حقوق حاصل ہیں) زمینداری کے کسانوں کی بہ نسبت بہت اچھی حالت میں ہیں۔ زمینداری علاقوں میں اسامیوں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں مثلاً دخیل کار، غیر دخیل کار، کاشتکار شکمی کاشتکار وغیرہ۔ ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ متحد اور متفق ہو کر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء میں اودھ میں نہ تو دخیل کار کاشتکار تھے اور نہ موروثی صرف میعادی کاشتکار تھے اور جہاں زمینداروں کو کسی دوسرے شخص نے زیادہ نذرانہ دینے کا وعدہ کیا فوراً انھیں بے دخل کر دیا جاتا تھا چونکہ یہاں ایک ہی قسم کے کاشتکار تھے اس لئے انھیں منظم کرنا زیادہ آسان تھا۔

عملاً اودھ میں میعادی کاشتکاروں کو میعاد کے اندر ہی بے دخل کر دینے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ عام طور پر زمیندار وصول شدہ زر لگان کی رسید نہیں دیتے تھے۔ اس لئے بآسانی اس سے انکار کر کے آسامی کو بے دخل کر سکتے تھے اور وہ بیچارہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکتا تھا۔ زر لگان کے علاوہ بہت سی ناجائز وصولیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایک تعلقہ میں تو مجھے معلوم ہوا کہ کوئی پچاس مختلف ناموں سے

کسانوں سے زبردستی روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس تعداد میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ تعلقدار اپنے ہر کام کے لئے اسامیوں سے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ تعلقدار کے خاندان میں اگر کوئی شادی ہے تو اسامی روپیہ دیں۔ اس کا لڑکا اگر غیر ممالک میں تعلیم پا رہا ہے تو اسامی اس کا بار برداشت کریں۔ گورنر صاحب یا کسی اعلیٰ افسر کو پارٹی دینا ہے تو اس کے اخراجات بھی اسامیوں کے ذمہ۔ تعلقدار صاحب موٹر یا ہاتھی خریدنا چاہتے ہیں تو قیمت اسامیوں سے وصول کی جائے۔ ان وصول یابیوں کے خاص نام بھی ہوتے ہیں مثلاً موٹرانہ (یعنی موٹر کی خریداری کا ٹیکس) ہاتھیانہ (یعنی ہاتھی کی خریداری کا ٹیکس) وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے اگر اودھ کے کسانوں میں ہلچل پیدا ہو گئی تو کوئی تعجب نہیں۔ البتہ یہ بات قابل تعجب ضرور تھی کہ شہر والوں کی مدد یا سیاسی کارکنوں کی مداخلت کے بغیر یہ تحریک خود بخود زور پکڑ گئی۔ کسانوں کی اس تحریک کو نہ کانگرس سے کسی قسم کا تعلق تھا نہ ترک موالات سے، جو اسی زمانے میں شروع ہوئی تھی، کوئی واسطہ تھا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید ان دونوں عام اور زبردست تحریکوں کی بنیادی وجوہ یکساں تھیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ کسانوں نے گاندھی جی کی ۱۹۱۹ء کی ہڑتالوں میں پورا حصہ لیا تھا اور اس کے بعد گاندھی جی کا نام ان پر جادو کا سا اثر کرتا تھا۔

مجھے اس بات سے اور زیادہ حیرت ہوئی کہ شہر والے کسانوں کی اس زبردست تحریک سے بالکل ناواقف تھے۔ کسی اخبار میں اس کے متعلق ایک سطر بھی نہ نکلی تھی انھیں دیہات سے کوئی دلچسپی اور تعلق ہی نہ تھا۔ مجھے اس شدت سے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ ہم عوام سے اس قدر دور اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور ہماری ساری جد و جہد اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے۔

(۹)

دیہات میں گشت

تین دن دیہات میں گزار کر میں الہ آباد واپس آیا اور کچھ دن کے بعد پھر وہاں گیا۔ ان مختصر دوروں میں ہم گاؤں گاؤں پھرے۔ کسانوں کے ساتھ کھانا کھایا ان ہی کی جھونپڑیوں میں رہے۔ گھنٹوں ان سے باتیں کیں اور اکثر چھوٹے بڑے جلسوں میں تقریریں بھی کیں ہم ایک چھوٹی سی موٹر میں گئے تھے اور کسان ہمارے اتنے مشتاق تھے کہ رات بھر میں انھوں نے کھیتوں میں کچی سڑکیں بنا ڈالیں۔ تاکہ ہماری موٹر آسانی سے ہر جگہ پہنچ سکے۔ اکثر ہماری موٹر دلدل میں پھنس گئی اور بیسیوں آدمیوں نے بڑے خلوص و محبت کے ساتھ آن کی آن میں ہاتھوں ہاتھ اسے اٹھا کر رکھ دیا۔ آخر کار ہم نے موٹر چھوڑ دی اور باقی دورہ پیدل طے کیا۔ جہاں کہیں ہم جاتے تھے معمولی پولیس اور خفیہ پولیس والے اور لکھنؤ کے ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب سایہ کی طرح ہمارے پیچھے لگے رہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے انھیں بہت پریشان کیا کیونکہ ہم سارے سارے دن کھیتوں کھیتوں پھرا کرتے تھے۔ وہ تھک کر پست ہو جاتے تھے۔ اس لئے شاید ہم سے اور ان کسانوں سے عاجز آ گئے تھے۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب لکھنؤ کے ایک نوجوان تھے ان میں کچھ زنانہ پن سا پایا جاتا تھا۔ آپ پیٹنٹ لیدر کا پمپ پہن کر تشریف لائے تھے۔ بارہا انھوں نے ہم سے التجا کی کہ خدا کے لئے اپنی اس سرگرمی کو ذرا کم کر دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ بعد میں وہ ہمارا ساتھ نہ دے سکے اور ہار کر بیٹھ رہے۔

یہ جون کا مہینہ تھا جب ہندوستان میں سب سے زیادہ گرمی پڑتی ہے اور برسات کی آمد آمد ہوتی ہے۔ دھوپ کی شدت سے بدن جھلسا جاتا تھا اور آنکھوں کے نیچے اندھیرا آجاتا تھا۔ میں دھوپ میں نکلنے کا کبھی عادی نہ تھا۔ اور جب سے انگلستان سے واپس آیا تھا گرمیاں برابر پہاڑ پہ گذارتا تھا۔ لیکن اب میں بھری دوپہر اور چلچلاتی دھوپ میں گھومتا تھا اور میرے سر پر ہیٹ بھی نہ ہوتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی تولیہ لپیٹ لیتا تھا۔ میں دوسرے کاموں میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ گرمی کی اس شدت کا خیال بھی نہ آتا تھا۔ البتہ جب میں الہ آباد واپس آیا اور دیکھا کہ میرا رنگ کس قدر سانولا ہو گیا ہے تو اس کا احساس ہوا کہ مجھ پر کیا دور گذر گیا لیکن یہ خیال کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں بھی اپنے ملک کے جفاکش لوگوں کی طرح گرمی کی کلفتیں برداشت کر سکتا ہوں اور اب تک میں اس سے خواہ مخواہ ڈرتا تھا۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں سخت سے سخت گرمی اور سردی دونوں آسانی سے جھیل سکتا ہوں اور یہ جفاکشی میرے معمولی مشاغل میں اور قید کے زمانے میں بہت کام آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے قوی بہت اچھے تھے اور میں روزانہ ورزش کیا کرتا تھا۔ ورزش کا سبق میں نے اپنے والد سے سیکھا تھا۔ انھیں ورزشی کھیلوں کا تھوڑا بہت شوق تھا اور کسرت تو انھوں نے مرتے دم تک نہیں چھوڑی۔ ان کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرے پہ جھریاں پڑ گئی تھیں۔ دیکھنے میں بہت بوڑھے اور فکروں کے مارے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ان کا جسم ایسا گٹھا ہوا تھا کہ مرنے سے ایک دو سال پہلے تک دیکھنے والے ان کی عمر بیس سال کم ہی جانچتے تھے۔

جون سنہ ۱۹۲۰ء میں پرتاب گڑھ جانے سے پہلے بھی مجھے اکثر دیہات سے گذرنے کا اور وہاں ٹھہر کر کسانوں سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا تھا بڑے

بڑے میلوں میں گنگا کے کنارے اُن کے لاکھوں کے مجمعے دیکھے تھے اور ان میں ہوم رول کے پرچار کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن اب تک مجھے اس کا پوری طرح احساس نہ ہوا تھا کہ وہ کیا ہیں اور ملک میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ اوروں کی طرح میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں حقیقت کا انکشاف تو مجھ پر پرتاب گڈھ کے اس دورے میں ہوا۔ اس کے بعد سے جب میں ہندستان کا تصور کرتا ہوں تو ہمیشہ ان ہی ننگے اور بھوکے لوگوں کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ شاید ان دنوں فضا میں کوئی برقی طاقت کام کر رہی تھی یا شاید میرا ذہن اس وقت اتنا اثر پذیر تھا کہ جو منظر میں نے دیکھے اور جو تاثرات حاصل کئے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے۔

ان کسانوں نے میرے حجاب کو دور کر دیا اور مجھے عام مجمعے میں بولنا سکھایا اس سے پہلے میں نے شاید ہی مجمع میں تقریر کی ہو۔ عام جلسوں میں عموماً ہندستانی میں تقریر کرنی پڑتی تھی اس وجہ سے میں اور بھی گھبراتا تھا لیکن ان کسانوں کے جلسوں میں مجھے پے در پے تقریریں کرنی پڑیں اور ان بھولے بھالے غریبوں کے سامنے شرمانے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی میں فن خطابت سے واقف نہ تھا اس لئے میں ان کے سامنے اس طرح تقریر کرتا جیسے کوئی بات چیت کرتا ہے اور جو کچھ میرے دل و دماغ میں ہوتا وہ سیدھے سادے الفاظ میں ان سے کہہ دیتا۔ چاہے جلسے میں تھوڑے سے آدمی ہوتے یا ہزاروں لاکھوں کا مجمع ہوتا لیکن میں اپنا بات چیت کا انداز ترک نہ کرتا بہر حال مجھے تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ میری تقریریں خواہ کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں میرا کام اچھی طرح چل جاتا تھا میرے بیان میں روانی کی کمی نہ تھی شاید ان میں سے بہت سے لوگ جو کچھ میں کہتا تھا اس کا بہت سا حصہ سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ میری زبان اور میرے خیالات ان کے لئے

آسان نہ تھے اور جب مجمع بہت زیادہ ہوتا تھا تو ان میں سے اکثر لوگ میری آواز بھی نہ سن سکتے تھے لیکن انھیں اس کی کچھ زیادہ پرواہ نہ تھی کیونکہ جب یہ لوگ کسی پر اعتماد کر لیتے ہیں تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں کرتے۔

میں اپنی ماں اور بیوی کے پاس مسوری چلا گیا لیکن میرا دل انھی کسانوں میں پڑا تھا اور میں پھر ان کے پاس پہنچنے کے لئے بیچین تھا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ہی میں نے دیہات میں گشت شروع کر دیا اور دیکھا کہ کسانوں کی تحریک برابر زور پکڑتی جا رہی ہے۔ ان مظلوموں کو بھی اب اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو چلا تھا اور یہ سر اونچا کر کے چلنے لگے تھے۔ زمیندار کے کارندوں اور پولیس کا خوف اب ان کے دل سے کم ہوتا جاتا تھا۔ جب کبھی کوئی کسان بے دخل کیا جاتا تھا تو دوسرا کسان اس زمین کو لینے کے لئے آگے نہ بڑھتا تھا۔ زمیندار کے ملازم اب مار پیٹ کرتے بھی ڈرتے تھے اور ناجائز لوٹ بھی کم ہو گئی تھی۔ اگر کبھی اس قسم کے واقعات ہوتے تو فوراً اس کی اطلاع کی جاتی اور تحقیقات شروع ہو جاتی۔ اس وجہ سے پولیس اور زمیندار کے ملازم دونوں اپنی حرکتوں سے باز رہتے۔ تعلقدار بھی ڈرتے تھے اور حملے کے بجائے اب مدافعت کی فکر میں تھے۔ صوبہ کی حکومت نے بھی وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اودھ کے قانون لگان میں ترمیم کر دے گی۔

تعلقدار اور بڑے بڑے زمیندار جو خدا کی زمین کے مالک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑے فخر سے "رعیت کا قدرتی لیڈر" کہتے ہیں، برطانوی حکومت کے لاڈ میں بگاڑے ہوئے بیٹھے ہیں اور حکومت نے ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت دیکر یا معقول تعلیم و تربیت کا انتظام نہ کر کے انھیں مجموعی طور پر ذہنی حیثیت سے بالکل نکما کر دیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں تو زمیندار اپنی رعایا کیلئے تھوڑا بہت کرتے بھی رہے ہیں مگر ان لوگوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اس لئے یہ رفتہ رفتہ زمین کے اور رعایا

کے طفیلی بن کر رہ گئے۔ ان کا خاص کام یہ ہے کہ مقامی افسروں کی خوشامد کئے
جائیں جن کی نظر عنایت کے بغیر وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتے اور اپنے
حقوق و مراعات کے تحفظ کا برابر مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔

لفظ زمیندار سے بہت کچھ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ہر شخص کو یہی
خیال ہوگا کہ ہر زمیندار بہت بڑی زمین کا مالک ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے جن صوبوں
میں رعیت واری کا نظام رائج ہے وہاں ان کسانوں کو زمیندار کہتے ہیں جو اپنی
اراضی کے خود مالک ہیں اور ان صوبوں میں جہاں زمینداری کا نظام رائج ہے چند
بڑے بڑے اور ہزاروں اوسط درجے کے مالکان اراضی بھی زمیندار کہلاتے ہیں۔
اور لاکھوں وہ لوگ بھی جو انتہائی مفلسی میں بسر کرتے ہیں اور جن کی حالت معمولی
کسانوں سے کسی صورت میں بہتر نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے صوبہ جات متحدہ
میں تقریباً پندرہ لاکھ اشخاص کا شمار زمینداروں میں ہوتا ہے۔ غالباً ان میں سے
۹۰ فیصدی کی حالت کچھ بہتر ہے۔ بڑی زمینوں کے مالکوں کی تعداد سارے صوبے
میں پانچ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی اور ان میں سے زیادہ سے زیادہ پانچ سو ایسے
ہوں گے جنہیں واقعی بڑا زمیندار یا تعلقدار کہا جا سکتا ہے۔ بعض مثالیں تو ایسی
موجود ہیں کہ بڑے کاشتکاروں کی حالت چھوٹے زمینداروں سے کہیں بہتر ہے۔
چھوٹے اور اوسط درجے کے زمیندار دونوں اگرچہ ذہنی اعتبار سے بہت پست
ہیں لیکن بحیثیت مجموعی بڑے اچھے لوگ ہیں اور ان میں اتنی اہلیت موجود ہے کہ
اگر انہیں معقول تعلیم و تربیت دی جائے تو یہ بہترین شہری بن سکتے ہیں۔ انہوں
نے قومی تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ لیکن چند مشہور افراد کے علاوہ بڑے بڑے
زمینداروں اور تعلقداروں نے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ ان لوگوں
میں ریاست کی شان اور ان کی خوبیاں مطلق نہیں ہیں۔ ان کی ساری جماعت

جسمانی اور دماغی ہر اعتبار سے تنزل پذیر ہے۔ گویا وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکی ہے اور اسی وقت تک زندہ ہے جبتک برطانوی حکومت جیسی کوئی بیرونی طاقت اسے سہارا دیئے ہوئے ہے۔

۱۹۲۱ء میں سال بھر میں دیہاتی علاقوں کا دورہ کرتا رہا میرا میدان عمل وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ میری سرگرمیاں سارے صوبہ متحدہ میں پھیل گئیں ترک موالات کی تحریک پورے زور شور سے شروع ہو چکی تھی اور اس کی آواز گاؤں گاؤں پہنچ گئی تھی۔ ہر ضلع میں کانگریس کے کارکن اس نئے پیغام کو لے کر دیہاتی علاقوں میں نکل کھڑے ہوئے اور انھوں نے اکثر مبہم طریقہ سے اس میں یہ اضافہ بھی کر دیا کہ کسانوں کی شکایتیں بھی رفع ہو جائیں گی۔ سوراج ایسا عام لفظ ہے جو ہر چیز پر حاوی ہے۔ تاہم یہ دونوں تحریکیں (یعنی ترک موالات اور کسانوں کی تحریک) بالکل علیحدہ علیحدہ رہیں۔ اگرچہ ہمارے صوبے میں کبھی کبھی یہ گڈمڈ ہو جاتی تھیں اور ایک دوسرے پر بہت زیادہ اثر ڈالتی تھیں۔ کانگریس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدمہ بازی یکایک کم ہو گئی۔ اور تمام مواضعات میں آپس کے جھگڑے طے کرنے کے لئے پنچایتیں قائم ہو گئیں۔ امن کے معاملے میں کانگریس کا اثر خصوصیت سے بہت زبردست پڑا کیونکہ جہاں کہیں کانگریس کے کارکن جاتے، عدم تشدد کے نئے مسلک پر خاص زور دیتے۔ ممکن ہے لوگوں نے اس کی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس تحریک نے کسانوں کو تشدد سے بہت کچھ باز رکھا۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کسانوں کی تحریکیں عام طور پر بہت بدنام ہیں کہ ان میں تشدد اور فساد ضرور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اودھ کے بعض اضلاع کے کسان بہت مشتعل تھے اور جان پر کھیلنے کو تیار تھے۔ ایک ذراسی چنگاری بھی

آگ لگانے کو کافی تھی لیکن وہ اس قدر با امن رہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی تشدد کی صرف ایک مثال مجھے یاد ہے۔ ایک کسان ایک تعلقدار کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے مکان پہ دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے اس بنا پر ان کے تھپڑ رسید کئے کہ وہ بدچلن تھے اور خود اپنی بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے۔

اس کے بعد دوسرے قسم کا تشدد بھی شروع ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت سے چھڑ گئی۔ لیکن یہ لڑائی تو ہونا ہی تھی۔ کیونکہ حکومت کسانوں کے اتحاد و اتفاق اور ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کب دیکھ سکتی تھی۔ کسانوں نے بلا ٹکٹ ریلوں میں سفر کرنا شروع کر دیا۔ خاص کر جب ان کے بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے جس میں ساٹھ ستر ہزار آدمی شریک ہوتے تھے تو یہ بہت بڑی تعداد میں بلا ٹکٹ سفر کیا کرتے تھے انھیں ریل سے اتارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جو بات پہلے کبھی نہ سنی گئی تھی وہ اب دیکھنے میں آئی یعنی اب کسان کھلم کھلا ریلوے کے حکام کی خلاف ورزی کرتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ وہ دن گئے جب آپ ہم پر سختیاں کرتے تھے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس کے اشارے پہ انھوں نے یہ حرکت شروع کی۔ بہر حال ہم نے انھیں یہ ترغیب نہیں دی تھی۔ ہمیں تو یکایک معلوم ہوا کہ وہ بے اعتدالی کر رہے ہیں۔ بعد میں جب ریلوے نے زیادہ سختی سے نگرانی کی تو لوگوں نے یہ طریقہ چھوڑ دیا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں (جب میں کانگریس کے خاص اجلاس کی شرکت کی غرض سے کلکتہ میں تھا) کسانوں کے چند لیڈر کسی معمولی سے الزام پر گرفتار کر لئے گئے ان کے مقدمے کی سماعت شہر پرتاب گڈھ میں ہونے والی تھی چنانچہ پیشی کے دن کسانوں کا جم غفیر کچہری پہنچ گیا۔ کچہری کا سارا احاطہ اور جیل کی سڑک ان سے کھچا کھچ بھر گئی مجسٹریٹ یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور مقدمہ دوسرے روز کے لئے ملتوی کر دیا۔ لیکن مجمع برابر بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس نے جیل کو بھی گھیر لیا۔ کسان مٹھی بھر چنوں پر آسانی

سے کئی کئی دن گذار سکتے ہیں اس لئے وہ وہاں ڈٹے رہے آخر کار جیل ہی میں
شاید سرسری سماعت کے بعد ان لیڈروں کو بری کر دیا گیا۔ مجھے یہ یاد نہیں، کہ
اس کی صورت کیا ہوئی لیکن کسانوں کے نزدیک یہ ان کی بڑی زبردست فتح تھی
ان کے دل میں یہ بات سما گئی کہ وہ ہمیشہ بڑی تعداد کے زور پر جو چاہیں کرا سکتے ہیں۔
حکومت یہ صورت کب گوارا کر سکتی تھی چنانچہ بہت جلد اسی طرح کا ایک دوسرا موقع
پیدا ہوا اور اب کسانوں کو شکست کھانی پڑی۔

یہ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء کے آغاز کا واقعہ ہے۔ میں ناگپور کانگریس سے الہ آباد
واپس آیا ہی تھا کہ مجھے رائے بریلی سے ایک تار ملا۔ اس تار میں لکھا تھا کہ یہاں فساد
کا اندیشہ ہے اس لئے فوراً آؤ۔ میں دوسرے ہی دن روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر
مجھے معلوم ہوا کہ کسانوں کے بعض سربرآوردہ رہنما چند روز ہوئے گرفتار کر لئے
گئے تھے اور مقامی جیل میں بند تھے۔ پرتاب گڈھ میں کسانوں کو جو کامیابی حاصل
ہوئی تھی اور وہاں انھوں نے جو ترکیبیں استعمال کی تھیں انھیں دیکھ کر یہ لوگ
بھی زبردست مظاہرہ کرنے کیلئے رائے بریلی شہر کو روانہ ہو گئے لیکن اس مرتبہ حکومت اسے
برداشت کرنے والی نہ تھی اس لئے مزید پولیس اور فوج اکٹھا کی گئی تاکہ کسانوں کو
راستے ہی میں روک دیا جائے۔ چنانچہ شہر کے باہر ہی ندی کے کنارے پر اُن کی
خاص جماعت کا راستہ روک دیا گیا۔ پھر بھی بہت سے لوگ دوسرے راستوں سے
پہنچ گئے۔ مجھے اسٹیشن پر یہ حالات معلوم ہوئے اور میں وہاں سے سیدھا ندی کی
طرف روانہ ہوا جہاں فوج اور کسان ایک دوسرے کے مقابلے پر کھڑے تھے
راستے میں مجھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا جلدی میں لکھا ہوا ایک حکم ملا کہ وہاں جانے
کی اجازت نہیں ہے اس لئے واپس لوٹ جاؤ۔ میں نے اسی کی پشت پر جواب لکھ دیا
کہ کس قانون کی کس دفعہ کی رو سے آپ مجھے واپسی کا حکم دے رہے ہیں۔ اور جب تک انکا

جواب آ گئے۔ میں نے آگے بڑھنا طے کر لیا۔ جب میں ندی کے کنارے پہنچا تو گولیوں کی آواز دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ فوج نے مجھے پل ہی پر روک لیا۔ اسی درمیان میں بہت سے خوفزدہ کسان جو ندی کے اسی طرف کھیتوں میں چھپے ہوئے تھے میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اس لیے میں نے کوئی دو ہزار کسانوں کا اسی جگہ جلسہ کیا اور ان کے جوش کو کم کرنے اور خوف و ہراس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ بہت ہی غیر معمولی منظر تھا۔ کیونکہ ندی کے دوسری طرف ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے بھائیوں پر گولیاں برس رہی تھیں اور ہر طرف فوج ہی فوج نظر آتی تھی۔ لیکن جلسہ بہت کامیاب ہوا۔ اور کسانوں کے دل سے خوف جاتا رہا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ موقع واردات سے واپس آئے اور ان کی درخواست پر میں ان کے ساتھ ان کے مکان پر گیا۔ یہاں انھوں نے مجھے کسی نہ کسی بہانے سے کوئی دو گھنٹے تک روکے رکھا۔ دراصل وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ میں اپنے رفقائے کار اور کسانوں سے فوراً مل سکوں۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ ہلاک ہوئے۔ کسانوں نے منتشر ہونے یا واپس جانے سے قطعی انکار کر دیا۔ لیکن وہ ہر طرح پر امن رہے مجھے کامل یقین ہے کہ اگر میں یا کوئی اور شخص جس پر انھیں اعتماد ہوتا وہاں موجود ہوتا اور ان سے واپس جانے کو کہتا تو وہ ضرور مان جاتے لیکن وہ ان لوگوں کا حکم ماننے کو تیار نہ تھے جن پر انھیں اعتماد نہیں تھا۔ کسی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ذرا دیر میرا انتظار کر لیں لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جہاں وہ ناکام رہے ہیں وہاں ایک باغی کامیاب ہو۔ بدیشی حکومتیں جنھیں صرف اپنا رعب قائم کرنے کی فکر ہے یہ چیز کبھی گوارا نہیں کرتیں۔

اسی زمانے میں ضلع رائے بریلی میں کسانوں پر دو مرتبہ گولی چلائی گئی اس کے بعد پنچایت کے ہر رکن اور کسانوں کے ہر مشہور کارکن پر عام تشدد شروع ہو گیا۔ جو اس سے بھی برا تھا۔ حکومت نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس تحریک کو کچل ڈالیگی اس زمانے میں کانگریس کی ہدایت کے مطابق کسانوں میں چرخہ کاتنے کا عام رواج ہو گیا تھا۔ اس لئے چرخہ بغاوت کا نشان قرار پایا۔ بس جس کسی کے پاس چرخہ نکلتا وہ ضرور مصیبت میں پھنستا۔ اکثر چرخہ بھی چھین کر جلادیا جاتا۔ اس طرح حکومت نے یہ کوشش کی کہ رائے بریلی اور پرتاب گڑھ کے اضلاع میں کانگریس کی تحریک اور کسانوں کی تحریک دونوں کو سینکڑوں گرفتاریوں اور دوسرے ذریعوں سے دبادیا جائے۔ عموماً دونوں تحریکوں کے کارکن مشترک تھے۔

کچھ عرصے بعد ۱۹۲۱ء میں ضلع فیض آباد کو عام تشدد سے پالا پڑا۔ وہاں بالکل عجیب طریقے سے ہنگامہ شروع ہوا۔ بعض مواضعات کے کسانوں نے ایک تعلقدار پر حملہ کیا اور اسے لوٹ لیا۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ ایک دوسرے زمیندار کے ملازموں نے جسے اس تعلقدار سے عداوت تھی ان کسانوں کو ورغلایا تھا۔ ان بیچارے بھولے بھالے لوگوں سے واقعی یہ کہا گیا کہ مہاتما گاندھی کی یہ خواہش ہے کہ تم اس تعلقدار کو لوٹ لو۔ چنانچہ انھوں نے خوشی سے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ لوٹ مار کرتے وقت "مہاتما گاندھی کی جے" پکارتے جاتے تھے۔

میں نے جب یہ سنا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ یہ ضلع فیض آباد میں اکبر پور کے قریب کا واقعہ تھا۔ چنانچہ اس حادثے کے دو تین دن کے اندر ہی میں وہاں پہنچ گیا اور اسی دن میں نے ایک جلسہ کیا۔ چند گھنٹے کے اندر اندر چاروں طرف سے مواضعات سے کوئی دس میل کی دوری سے پانچ چھ ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ میں نے انھیں بہت کچھ سخت سست کہا۔ وہ خود اپنی اور اپنے مقصد کی

ذلت کا باعث ہوئے۔ اس لئے مجرموں کو سب کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہیئے (اس زمانے میں ہمیں گاندھی جی کی ستیاگرہ کے جذبے میں، جہانتک میں اسے سمجھ سکتا تھا، دیا ہوا تھا) چنانچہ میں نے مطالبہ کیا کہ جن لوگوں نے لوٹ مار میں حصہ لیا تھا وہ ہاتھ اٹھا دیں۔ سب یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ متعدد پولیس افسروں کی موجودگی میں دو درجن ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ان بیچاروں پر آفت آنا یقینی ہو گیا۔

بعد میں جب میں نے ان سے تنہائی میں گفتگو کی اور ان کی سیدھی سچی کہانی سنی کہ کس طرح انھیں ورغلایا گیا تو مجھے ان پر بڑا رحم آیا اور اس کا افسوس ہوا کہ میں نے ان بے وقوف اور بھولے بھالے لوگوں کا پردہ فاش کر کے انھیں لمبی سزاؤں کا مستوجب بنا دیا۔ لیکن صرف دو تین ہی درجن شخصوں کو سزا نہیں ملی۔ حکومت کو تو یہ زریں موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس لئے ضلع میں کسانوں کی تحریک کو کچلنے کے لئے اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا یعنی کوئی ایکہزار آدمی گرفتار ہوئے۔ ڈسٹرکٹ جیل کھچا کھچ بھر گئی اور مقدمے کی پیشیاں قریب قریب سال بھر تک ہوتی رہیں۔ بہتیرے تو مقدمے کے دوران میں جیل خانے ہی میں مر گئے۔ بہتوں کو لمبی لمبی سزائیں ہوئیں اور اس کے چند سال بعد جب میں جیل گیا تو ان میں سے بعض لڑکوں اور نوجوانوں سے وہاں ملا جو اپنی جوانی کے دن جیل خانے میں کاٹ رہے تھے۔

ہندوستانی کسانوں میں قوت مقابلہ کم ہوتی ہے۔ ان میں اتنی سرگرمی نہیں ہوتی کہ وہ زیادہ عرصے تک ثابت قدم رہ سکیں۔ قحط اور وبائیں آتی ہیں اور لاکھوں کو ٹھکانے لگا دیتی ہیں۔ اس لئے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حکومت اور زمیندار کی متحدہ کوششوں کے باوجود انھوں نے پورے سال مقابلے کی

زبردست قوت کا ثبوت دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی ہمتوں نے جواب دینا شروع کیا اور حکومت کے پیہم حملے نے تحریک کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔ لیکن اندر اندر وہ اب بھی باقی تھی۔ اب پہلے کی طرح بڑے بڑے مظاہرے نہیں ہوتے تھے لیکن اکثر دیہاتوں میں ایسے کارکن موجود تھے جو دہشت کا شکار نہیں ہوئے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ یہ سب کچھ جیل جانے کی اس تحریک سے پہلے ہوا جو کانگریس نے سنہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں شروع کی تھی باوجودیکہ کسان پچھلے سال کافی مصیبتیں جھیل چکے تھے تاہم اس تحریک میں بھی انھوں نے کافی حصہ لیا۔

کسانوں کی تحریک سے خائف ہو کر حکومت نے قانون آراضی کی ترمیم میں عجلت سے کام لیا۔ اس سے ذرا امید ہوئی تھی کہ کسانوں کی حالت کچھ سنبھل جائے گی۔ لیکن جب حکومت نے دیکھا کہ اب تحریک قابو میں آگئی ہے فوراً اس میں کانٹ چھانٹ کر دی۔ البتہ یہ ایک بڑی تبدیلی ہو گئی کہ اودھ کے کسانوں کو حق موروثی مل گیا۔ بظاہر یہ چیز انھیں بڑی دلکش معلوم ہوئی۔ لیکن بعد میں تجربے سے ثابت ہوا کہ اس سے ان کی مصیبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد بھی اودھ میں کہیں کہیں کسانوں کی شورش اٹھ کھڑی ہوتی تھی لیکن بہت معمولی پیمانے پر۔ مگر ۱۹۲۹ء میں جب ساری دنیا میں عام کساد بازاری کا دور دورہ ہوا تو اجناس کی قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے پھر ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔

(۱۰)

ترکِ موالات

میں نے اودھ کے کسانوں کی ہلچل کا حال قدرا تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ اس نے میری آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھا دیئے اور مجھ پر ہندوستانی تحریک کے اس بنیادی پہلو کو روشن کر دیا جس کی طرف قوم پرستوں نے اب تک کوئی توجہ نہ کی تھی. کسانوں کے ہنگامے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اکثر ہوا کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں شدید بے چینی موجود ہے سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۱ء میں اودھ کے بعض علاقوں میں کسانوں کی یہ ہلچل بھی اسی قسم کی تھی لیکن اس میں بعض حیرت انگیز خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے ہم لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں ابتدا میں اسے سیاست یا سیاست والوں سے کوئی سروکار نہیں تھا. اور آگے چل کر بھی باہر کے آدمیوں اور سیاست والوں کو اس میں کچھ زیادہ دخل نہ ہوا. ملکی نقطۂ نظر سے یہ مقامی معاملہ تھا اس لئے لوگوں نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی. حتیٰ کہ صوبہ متحدہ کے اخبارات نے بھی بڑی حد تک اسے نظر انداز کر دیا کیونکہ ان کے ایڈیٹروں اور شہری ناظرین کی اکثریت کے نزدیک نیم برہنہ کسانوں کے ہنگامے کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی.

اس وقت پنجاب کے مظالم اور خلافت کے معاملات کا ہر طرف چرچا تھا اور ترکِ موالات کی تحریک ہر شخص کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی کیونکہ اس کے ذریعہ سے ان مظالم کے تدارک کی امید تھی. قومی آزادی یا سوراج کے اصل مقصد پر اس وقت زیادہ زور دیا جاتا تھا. گاندھی جی بلند آہنگ اور مبہم مقاصد کو ناپسند کرتے ہیں.

بجائے اس کے وہ کسی معینہ مقصد کے لئے پورا زور لگانے کو ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ پھر بھی سوراج، سیاسی مطلع پر اور لوگوں کے تصورات پر چھایا ہوا تھا۔ اور بے شمار جلسوں اور کانفرنسوں میں اکثر اس کا ذکر کیا جاتا تھا۔

۱۹۲۰ء میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس کلکتے میں ان تمام امور پر غور کرنے خصوصاً ترک موالات کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے منعقد ہوا۔ لالہ لاجپت رائے جو ایک عرصے کی جلاوطنی کے بعد حال ہی میں امریکہ سے واپس آئے تھے۔ اس اجلاس کے صدر تھے۔ انھیں ترک موالات کی یہ نوساختہ تجویز پسند نہ تھی اس لئے وہ اس کے مخالف تھے۔ ہندوستان کی سیاست میں عام طور پر وہ انتہا پسند مانے جاتے تھے لیکن ان کا عام رجحان درحقیقت آئین پرستی اور اعتدال پسندی کی طرف تھا وہ اپنے عقیدے یا پسند کی بنا پر نہیں بلکہ حالات سے مجبور ہو کر بیسویں صدی کے آغاز میں لوکمانیہ تلک اور دوسرے انتہا پسندوں کے دوش بدوش کھڑے ہو گئے تھے۔ انھیں سماجی اور معاشی معاملات سے خاص دلچسپی تھی اور اس خیال کو غیر ممالک کے قیام سے اور تقویت پہنچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی نظر اکثر ہندوستانی لیڈروں کے مقابلے میں زیادہ وسیع تھی۔

ولفرڈ اسکاون بلنٹ نے اپنے "روزنامچے" میں گوکھلے اور لالہ جی سے اپنی سن ۱۹۰۹ء کی ایک ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے ان دونوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ لوگ بہت محتاط ہیں اور حقیقت کا اعتراف کرنے سے جھجکتے ہیں"۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بہت سے ہندوستانی لیڈروں کے مقابلے میں لالہ جی اس معاملے میں زیادہ جری تھے۔ بہرحال بلنٹ کے تاثرات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہماری سیاست اور ہمارے لیڈروں کے مزاج میں کتنی سکینیت تھی۔ اور ایک قابل اور تجربہ کار غیر ملک والے پر ان کا

کیا اثر پڑتا تھا۔ لیکن زمانے نے اب اس مزاج کو بہت بدل دیا تھا۔

ترک موالات کی مخالفت میں وہ تنہا نہ تھے۔ ان کے ساتھ بہت بڑی اور بااثر جماعت تھی۔ در اصل کانگرس کا تمام پرانا قبیلہ گاندھی جی کی ترک موالات کی قرارداد کا مخالف تھا مسٹر سی۔ آر۔ داس ان کی رہبری فرما رہے تھے۔ وہ اس قرارداد کی اصل منشا کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ تو اس سے بھی چار قدم آگے بڑھنے کو تیار تھے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ انھیں نئی آئین ساز مجالس کے بائیکاٹ پر اعتراض تھا۔

پرانے سربرآوردہ لیڈروں میں اس وقت صرف میرے والد گاندھی جی کی حمایت میں تھے۔ ان کے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا جن اسباب کی بنا پر ان کے رفقا اس قرارداد کی مخالفت کر رہے تھے ان کا والد پر کافی اثر تھا۔ وہ بھی ان لوگوں کی طرح ایک منزل موہوم کی طرف نیا قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ کیونکہ اس صورت میں سابقہ حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی لیکن نتیجہ خیز عمل ی طرف وہ فطرتاً کھنچتے تھے۔ اور یہ تجویز گو ان کے خیالات سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہو پھر بھی عملی تجویز تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے خوب سوچ بچار کے ئے قائم کی۔ گاندھی جی اور مسٹر سی۔ آر۔ داس سے ان کی طول طویل بحثیں ہوا رتی تھیں۔ اس زمانے میں مسٹر داس اور والد دونوں ایک بڑے مقدمے میں ریقین کی جانب سے وکیل تھے اس لئے آپس میں ملنے جلنے کا بہت اتفاق ہوتا تھا وہ دونوں اس مسئلے کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے اور نتیجہ پر بھی دونوں ں بہت کم اختلاف تھا۔ لیکن اس ذرا سے اختلاف ہی کی بدولت کانگرس کے اص اجلاس کے موقع پر ایک تو اصل قرارداد کے حامیوں کی صف میں نظر ئے اور دوسرے مخالفوں کی صف میں۔ تین مہینے بعد انھیں ناگپور کانگرس کے قع پر دوبارہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ اب دونوں دوش بدوش کھڑے تھے اور اس

کے بعد یہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔

اس زمانے میں کلکتہ کانگریس کے خاص اجلاس سے پہلے مجھے والد سے کھل کر ملنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا لیکن جب کبھی میں ان سے ملتا تو ہر وقت انھیں اس مسئلے کی فکر میں الجھا ہوا پاتا۔ اس لئے کہ قومی پہلو کے علاوہ اس کا ایک ذاتی پہلو بھی تھا۔ ترک موالات کا مطلب یہ تھا کہ انھیں اپنی وکالت بھی ترک کرنا پڑے گی گویا اپنی سابقہ زندگی کو بالکل خیرباد کہنا اور اسے نئے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ اس میں اپنے پرانے سیاسی رفقا کو، اپنی وکالت کو، اس سماجی زندگی اور اس امیرانہ معاشرت کو جس کے وہ عادی ہو چکے تھے غرض بہت سی چیزوں کو تج دینا ہوگا لیکن ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد کسی شخص کے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مالی حیثیت سے بھی یہ معاملہ کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا کیونکہ ظاہر ہے کہ وکالت کی آمدنی بند ہو جانے پر انھیں اپنے معیار زندگی میں کمی کرنا پڑے گی۔

لیکن ان کی عقل، زبردست خودداری اور فطری تمکنت ان سب کا یہ تقاضا تھا کہ وہ ایک ایک قدم کرکے آگے بڑھتے گئے اور آخرکار دل و جان سے اس نئی تحریک میں شریک ہو گئے۔ پے در پے واقعات کی وجہ سے جن کی انتہا حادثہ پنجاب اور اس کے بعد کے حالات پر ہوئی، ان کا غم و غصہ ضبط کی حد سے گزر چکا تھا۔ انتہائی ظلم و جور کا احساس، قومی ذلت کا صدمہ ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور اظہار کی راہ ڈھونڈھ رہا تھا لیکن وہ جوش کی لہریں نہیں بہے بلکہ جب ان کی عقل نے اور وکالت کے تربیت یافتہ دماغ نے تمام اونچ نیچ سوچ لی تب انھوں نے آخری فیصلہ کیا اور گاندھی جی کے ساتھ ان کی تحریک میں شریک ہو گئے۔

گاندھی جی سے ذاتی طور پر بھی وہ بہت متاثر ہوئے تھے اور اس میں کوئی

شک نہیں کہ ان کے فیصلے میں اس تاثر کو بھی دخل تھا جس شخص سے ان کا دل نہ ملتا اس کے ساتھ ہو کر وہ کسی طرح کام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کی کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ بہرحال گاندھی جی اور والد کا ساتھ ایک اجتماع ضدین تھا۔ ایک طرف تو ایک سنت سادھو۔ ایک دیندار۔ ایک ایسا شخص تھا کہ جس نے اپنی زندگی میں تمام جسمانی لذتوں اور ہیجان پیدا کرنے والی چیزوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور دوسری طرف ایک دنیادار تھا جس نے زندگی اور اس کی عیش و عشرت کا جی بھر کے لطف اٹھایا تھا اور اس کی کبھی پرواہ نہ کی تھی کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تحلیل نفسی کی اصطلاح میں یہ گویا باطن پسند اور ظاہر پسند طبیعتوں کا میل تھا تاہم دونوں کی وابستگیاں اور مقاصد اس حد تک مشترک تھے کہ وہ برابر ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے حتیٰ کہ چند سال بعد جب ان میں سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے اس وقت بھی آپس کی گہری دوستی باقی رہی۔

والد پیٹر نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے "اگرچہ ایک ولی اللہ اور ایک عیش پسند حکیم مختلف سمتوں سے روانہ ہوتے ہیں۔ مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔ ایک کا رجحان مذہب کی طرف ہوتا ہے اور دوسرے کا اس کے خلاف لیکن چونکہ دونوں کی طبیعتیں جوش اور قوت کے لحاظ سے پست فطرت لوگوں سے ممتاز ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جتنا معمولی انسانوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انکی راہ ایک ہو جاتی ہے"

کانگریس کے خاص اجلاس کے بعد کانگریس کی سیاسیات میں گاندھی کا دور شروع ہو گیا جو اب تک چل رہا ہے۔ سوا اس چند سال کے وقفے کے جب گاندھی جی خود پیچھے ہٹ گئے تھے اور انھوں نے دیش بندھو سی۔ آر۔ داس اور میرے والد کی رہبری میں سوراج پارٹی کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا بہرحال گاندھی کے

دور کے شروع ہوتے ہی کانگریس کا رنگ ہی بدل گیا۔ یورپین لباس کہیں نظر نہ آتا تھا۔ ہر طرف صرف کھادی دکھائی دیتی تھی۔ متوسط طبقے کے نیچے درجے کے لوگ اب کانگریس کے نمائندے منتخب ہونے لگے۔ اور انھیں کا رنگ کانگریس پر چھا گیا۔ اب کانگریس کی کارروائی زیادہ تر ہندوستانی میں ہوتی تھی۔ جس صوبے میں جلسہ ہوتا تھا کبھی کبھی وہاں کی زبان سے بھی کام لیا جاتا تھا کیونکہ اکثر نمائندے انگریزی نہیں جانتے تھے اور یہ جذبہ بڑھتا جا رہا تھا کہ ہمیں اپنے قومی کام میں ایک غیر ملکی زبان استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ خاص بات یہ بھی کہ اب کانگریس کے جلسوں میں جان پڑ گئی تھی اور ہر طرف ایک نیا جوش و خروش اور خلوص نظر آتا تھا۔

کانگریس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد گاندھی جی امرت بازار پتریکا کے کہنہ مشق ایڈیٹر شری یت موتی لال گھوش کی مزاج پرسی کو گئے۔ وہ اس وقت بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے، میں بھی ان کے ہمراہ گیا۔ موتی بابو نے گاندھی جی اور ان کی نئی تحریک کو آشیرباد دی اور فرمایا کہ میں اب دوسری دنیا میں جا رہا ہوں۔ یہ میں نہیں جانتا کہ وہ دوسری دنیا کہاں ہے۔ لیکن اتنا اطمینان ضرور ہے کہ اب میں برطانی راج میں نہ ہوں گا۔ کم از کم اس سلطنت سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔

کانگریس سے واپسی پر میں گاندھی جی کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور اور انکے بڑے بھائی "بوڑو داوا" سے ملنے شانتی نکیتن گیا۔ ہم وہاں چند روز رہے۔ مجھے یاد ہے کہ سی۔ ایف۔ انڈریوز نے مجھے چند کتابیں دی تھیں جنھیں میں نے بڑے شوق سے پڑھا اور ان سے بہت متاثر بھی ہوا۔ ان کتابوں کا موضوع افریقہ میں سامراج کا معاشی پہلو تھا۔ ان میں سے ایک کتاب یعنی موریل کی Morell's Blackman's Burden کا مجھ پر خاص طور پر اثر ہوا۔

اسی زمانے میں یا اس کے کچھ عرصے بعد سی۔ ایف۔ انڈریوز نے ہندستان

کی آزادی کی حمایت میں ایک رسالہ لکھا۔ شاید اس کا نام "آزادی اور اس کی فوری ضرورت" تھا۔ یہ ایک نہایت عمدہ مقالہ تھا جو ہندوستان کے متعلق سیلے کی بعض تصانیف کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں آزادی کا دعویٰ اس خوبی کے ساتھ ثابت کیا گیا تھا کہ اس کا جواب ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ رسالہ کیا گویا ہمارے قلب کی گہرائیوں کا آئینہ تھا۔ انڈریوز کی سیدھی سادی اور پر خلوص عبارت میں ہمیں اپنے دلی جذبات اپنی ناتمام آرزوؤں کی تصویر نظر آگئی۔ ان کی یہ تحریر معاشی اصول یا اشتراکیت پر مبنی نہ تھی بلکہ خالص قوم پرستی کے رنگ میں تھی۔ اول سے آخر تک ہندوستان کی روز افزوں ذلت کا احساس، اس سے نجات پانے کی بیتابانہ خواہش کارفرما تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ سی ایف انڈریوز جو ایک غیر ملکی شخص اور حاکم قوم کے فرد تھے کس خوبی سے ہمارے دل کی بات کہہ دی ہے۔ ترک موالات اصل میں یہی چیز تھی جس کے متعلق سیلے نے اب سے بہت دن پہلے کہا تھا "یعنی یہ احساس کہ بدیسی حکمراں قوت کو اس کی حکومت کے قائم رکھنے میں مدد دینا ایک شرمناک فعل ہے"۔ بقول مسٹر انڈریوز "خود انسان کی روح کے اندر جو ہیجان برپا ہوتا ہے بس وہی ایک علاج ہے اس لئے ہندوستان کی روح میں وہ آگ لگا دینے والی قوتیں پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو یہ ہیجان برپا کردیں۔ یہ چیز دوسرے کی عنایات، مراعات، عطیات اور اعلانات سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ تو خود بخود اندر سے پیدا ہونی چاہیئے۔۔۔۔۔۔ انسان کو ناقابل برداشت بوجھ سے دماغی اور روحانی طور پر چھٹکارا پانے میں جو مسرت ہوتی ہے وہی مسرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ اندرونی قوت اب واقعی بھڑک اٹھی ہے یعنی مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے کان میں یہ منتر پھونک دیا ہے کہ آزاد ہو جاؤ" غلام نہ رہو۔ اور ہندوستان کے دل سے لبیک کی آواز آرہی ہے۔ اس

تحریک کے ذریعے سے یکایک اس کی بیڑیاں ڈھیلی ہو گئی ہیں اور آزادی کا راستہ کھل گیا ہے "

آئندہ تین ماہ میں ترک موالات کا بڑھتا ہوا سیلاب سارے ملک میں پھیل گیا۔ نئی کونسلوں کے انتخابات کو بائیکاٹ کرنے کی اپیل اتنی کامیاب رہی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یہ تو نہیں ہو سکا اور نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کونسلوں میں نہ جانے پائے اور نشستیں خالی رہیں کسی کو منتخب کرنے کے لیے چند ووٹ بھی کافی تھے یا اگر ایک شخص بھی رائے دینے نہ جاتا تب بھی بلا مقابلہ انتخاب ہو سکتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ووٹروں کی اکثریت نے ووٹ دینے سے احتراز کیا اور جن لوگوں کو ملک کے پر زور مطالبے کا ذرا بھی لحاظ تھا وہ ممبری کے لیے نہیں کھڑے ہوئے۔ اتفاق سے سر ولنٹائن شیرول انتخاب کے روز الہ آباد ہی میں موجود تھے۔ انھوں نے ان مقامات کا چکر لگایا جہاں ووٹ پڑ رہے تھے۔ بائیکاٹ اتنا مکمل تھا کہ وہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ الہ آباد سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ایک پولنگ اسٹیشن تھا۔ وہاں انھیں معلوم ہوا کہ ایک ووٹر بھی نہیں آیا۔ ہندوستان سے متعلق اپنی ایک کتاب میں انھوں نے اپنے ان مشاہدات کا تذکرہ کیا ہے۔

کانگریس کے کلکتے کے اجلاس میں مسٹر سی۔ آر۔ داس اور ان کے ہم خیال حضرات نے کونسلوں کے بائیکاٹ پر اعتراض کیا تھا لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد وہ کانگریس کے ساتھ رہے۔ جب انتخابات ختم ہو گئے تو یہ اختلاف بھی رفع ہو گیا۔ پھر جب دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تو بہت سے بچھڑے ہوئے کانگریس کے رہنما ترک موالات کے حرکت پر دوبارہ آملے۔ تحریک کی غیر معمولی کامیابی اکثر شک کرنے والوں اور شک کرنے والوں کو خود راہ راست

پہلے آئی۔

لیکن کلکتہ کانگریس کے بعد چند پرانے لیڈر کانگریس سے قطعی طور پر علیحدہ ہوگئے۔ ان میں سر ولعزیز اور مشہور و معروف مسٹر جناح بھی تھے۔ مسز سروجنی نائڈو انھیں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کہتی تھیں اور واقعی انھیں کی کوششوں سے مسلم لیگ کانگریس کے قریب آگئی تھی۔ لیکن ایک تو کانگریس کا دستور اساسی بدل گیا جس کی وجہ سے وہ عوام میں مقبول ہوگئی اور انھیں کی انجمن بن گئی اور دوسرے حکومت سے ترک موالات کرنا۔ یہ چیزیں مسٹر جناح کو پسند نہ آئیں۔ اگرچہ وہ سیاسی وجوہ کی بنا پر ان کی مخالفت کرتے تھے لیکن سیاست کے علاوہ بعض باتیں اور بھی تھیں جن کی وجہ سے وہ کانگریس سے علیحدہ ہوگئے۔ کانگریس میں اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جو سیاسی عقائد کے اعتبار سے ان سے بہت پیچھے تھے۔ لیکن ان کا مزاج اور فطرت کچھ ایسی تھی کہ وہ اس نئی کانگریس کے ساتھ نہ نبھ سکتے تھے۔ وہ کھدر پوش لوگوں میں جو ہندوستانی میں تقریر کرنے پر اصرار کرتے تھے اپنے آپ کو کچھ اجنبی سا محسوس کرتے تھے۔ کانگریس کے باہر عوام کا جوش و خروش انھیں دیوانہ پن معلوم ہوتا تھا۔ ان میں اور عوام میں اتنا ہی فرق تھا جتنا لندن کے کسی بہترین علاقہ (مثلاً سیویلے رو اور باؤنڈ اسٹریٹ) اور ہندوستان کے کسی گاؤں میں ہو۔ ایک مرتبہ نجی طور پر انھوں نے یہ تجویز کی تھی کہ صرف میٹرک پاس لوگوں کو کانگریس میں داخل کیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ سچ مچ ان کا یہ منشا نہ ہو لیکن یہ چیز ان کے عام انداز کے بالکل مطابق تھی۔ غرض وہ کانگریس سے علیحدہ ہوگئے اور ہندوستانی سیاست میں بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے افسوس ہے کہ آگے چل کر "اتحاد کا یہ پرانا پیامبر" "مسلم فرقہ پرستوں کے انتہائی رجعت پسند طبقے سے میل جول رکھنے لگا۔

اعتدال پسند یا لبرل فریق کو کانگریس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ یہ لوگ

صرف کانگریس سے علیحدہ ہی نہیں رہے بلکہ حکومت سے شیر وشکر ہو گئے۔ نئی اصلاحات کے ماتحت انھوں نے وزارتیں اور بڑے بڑے عہدے قبول کر لئے اور ترک موالات اور کانگریس کا مقابلہ کرنے میں حکومت کو پوری مدد دی۔ ان کی تمنا تو پوری ہو چکی تھی، یعنی چند اصلاحات مل گئی تھیں پھر انھیں جد و جہد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سارا ملک تو جوش و خروش سے کھول رہا تھا اور روز بروز انقلاب پسند ہوتا جاتا تھا۔ لیکن یہ لوگ کھلم کھلا انقلاب کے مخالف اور حکومت کے جزو بنتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عوام سے انھیں کوئی لگاؤ نہ رہا اور ان میں یہ عادت پیدا ہو گئی (جو ابتک باقی ہے) کہ وہ ہر مسئلے کو سرکاری نقطۂ نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اب ان پر جماعت کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا بلکہ معدودے چند افراد تھے جو چند بڑے بڑے شہروں میں کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ مسٹر سری نواس شاستری نے برطانوی حکومت کی طرف سے شاہی سفیر بن کر امریکہ اور برطانیہ کی مختلف نو آبادیوں کا دورہ کیا اور ہر جگہ کانگریس اور اپنے ہم وطنوں کو حکومت سے لڑنے پر بہت بُرا بھلا کہا۔

ان تمام "کامیابیوں" کے باوجود لبرل کچھ خوش نہ تھے۔ اپنے بھائیوں سے الگ تھلگ رہنے میں انسان کو کوئی مسرت نہیں ہوتی اور یہ احساس کہ دنیا میری مخالف ہے، چاہے اس مخالفت کو وہ دیکھ یا سن نہ سکے ہر شخص کے لئے سوہان روح ہو جاتا ہے۔ عوام کی تحریک میں اپنے مخالفوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی لیکن ترک موالات کی تحریک میں گاندھی جی کی پیہم تنبیہہ اور تاکید کی وجہ مخالفوں کے ساتھ عوام کا رویہ نسبتاً بہت نرم اور شریفانہ تھا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس وقت کی عام فضا سے اگر حامیوں کے دل گرماتے تھے تو مخالف خود بخود سہمے جا رہے تھے۔ عام ہیجان اور انقلابی تحریکوں کا یہی دو طرفہ اثر ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ان سے عوام اور ان کے حامیوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور

اُن کی شخصیتیں اُبھرتی ہیں اور دوسری طرف مخالفوں کا خود بخود دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ قدرتی طور پر دب جاتے ہیں)۔

اسی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ترکِ موالات کی تحریک میں رواداری کا مادہ نہیں ہے اور یہ ملک میں رائے اور عمل کی ایک بے جان یکسانی پیدا کرنی چاہتی ہے۔ یہ اعتراض صحیح تھا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ ترکِ موالات عوام کی تحریک تھی اور ایک عظیم الشان ہستی اس کی رہبری کر رہی تھی جس پر ہندوستان کے لاکھوں افراد کو اندھا دُھند اعتقاد تھا۔ اس سے زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ عوام پر اس تحریک کا غیر معمولی اثر تھا۔ لوگوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی بیڑیاں کٹ گئی ہیں۔ ان کے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا ہے اور ان کی رگوں میں آزادی کا خون دوڑنے لگا ہے وہ خوف جو انھیں کچلے ڈالتا تھا کافور ہو گیا اور وہ بھی اب سینہ نکال کر اور گردن اُٹھا کر چلنے لگے۔ دیہات کے بازاروں میں بھی عام لوگوں کی زبان پر کانگرس، سوراج (کیونکہ ناگپور کانگرس نے یہ طے کر دیا تھا کہ سوراج ہماری منزل مقصود ہے) پنجاب کے مظالم اور خلافت کے چرچے رہتے تھے لیکن دیہات میں لفظ "خلافت" کے بہت ہی عجیب معنی سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ لفظ "خلاف" سے بنا ہے جس کے معنی مخالفت کے ہیں گویا خلافت سے مطلب ہے "حکومت کی مخالفت"۔ یہ لوگ اپنی معاشی مشکلات پر بھی خاص طور سے گفتگو کرتے تھے۔ غرضکہ بیشمار جلسوں اور کانفرنسوں نے ان کی سیاسی معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر دیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں ہم میں سے اکثر لوگ جو کانگرس کا کام کیا کرتے تھے ایک طرح کے نشے میں چور رہتے تھے۔ اس وقت ہم جوش، ہمت اور زندہ دلی میں سرشار تھے ہمیں وہ مسرت محسوس ہوتی تھی جو کسی شخص کو اپنے مذہب پر قربان ہونے میں ہوتی ہے۔ شک یا پس و پیش ہمارے پاس نہ پھٹکتا تھا۔ ہمیں اپنا راستہ بالکل

صاف نظر آرہا تھا اور ہم بڑھتے چلے جاتے تھے۔ دوسروں کا جوش ہمیں آگے بڑھاتا تھا اور ہم دوسروں کو آگے بڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں ہم نے اتنی سخت محنت کی کہ شاید اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ حکومت سے جنگ کا زمانہ نزدیک آرہا ہے اس لئے ہم یہ چاہتے تھے کہ اپنی گرفتاری سے پہلے جو کچھ ہو سکے وہ کر ڈالیں۔

اس کے علاوہ ہم میں آزادی کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور اس آزادی پہ ہمیں ناز تھا۔ اب وہ مایوسی اور سہم کی کیفیت بھی باقی نہیں رہی۔ اب تو وہ سرگوشیاں تھیں اور نہ وہ پہلو بچا بچا کر قانونی الفاظ میں گفتگو کرنا۔ جو ہمارے دل میں ہوتا تھا ڈنکے کی چوٹ کہتے تھے۔ کیونکہ ہمیں ڈر کا ہے کا تھا؟ یہی نہ کہ جیل بھیج دیے جائیں گے۔ تو اس کے لئے ہم خود ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس سے تو ہمارے مقصد کو اور تقویت پہنچتی تھی۔ ہمارے پیچھے خفیہ پولیس کے سینکڑوں آدمی لگے رہتے تھے۔ ان بیچاروں کی حالت قابل رحم ہو گئی کیونکہ ہماری کوئی بات راز ہی نہیں تھی جسے وہ معلوم کرتے۔ ہم جو کچھ کرتے تھے وہ ہمیشہ کھلم کھلا کرتے تھے۔

ہمیں اس نتیجہ خیز کام سے بڑا اطمینان حاصل ہوتا تھا کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی کایا پلٹ گئی ہے اور آزادی کے دن بہت قریب آ گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ خوش گوار احساس بھی تھا کہ ہم اپنے مقصد اور طریق کار دونوں کے لحاظ سے اپنے حریفوں سے اخلاقی حیثیت سے برتر ہیں۔ ہمیں اپنے رہنما اور ان کے طریق کار پہ ناز تھا اور کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو بھی رہنما سمجھنے لگتے تھے۔ عین طوفان میں بلکہ خود ہی طوفان اٹھاتے ہوئے ہمیں پورا سکون اور اطمینان قلب حاصل تھا۔

اِدھر ہمارا ضبط اور اعتماد نفس بڑھتا جاتا تھا اور اُدھر حکومت کی جھنجھلاہٹ

میں ابتری پھیل رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی وہ پرانی دنیا جو وہ دیکھتی چلی آتی تھی بدل رہی ہے۔ اسلئے اس میں تشدد کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کی خود اعتمادی، ہچونی اور رعب (جس پہ یہاں برطانی حکومت قائم ہے) دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو رہا تھا۔ تھوڑے سے بہت تشدد سے تحریک کو اور تقویت پہنچی تھی۔ چنانچہ حکومت نے بہت عرصہ تک پس و پیش کرنے کے بعد بڑے بڑے لیڈروں پر ہاتھ ڈالا کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو۔ ہندوستانی فوج قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ پولیس احکام کی تعمیل کرے گی یا نہیں؟ اسی کشمکش میں وہ مبتلا تھی۔ خود لارڈ ریڈنگ نے اسی لئے ہندوستان دسمبر ۱۹۲۱ء میں کہا تھا کہ حکومت "عجب کشمکش و پیچ میں" ہے۔

۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں صوبجات متحدہ کی حکومت نے ضلع کے افسروں کو ایک بہت دلچسپ گشتی چٹھی بھیجی۔ یہ چٹھی بعد میں اخباروں میں بھی شائع ہوئی اس میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ پیشقدمی ہمیشہ دشمن (یعنی کانگریس) ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور یہ بڑی بری بات ہے۔ اس کے بعد پیش قدمی کی مختلف صورتیں تجویز کی تھیں۔ جس میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ "امن سبھائیں" قائم کی جائیں۔ ان سبھاؤں کی مہمل اور مضحکہ خیز حیثیت سب پر ظاہر ہے۔ خیال یہ ہے کہ ترک موالات کا مقابلہ کرنے کا یہ خاص طریقہ ہمارے لبرل وزرا کی تجویز پر اختیار کیا گیا تھا۔

اس زمانے میں اکثر انگریز افسروں کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ ان کے دل و دماغ پر بڑا زور پڑ رہا تھا۔ ملک میں مخالفت اور حکم عدولی کا جذبہ برابر بڑھ رہا تھا، جو سرکاری طبقوں پر ڈراؤنی اور کالی کالی گھٹاؤں کی طرح چھا گیا تھا اور چونکہ اس میں تشدد کا شائبہ بھی نہ تھا اس لئے افسروں کو جبر و تشدد کا کوئی

ذریعہ اور کوئی بہانہ نہ ملتا تھا۔ انگریز عام طور پر اس کے قائل نہ تھے کہ ہندوستانی سچ مچ عدم تشدد کے حامی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب دھوکا اور فریب ہے کسی پوشیدہ سازش کو چھپانے کے لئے ایک پردہ ہے جو کسی دن یکایک ہٹ جائیگا اور ہندوستان میں زبردست غدر مچ جائیگا۔ بچپن ہی سے ان کے خمیر میں یہ عقیدہ داخل ہے کہ مشرق ایک پُراسرار جگہ ہے اور اس کے بازاروں اور تنگ و تاریک گلیوں میں ہمیشہ سازشیں ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے اس طلسماتی سرزمین میں انگریز کسی معاملے کو بھید سے خالی سمجھ ہی نہ سکتے تھے دراصل وہ کبھی یہ کوشش ہی نہیں کرتے کہ مشرق کے سیدھے سچے انسانوں کو سمجھیں وہ ان سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ جاسوسوں اور خفیہ گروہوں کی قصے کہانیوں کو پڑھ کر ان کے متعلق رائے قائم کرتا ہے اور پھر وحشت کے مارے پریشان ہو جاتا ہے۔ یہی حال اپریل سنہ ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں ہوا۔ یکایک افسروں پر خصوصاً اور تمام انگریزوں پر عموماً ایک خوف طاری ہو گیا۔ انھیں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آنے لگا اور انھوں نے خواہ مخواہ یہ سمجھ لیا کہ زبردست بلوہ یا دوسرا غدر ہونے والا ہے جس میں انگریزوں کا قتل عام ہوگا چنانچہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح بچا لینے کے فطری مگر اندھا دھند جوش میں انھوں نے وہ خوفناک حرکتیں کیں جو امرتسر کے "جلیانوالہ باغ" اور "کرالنگ لین" کے نام سے ضرب المثل بن گئی ہیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء کا پورا سال بڑی پریشانی کا زمانہ تھا اور اس میں سرکاری ملازموں کو دق اور بدحواس کرنے کا کافی سامان موجود تھا۔ اصلی مشکلیں بھی کچھ کم نہ تھیں مگر خیالی مشکلیں ان سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہاں میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے اس ذہنی خلفشار کا پوری طرح اندازہ ہو جائے گا۔ میری بہن سروپ کی شادی ۱۰ مئی سنہ ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں ہونے والی تھی۔ یہ تاریخ حسب رواج سمت کی شبھ لگن دیکھ کر اس کے مطابق مقرر کی گئی تھی۔ گاندھی جی اور بہت سے مقتدر کانگریسی لیڈر

جن میں علی برادران بھی شامل تھے، اس شادی میں مدعو تھے اور ان کی سہولت کے خیال سے اسی زمانے میں الہ آباد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ایک جلسہ بھی مقرر کر دیا گیا تھا۔ مقامی کانگرسی کارکن اپنے مشہور و معروف لیڈروں کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے بڑے پیمانے پہ ضلع کی ایک کانفرنس کا انتظام کیا اور امید تھی کہ کانفرنس میں قرب و جوار کے کسان بھی کافی تعداد میں شریک ہوں گے۔

ان سیاسی جلسوں کی وجہ سے الہ آباد میں بڑی چہل پہل اور جوش و خروش تھا۔ اس سے بعض لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دن مجھے اپنے ایک بیرسٹر دوست سے معلوم ہوا کہ بہت سے انگریز تو بالکل بدحواس ہو گئے تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ شہر میں کسی وقت یکایک بغاوت ہو جائے گی اس لئے انھیں اپنے ہندوستانی ملازموں کا اعتبار جاتا رہا تھا اور ہر وقت اپنی جیبوں میں بھرے ہوئے پستول لئے پھرتے تھے۔ نجی طور پہ یہ بھی معلوم ہوا کہ الہ آباد کے قلعے میں ہر طرح کا انتظام کر دیا گیا تھا تاکہ اگر ضرورت پڑے تو انگریزوں کی ساری آبادی وہاں منتقل ہو جائے۔ مجھے سخت حیرت تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ الہ آباد جیسے اونگھنے سونے اور پُرامن شہر میں اس قسم کی بغاوت ہونے کا کسی کو خیال ہی کیونکر پیدا ہوا خصوصاً اس حالت میں جبکہ امن کا سب سے بڑا علم بردار وہاں آنے والا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی کی تاریخ (جو اتفاقاً میری بہن کی شادی کے لئے مقرر کی گئی تھی) میرٹھ میں ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہونے کی تاریخ تھی اور انگریزوں کا خیال تھا کہ الہ آباد میں اس کی یادگار منائی جائے گی۔

۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی تھی اس لئے بہت سے مولوی اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا بھی سیاسی جنگ میں نمایاں حصہ

لینے لگے تھے۔ ان کی وجہ سے تحریک میں ایک خاص مذہبی رنگ پیدا ہو گیا تھا اور مسلمان عام طور پر اس مذہبی سیاست سے بہت متاثر تھے۔ بہت سے مغرب زدہ مسلمانوں نے جنھیں اب تک مذہب سے کوئی مس نہ تھا داڑھیاں رکھ لی تھیں اور احکام شرع کی سختی سے پابندی کرنے لگے تھے۔ مولویوں کا اثر اور اقتدار جدید خیالات اور مغربی تہذیب کی ترقی کی وجہ سے رفتہ رفتہ گھٹ رہا تھا لیکن اس تحریک کے زمانے میں وہ پھر بڑھنا شروع ہو گیا اور مولوی مسلم قوم پر پھر حاوی ہو گئے۔ علی برادران خود مذہبی ذہنیت کے آدمی تھے اس لیے ان کی ذات سے بھی اسے فروغ ہوا۔ اور گاندھی جی کا بھی اس میں کافی ہاتھ تھا کیونکہ وہ بھی مولویوں اور عالموں کی انتہائی عزت کرتے تھے۔

دراصل گاندھی جی تحریک کے مذہبی اور روحانی پہلو پر برابر زور دیتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب کسی اذعانی عقیدے کا نام نہیں تھا مگر وہ ایک خاص مذہبی تصور حیات کے قائل تھے جس کا تمام تحریک پر زبردست اثر پڑا اور عوام کے لیے یہ احیائے مذہب کی تحریک بن گئی۔ اکثر کانگریسی کارکن فطرتاً اپنے رہنما کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور انھیں کے الفاظ بھی دہراتے تھے لیکن ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی کے خاص خاص رفیق مثلاً میرے والد، دیش بندھو داس، لالہ لاجپت رائے وغیرہ مذہبی لوگ نہ تھے اور وہ سیاسی مسائل کو صرف سیاسی نظر سے دیکھتے تھے لیکن ان کے اقوال کے مقابلے میں ان کے افعال کا اثر زیادہ پڑتا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ انھوں نے ان تمام چیزوں کو جن کی دنیا تمنا کرتی ہے تج دیا ہے اور نہایت سادہ زندگی اختیار کر لی ہے۔ لوگوں کے نزدیک یہ ان کی مذہبیت کی دلیل تھی اور اس سے احیائے مذہب کا یہ رنگ اور پکا ہوا۔

بعض اوقات میں پریشان ہو جاتا تھا کہ سیاست میں مذہب کو اتنا

دخل کیوں ہے؟ مجھے یہ بات بالکل پسند نہ تھی مولوی مولانا اور سوامی جو کچھ اپنی تقریریں میں کہتے تھے اسے سن کر مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا۔ مجھے ان کی تاریخ، جغرافیات اور اقتصادیات سب غلط معلوم ہوتی تھی۔ اور ہر چیز کو مذہبی رنگ دے دینے سے روشن خیالی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ گاندھی جی کے بعض بعض جملے بھی مجھے گراں گزرتے تھے۔ مثلاً وہ اس زریں زمانے کو جو پھر لوٹ آنے والا تھا اکثر "رام راج" کے نام سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ لیکن میں بے بس تھا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیتا تھا کہ گاندھی جی یہ الفاظ صرف اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ لوگ انھیں جانتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ درحقیقت انھیں لوگوں کے دل کی تہ تک پہنچنے کا عجیب ملکہ حاصل تھا۔

لیکن میں نے ان چیزوں کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ مجھے خود اتنی مصروفیت تھی اور تحریک اس زور شور سے بڑھ رہی تھی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دینے کا وقت ہی نہ تھا۔ ایک عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں اس لئے جب تک ہم صحیح راستے سے نہ بھٹکیں چند رجعت پسندوں کی موجودگی سے کیا حرج تھا۔

رہے گاندھی جی تو ان کا سمجھنا بہت ہی مشکل تھا۔ کبھی کبھی ان کی گفتگو اس قسم کی ہوتی تھی کہ عام طور پر ایسے خیالات کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن ہمیں یقین تھا کہ وہ بہت بڑے اور بے مثل انسان اور عظیم الشان رہنما ہیں اس لئے ہم ان پر ایمان لے آئے اور انھیں سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ اکثر ہم آپس میں ان کی انوکھی باتوں اور عجیب و غریب خیالات پر تبصرہ کیا کرتے تھے اور ہنسی میں کہتے تھے کہ سوراج کے بعد اس قسم کی حرکتوں کی ہمت افزائی نہ ہونا چاہیے۔

لیکن ہم میں سے بعض لوگ سیاسی معاملات اور دوسری چیزوں میں ان سے اس قدر متاثر تھے کہ مذہب کے معاملے میں ان کے اثر سے آزاد نہیں رہ سکتے تھے

جہاں براہ راست چلنے سے کام نہیں نکلتا وہاں اکثر پھیر کھا کر ادھر ادھر سے بڑھنے میں قلعہ کی تسخیر میں کامیابی ہوتی ہے۔ یہی صورت میرے ساتھ ہوئی۔ مذہب کی ظاہری رسوم کا مجھ پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس کے علاوہ نام نہاد مذہبی پیشوا مذہب کے نام پر لوگوں کو جو لوٹتے تھے اس سے مجھے سخت نفرت تھی۔ تاہم میری مخالفت کچھ نرم پڑ گئی۔ بچپن سے اب تک کبھی مجھ پر اتنا مذہبی رنگ نہ چڑھا تھا جتنا سنہ ۱۹۲۱ء میں چڑھا۔ اس پر بھی میں مذہب سے زیادہ قریب نہ ہو سکا۔

مجھے اپنی تحریک اور ستیا گرہ کا اخلاقی پہلو بہت پسند تھا۔ عدم تشدد کے اصول پر نہ کبھی میں پورا ایمان لایا اور نہ مستقل طور پر اسے تسلیم کیا لیکن میں اس کی طرف روز بروز کھنچتا جاتا تھا اور یہ خیال قائم ہوتا جاتا تھا کہ اس وقت ہندوستان میں ہماری حالت زار اور ہمارے عقائد و روایات کے لحاظ سے یہ بہترین حکمت عملی ہے۔ سیاست کو روحانیت میں سمو دینے کو (یہ اصطلاح مذہب کے تنگ مفہوم میں استعمال نہیں کی گئی ہے) میں اچھی نظر سے دیکھتا تھا۔ اچھے مقصد کو اچھے ہی ذرائع زیب دیتے ہیں۔ یہ نہ صرف اخلاقی حیثیت سے ایک اچھا اصول تھا بلکہ معقول اور عملی اعتبار سے صحیح بھی تھا۔ کیونکہ بُرے اور غلط ذرائع مقصد کو اُلٹا نقصان پہنچاتے ہیں اور نئی نئی پیچیدگیاں اور مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نہایت ہی نازیبا اور افراد یا قوم کی خودداری سے فروتر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نامناسب ذرائع استعمال کرے اور کیچڑ میں سے ہو کر منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ آلودگی سے کیونکر دامن بچا سکتا ہے؟ اگر ہم جھک جائیں یا رینگنے لگیں تو پھر ہم سر اٹھا کر تیز تیز کیسے چل سکتے ہیں۔

یہ تھے اس وقت میرے خیالات۔ ترک موالات کی تحریک سے میری دلی مراد بر آئی تھی۔ یعنی میں قومی آزادی کا خواہاں تھا اور میرا خیال تھا کہ اس تحریک

کے ذریعہ سے غریبوں کو لوٹنا بند ہو جائے گا۔ اس میں جو ذرائع استعمال کئے جاتے
تھے ان سے میرے اخلاقی جذبے کو تسکین ہوتی تھی اور مجھ میں شخصی آزادی کا
ساس پیدا ہوتا تھا۔ یہ سکون و اطمینان اتنا زبردست تھا کہ مجھے ناکامی کی
ی کوئی پروا نہ تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ ناکامیاں محض عارضی ہوں گی۔
ھگوت گیتا کے مابعد الطبیعی مضامین کو نہ تو میں سمجھتا تھا اور نہ اس طرف کچھ
بت ہی تھی۔ البتہ میں ان اشلوکوں کو اکثر پڑھا کرتا تھا جو گاندھی جی کے
شرم میں پرارتھنا کے وقت پڑھے جاتے تھے۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ انسان کو
پنے مقصد میں نہایت پرسکون، مطمئن اور مستقل ہونا چاہیئے۔ اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے
ور نتیجے کے پیچھے سرگرداں نہ پھرنا چاہیئے۔ چونکہ میں خود بہت پرسکون نہ تھا
شاید اسی لئے اس نصیحت کا مجھ پر بہت اثر ہوتا تھا۔

(۱۱)

سنہ ۱۹۲۱ء اور میری پہلی جیل یاترا

سنہ ۱۹۲۱ء ہم لوگوں کے لئے غیر معمولی سال تھا۔ اس زمانے میں قوم پرستی سیاسیات، مذہب، باطنیت اور جنون کا ایک عجیب معجون مرکب بن گیا۔ اُدھر کسانوں کی تحریک چل رہی تھی اور بڑے شہروں میں مزدوروں کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ قوم پرستی اور ایک مبہم مگر گہری تصور پرستی، بے چینی کے ان سب عناصر کو جن میں سے بعض ایک دوسرے کے مخالف تھے متحد کرنا چاہتی تھی اور اسے اس میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ یہ قوم پرستی خود بھی ایک مرکب قوت تھی۔ اس میں تین اجزا الگ الگ نظر آرہے تھے۔ یعنی ہندو قوم پرستی، مسلم قوم پرستی (جسکی دلچسپی ایک حد تک ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک سے وابستہ تھی) اور ہندوستانی قوم پرستی جو مقتضائے وقت سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی۔ عارضی طور پر یہ تینوں قوتیں مل جل گئی تھیں اور ساتھ ساتھ کام کر رہی تھیں۔ ہر جگہ "ہندو مسلمان کی جے" کے نعرے گونج رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ گاندھی جی نے ان تمام فرقوں اور جماعتوں پر نہ جانے کیا جادو کر دیا کہ یہ رنگ برنگ کا مجمع اکٹھا ہو کر ایک ہی طرف جھک پڑا۔ وہ حقیقت میں "لوگوں کی مخلوط خواہشوں کا مظہر بن گئے تھے (یہ فقرہ ایک دوسرے لیڈر کے لئے استعمال کیا گیا تھا)

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ لوگوں کے اس جوش و خروش میں بدیشی حکمرانوں سے نفرت کا جذبہ نسبتاً بہت کم پایا جاتا تھا۔ قوم پرستی اصل

ہیں ایک مخالفانہ جذبہ ہے۔ دوسری قوموں سے نفرت اور بیزاری اس کی غذا ہے خصوصاً غلام ملک کی قوم پرستی تو سراسر بدیسی حکمرانوں سے نفرت کے جذبے پر منحصر ہے۔ ہندوستان میں بھی سنہ ۱۹۲۱ء میں برطانیہ سے نفرت اور بیزاری موجود تھی، لیکن دوسرے غلام ملکوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ سچ پوچھیے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی نے عدم تشدد پر غیر معمولی زور دیا تھا۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ تحریک کے شروع ہوتے ہی لوگوں میں آزادی اور قوت کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور انہیں یقین تھا کہ منزل مقصود ہم سے بہت قریب ہے اس لئے وہ سوچتے تھے کہ جب کام اتنی اچھی طرح چل رہا ہے اور کامیابی بالکل یقینی ہے تو نفرت اور غصہ کی ضرورت ہی کیا ہے یا احساس قوت نے ہم میں فراخ دلی پیدا کر دی تھی۔

مگر ہمارا دل اپنے ان معدودے چند ہم وطنوں سے صاف نہ تھا جو ہمارے حریفوں سے مل کر قومی تحریک کی مخالفت کر رہے تھے گو ہم نے اپنے طرز عمل میں بہت احتیاط سے کام لیا اور اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ان کے مقابلے میں نفرت یا غصے کا کوئی سوال نہیں تھا اس لئے کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور ہم انہیں آسانی سے نظر انداز کر سکتے تھے، البتہ ان کی کمزوری، ابن الوقتی اور قوم فروشی کو دیکھ کر ہمارے دل میں حقارت کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا تھا۔

بہرحال ہم بے سوچے سمجھے زور شور سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سفر کا سرور ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا، مگر منزل مقصود کا کوئی واضح تصور ہمارے سامنے نہیں تھا۔ اب یہ خیال کر کے حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے کس طرح تحریک کے نظری پہلو یعنی اس کے فلسفے اور مقصد کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ ہم سب سوراج سوراج پکارتے تھے لیکن اس لفظ کا مفہوم ہر شخص اپنے خیال کے مطابق الگ الگ سمجھتا تھا اکثر نوجوانوں کے نزدیک اس کا مفہوم کامل سیاسی آزادی اور جمہوری طرز حکومت تھا اور

ہم اپنی تقریروں میں اس کا صاف صاف اظہار بھی کرتے تھے ہم میں سے بہت سے یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس سے لازمی طور پر اس بوجھ میں کمی ہو جائے گی جو کسانوں اور مزدوروں کے طبقے کو کچلے ڈالتا ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ ہمارے اکثر لیڈر سوراج کا مفہوم مکمل آزادی سے بہت کم سمجھتے تھے۔ گاندھی جی خود اس معاملے میں بڑے مزے کی گول مول باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس پر وضاحت سے غور کیا جائے۔ مگر ان کی مبہم گفتگو سے بھی یہ صاف طور پر ظاہر تھا کہ وہ غریبوں کے حامی ہیں اور اس بات سے ہم میں سے اکثر کو بڑی تسکین ہوتی تھی اگرچہ اسی کے ساتھ وہ امیروں کو بھی بہت اطمینان دلاتے تھے۔ گاندھی جی کسی مسئلے کو عقلی طور پر حل کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ سیرت اور پرہیزگاری پر زور دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں ہندوستانیوں میں محکم ارادہ اور مضبوط سیرت پیدا کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی لیکن بہت ایسے بھی تھے جن میں نہ محکم ارادہ پیدا ہوا اور نہ مضبوط سیرت بلکہ انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ ڈھیلا ڈھالا جسم اور بے رونق چہرہ پرہیزگاری کی علامت ہے۔

لوگوں میں جو غیر معمولی قوت اور چستی پیدا ہو گئی تھی اسے دیکھ کر ہمارا دل اعتماد نفس کے جذبے سے معمور تھا۔ یہ سست، پست اور منتشر جماعت یکایک سینہ تان کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگی اور منضبط اور متحدہ تحریک میں جو ملک میں اس سرے سے اس سرے تک اٹھی تھی، شریک ہو گئی۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ جوش عمل بجائے خود ان میں ایسی قوت پیدا کر دے گا جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ اس لئے ہمیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ عمل کی تہ میں کوئی خیال بھی ہونا چاہیئے ہم نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا کہ صحیح تخیل اور منزل مقصود کے تعین کے بغیر عوام کا یہ سارا جوش و خروش دھواں بن کر اڑ جائے گا۔ ہماری تحریک میں

ایک اصلاحی عنصر تھا وہ ہمیں کسی حد تک آگے بڑھائے جا رہا تھا۔ ہمیں یہ زعم تھا کہ عدم تشدد جو سیاسی اور معاشی تحریکوں کے لئے اور مظالم کا تدارک کرنے کے لئے سب سے کارگر چیز ہے، ایک نیا پیام ہے جو ہم ساری دنیا کو دے رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہم اور سب قوموں کی طرح اس فریب نفس کا شکار ہو گئے کہ ہم ایک برگزیدہ قوم ہیں۔ عدم تشدد کو ہم جنگ و جدال کا اخلاقی بدل سمجھتے تھے اور اسی کے ساتھ وہ ایک موثر حربہ بھی تھا مگر غالباً ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جو مشنری اور جدید تہذیب کے متعلق گاندھی جی کے پرانے نظریوں کو تسلیم کرتے ہوں۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ خود بھی انھیں ناقابل عمل اور جدید حالات کے لئے ناموزوں سمجھتے ہیں۔ بہرحال ہم میں سے اکثر جدید تہذیب کے کارناموں کو ٹھکرانے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ہندوستان کے حالات کے مطابق ان میں مناسب ترمیم کی ضرورت سمجھتے ہوں۔ مجھے تو بڑی مشینیں اور تیز رفتار سواریاں بہت پسند ہیں، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی کے خیالات کا بہت سے لوگوں پر اثر پڑا اور وہ مشینری اور اس کے استعمال کے نتائج پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ گویا صورت یہ تھی کہ بعض لوگوں کی نظر مستقبل پر تھی اور بعض کی ماضی پر مگر لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس متحدہ کوشش کو جو وہ کر رہے تھے، مفید سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ ایثار اور قربانی کے لئے آسانی سے تیار ہو گئے۔

میں اور میری طرح اور بہت سے لوگ اس تحریک میں محو ہو کر رہ گئے۔ میں نے اپنی تمام پرانی دلچسپیاں اور تعلقات، پرانے دوستوں کی صحبت، کتب بینی غرض سب کچھ ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ اپنے کام کی خبروں کے سوا اخبار تک پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس وقت تک مجھے تازہ ترین مطبوعات پڑھنے کا شوق تھا۔ اور میں کوشش کرتا تھا کہ واقعات عالم سے باخبر رہوں لیکن اب اس کے لئے وقت کہاں تھا

آتا؟ باوجود اس محبت کے جو مجھے اپنے خاندان سے تھی، میں نے اپنے سب عزیز دل یہاں تک کہ اپنی بیوی اور لڑکی کو بھی بھلا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے ایک عرصے کے بعد ہوا کہ اس زمانہ میں ان لوگوں کو مجھ سے کتنی تکلیف پہنچی ہوگی اور میری بیوی نے کس قدر صبر و تحمل سے کام لیا۔ میں دن رات دفتروں، کمیٹیوں اور جلسوں میں رہا کرتا تھا۔ ان دنوں دیہات جانے کا زور تھا اور ہم کھیتوں ہی کھیتوں میلوں پیدل چلا کرتے تھے اور دور دور پہنچ کر کسانوں کے جلسوں میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ اب مجھے اس جوش کا احساس ہوا جو مجمع میں جا کر پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوا کہ مجھ میں لوگوں پر اثر ڈالنے کی قوت ہے۔ میں مجمع کی نفسیات کو تھوڑا بہت سمجھنے لگا اور اس فرق سے واقف ہو گیا جو شہر والوں اور دیہاتیوں کی ذہنیت میں ہوتا ہے۔ مجھے بڑے بڑے جلسوں کے گرد و غبار، ریل پیل، دھکم دھکا میں لطف آنے لگا۔ البتہ کبھی کبھی ان کی بدنظمی سے مجھے غصہ آ جاتا تھا۔ اس کے بعد بعض اوقات مجھے مخالف اور برہم مجمع سے بھی سابقہ پڑا جو اس قدر برافروختہ ہوتا تھا کہ ذرا سی چنگاری آگ لگا دینے کو کافی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں نے یہ اندازہ کیا کہ میرا ابتدائی تجربہ اور وہ اعتماد نفس جو اس کی وجہ سے مجھ میں پیدا ہو گیا تھا بہت کام آیا۔ میں نے ہمیشہ لوگوں پر بھروسہ کیا اور مجمع کے بیچ میں دڑاتا چلا گیا اب تک وہ مجھ سے ہمیشہ بڑے اخلاق اور عزت سے پیش آئے ہیں چاہے انھیں میری رائے سے اتفاق نہ بھی ہو لیکن مجمع کا کیا اعتبار۔ ممکن ہے آئندہ مجھے تلخ تجربے پیش آئیں۔ مجھے مجمع سے اور مجمع کو مجھ سے انس ہو گیا لیکن میں نے کبھی اپنی ہستی کو اس میں گم نہیں ہونے دیا ہمیشہ اپنے آپ کو الگ تھلگ کھا اپنے خاص زاویہ نگاہ سے میں اس پر تنقیدانہ نظر ڈالتا تھا اور ہمیشہ تعجب کیا کرتا تھا کہ اگرچہ میں ان ہزاروں افراد سے جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، عادات و اطوار، جذبات و خواہشات، ذہنی اور روحانی نظریات غرض ہر چیز میں بالکل مختلف ہوں، پھر بھی وہ مجھ سے خوش ہیں اور کسی حد تک اعتماد

بھی کرتے ہیں، کیا اس کی یہ وجہ تھی کہ انھوں نے مجھے کچھ سے کچھ سمجھ لیا تھا؟ کیا مجھے میرے اصلی رنگ میں دیکھنے کے بعد بھی وہ درگذر سے کام لیں گے؟ میں نے صاف گوئی برتی اور ان کے سامنے سچی بات کہنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ اکثر میں نے انھیں کھری کھری سنائیں، اور ان کے توہمات اور رسم و رواج پر لعن طعن کی۔ پھر بھی وہ مجھ سے بیزار نہیں ہوئے۔ لیکن میرے دل میں یہ خیال ہمیشہ کھٹکتا رہا کہ وہ میری ذات سے جیسی وہ واقعی ہے محبت نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس خوشنما تصور سے محبت کرتے ہیں جو انھوں نے میرے متعلق اپنے ذہن میں قائم کر لیا ہے۔ لیکن یہ جھوٹی مورت کب قائم رہ سکتی ہے۔ اور کیوں قائم رہنے دی جائے؟ پھر جب یہ مورت پاش پاش ہو جائے گی اور حقیقت کھل جائے گی تو کیا ہوگا؟

مجھ میں خود پسندی کا عیب ہے لیکن ان بھولے بھالے لوگوں کے سامنے خود پسندی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ان میں اس بناوٹ اور اوچھے پن کا شائبہ بھی نہیں ہے جو اکثر ہمارے اوسط طبقے کے لوگوں میں، جنھیں ان سے برتر ہونے کا دعویٰ ہے پائی جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بیچارے عام طور پر بیچیں اور انفرادی طور پر نہایت غیر دلچسپ ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان پر بڑا ترس آتا ہے، اور اس مصیبت کو دیکھ کر جو ان کے سروں پر منڈلاتی رہتی ہے، بہت دکھ ہوتا ہے۔

لیکن ہماری کانفرنسوں کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ یہاں ہمارے چیدہ کارکن (جن میں میں بھی شامل تھا) پلیٹ فارم پر طرح طرح کے کرتب دکھاتے تھے۔ ہمارے انداز میں بناوٹ کی اور ہماری دھواں دھار تقریروں میں اوچھے پن کی کمی نہ تھی۔ یہ عیب ہم میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی حد تک موجود تھا۔ لیکن چھوٹے چھوٹے خلافتی لیڈر شاید اس معاملے میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ کسی بڑے مجمع کے سامنے پلیٹ فارم پر فطری انداز قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے اور ہم میں سے اکثر کو اتنی زیادہ شہرت حاصل کرنے

کا یہ پہلا ہی اتفاق تھا۔ اس لئے ہم اپنی وہ ہیئت بنا لیتے تھے جو ہمارے نزدیک لیڈروں کی ہونی چاہیئے۔ یعنی ایک غور و فکر اور سنجیدگی کی شان جس میں ہنسی مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، یہاں تک کہ مسکراتے وقت بھی ہمیں یہ خیال رہتا تھا کہ ہزاروں آنکھیں ہم پر لگی ہوئی ہیں اور اس سے متاثر ہو کر ہم طرح طرح کی مضحک حرکتیں کیا کرتے تھے۔ ہماری تقریریں اکثر بہت زوردار اور جوشیلی لیکن اتنی ہی مہمل اور بے معنی بھی ہوتی تھیں۔ دوسروں کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھنا بہت مشکل ہے اس لئے میں خود اپنی تنقید نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ دوسروں کے عادات و اطوار کا بہت غور سے مطالعہ کرتا تھا اور اس سے بہت لطف اٹھاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال کر کے دل کانپ اٹھتا تھا کہ شاید دوسروں کو میں بھی اتنا ہی مضحک معلوم ہوتا ہوں۔

۱۹۲۱ء میں سال بھر کانگریس کے کارکن ایک ایک کر کے برابر گرفتار ہوتے رہے اور سزا پاتے رہے۔ مجموعی گرفتاریاں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ علی برادران کی فوج میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں طویل سزا مل چکی تھی۔ جن الفاظ کے زبان سے نکالنے پر انھیں سزا ہوئی تھی، سینکڑوں پلیٹ فارموں سے ہزاروں آدمیوں نے انھیں دہرایا۔ گرمیوں کے زمانے میں میرے متعلق بھی یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ چند تقریروں کی بنا پر مجھ پر بغاوت کا جرم عائد کیا جائے گا اور مقدمہ چلایا جائے گا۔ لیکن ایسی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ سال کے آخر میں معاملات حد کو پہنچ گئے۔ پرنس آف ویلز ہندوستان آنے والے تھے اور کانگریس نے طے کیا تھا کہ ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ نومبر کے آخر میں بنگال میں کانگریس کے والنٹیر خلاف قانون قرار دے دئے گئے۔ اس کے بعد اسی قسم کا اعلان صوبجات متحدہ میں بھی ہوا۔ دیش بندھو داس نے صوبہ بنگال کے نام ایک ولولہ انگیز پیغام شائع کیا۔ انھوں نے لکھا تھا "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور میرا سارا جسم آہنی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔

یہ غلامی کا قہر ہے۔ سارا ملک ایک بہت بڑا جیل خانہ ہے۔ چاہے ہیں آزاد رہوں یا جیلخانہ میں بند کر دیا جاؤں۔ چاہے میں زندہ رہوں یا مر جاؤں لیکن کانگریس کا کام بہر صورت جاری رہنا چاہیئے۔" صوبہ متحدہ میں بھی ہم نے حکومت کے چیلنج کو قبول کر لیا اور نہ صرف یہ اعلان کیا کہ ہماری والنٹیروں کی انجمن جاری رہے گی، بلکہ روزانہ اخباروں میں اپنے والنٹیروں کے نام بھی شائع کرانا شروع کر دیئے۔ پہلی فہرست میں سب سے پہلا نام میرے والد کا تھا۔ وہ والنٹیر نہ تھے۔ لیکن محض گورنمنٹ کے حکم کی خلاف ورزی کے لئے انھوں نے بھی اپنا نام لکھا لیا۔ دسمبر کے آغاز میں ولیعہد کے آنے سے چند روز پہلے کثیر تعداد میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

ہم جانتے تھے کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ حکومت اور کانگریس کے درمیان جس جنگ کا اندیشہ تھا وہ اب چھڑنے ہی والی ہے۔ جیل خانہ ابھی تک ایک غیر معروف جگہ تھی اور جیل جانے کا خیال بالکل نیا تھا۔ میں ایک دن الہ آباد کے کانگریس کے دفتر میں معمولی وقت کے بعد بیٹھا پچھلا کام نبٹا رہا تھا کہ ایک کلرک گھبرایا ہوا آیا اور کہا کہ پولیس تلاشی کا حکم لے کر آ پہنچی ہے اور دفتر کی عمارت کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں بھی کچھ گھبرا گیا کیونکہ اس قسم کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ مگر میں نے دل میں کہا کہ ذرا رعب جمانا چاہیئے اور یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ ہم بالکل مطمئن ہیں اور ہمیں پولیس کی آمد و رفت کی مطلق پرواہ نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک کلرک کو حکم دیا کہ وہ پولیس افسر کے ساتھ ساتھ جا کر دفتر کے تمام کمرے دکھا دے اور باقی عملے کو سختی سے تاکید کی کہ وہ پولیس کی طرف کوئی توجہ نہ کریں اور بدستور اپنا کام کرتے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے ایک دوست اور رفیق کار جو دفتر کے باہر ہی گرفتار ہوئے تھے ایک سپاہی کے ساتھ مجھ سے رخصت ہونے آئے۔ مجھے اس وقت یہ خبط سا یا ہوا تھا کہ جیسے یہ نئے واقعات میرے لئے آئے دن کی چیز ہیں اس لئے میں اپنے دوست سے بڑی

سرد مہری سے پیش آیا یعنی میں نے ان سے اور سپاہی سے بڑی بے پروائی سے کہا کہ ذرا ٹھہریئے میں یہ خط ختم کر لوں۔ اس کے بعد ہی شہر سے گرفتاریوں کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ آخر کار میں نے سوچا کہ گھر چل کر دیکھنا چاہیئے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مکان پہنچا تو دیکھا کہ پولیس وہاں بھی موجود ہے اور ہماری وسیع کوٹھی کی تلاشی لے رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ والد کو اور مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔

ہم پرنس آف ویلس کے بائیکاٹ میں چاہے جتنا اہتمام کرتے ہمیں اتنی کامیابی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جتنی ان واقعات سے ہوئی۔ جہاں کہیں وہ تشریف لے گئے ہڑتالوں اور سونی سڑکوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ الہ آباد ان کی آمد کے موقع پر شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ چند دن بعد وہ کلکتے گئے تو اس عظیم الشان شہر میں بھی تمام چہل پہل یکایک بند ہو گئی۔ یہ پرنس آف ویلس کے ساتھ بڑا ظلم تھا۔ کیونکہ نہ اُن کا کوئی قصور تھا نہ ہمیں ان سے کوئی شکایت تھی۔ البتہ حکومت ہند ان کی شخصیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور ان کے ذریعے سے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنا چاہتی تھی اس لئے ہم ان کا بائیکاٹ کر رہے تھے۔

اب تو گرفتاریوں اور سزایابیوں کا تار بندھ گیا خصوصاً بنگال اور صوبجات متحدہ میں۔ ان صوبوں کے تمام مقتدر لیڈر اور کارکن گرفتار کر لئے گئے اور والنٹیر تو ہزاروں کی تعداد میں جیل بھیجدیئے گئے۔ شروع شروع میں زیادہ تر شہر والوں نے پیش قدمی کی اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ جیل جانے والے والنٹیروں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی تو اپنے اجلاس کے وقت پوری کی پوری گرفتار کر لی گئی (اس وقت ۵۵ ممبر موجود تھے) بہت سے ایسے لوگ بھی جنھوں نے کانگرس میں یا سیاسی کاموں میں آج تک کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ جوش کے اس اُمڈتے ہوئے سیلاب میں بہہ گئے اور گرفتار ہونے کے لئے

نکل کھڑے ہوئے۔ ایسی مثالیں بھی سُننے میں آئی ہیں کہ سرکاری دفتر کا کوئی کلرک شام کو اپنے کام پر سے واپس آرہا ہے۔ راستے میں وہ بھی اس رو میں بہہ گیا اور گھر جانے کے بجائے جیل پہنچ گیا۔ لڑکے اور نوجوان، قیدیوں کی لاری میں گھس جاتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ہمیں بھی جیل خانے لے چلو۔ روز شام کو ہم جیل کے اندر سے سُنا کرتے کرتے تھے کہ سیاسی قیدیوں کی لاریوں پہ لاریاں چلی آرہی ہیں اور قومی نعرے لگائے جارہے ہیں جیل خانے کھچا کھچ بھر گئے تھے اور جیل کے افسر اس غیر معمولی صورت حالات سے سخت پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پولیس کی لاری وارنٹ کے مطابق قیدیوں کی ایک خاص تعداد لیکر روانہ ہوئی (قاعدے کی وجہ سے یا مجبوری سے ان کے نام نہیں لکھے جاتے تھے) مگر جب جیل خانے کے دروازے پہ پہنچی تو اس میں اس تعداد سے کہیں زیادہ قیدی نکلے۔ جیل کے افسر حیران رہ جاتے تھے کہ اس عجیب و غریب صورت میں کیا طرز عمل اختیار کریں کیونکہ جیل مینوئل میں اس کے متعلق کوئی دفعہ نہ تھی۔

آخر حکومت نے لوگوں کو بلا تفریق گرفتار کرنے کا رویہ ترک کر دیا۔ اب صرف مشہور مشہور کارکن چن لئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کے جوش کا وہ پہلا زور کم ہو گیا۔ اور چونکہ جیل میں سارے کے سارے معتمد کارکن نہ تھے اس لئے وہ ایک بےبسی اور تذبذب کی حالت میں پھنس گئے۔ لیکن یہ تبدیلی محض ظاہری تھی۔ ابھی فضا میں گرج اور کڑک موجود تھی۔ ملک میں بےچینی باقی تھی اور انقلابی رجحانات پائے جاتے تھے۔ دسمبر ۲۱ء و جنوری ۲۲ء میں ترک موالات کے سلسلے میں ۳۰ ہزار شخص جیل گئے۔ لیکن اگرچہ سارے نمایاں لیڈر اور کارکن جیل میں تھے مگر تحریک کے بانی اور رہبر اعظم مہاتما گاندھی ابھی باہر تھے اور روزانہ پیغامات اور ہدایات جاری کرتے رہتے تھے جس سے لوگوں میں جوش بڑھتا تھا۔ اور اکثر نامناسب

حرکتیں رُک جاتی تھیں۔ حکومت نے اب تک انھیں نہیں چھیڑا تھا، کیونکہ وہ اس کے نتائج سے ڈرتی تھی اور اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ہندوستانی فوج اور پولیس نہ بھڑک اُٹھے۔

فروری ۲۲ء کے آغاز میں یکایک تمام منظر بدل گیا۔ جیل خانے میں یہ سُن کر ہمیں بڑی حیرت و پریشانی ہوئی کہ گاندھی جی نے تمام جارحانہ کارروائیاں ایک دم سے روک دیں۔ اور عدم تعاون کی تحریک ملتوی کر دی۔ اخباروں میں ہم نے یہ بھی پڑھا کہ چوراچوری کے واقعات کی وجہ سے انھوں نے یہ طرز عمل اختیار کیا۔ یہ موضع گورکھپور کے ضلع میں ہے۔ یہاں دیہاتیوں کے ایک مجمع نے پولیس کے مظالم سے تنگ آ کر تھانے کو آگ لگا دی اور چھ سات سپاہیوں کو زندہ جلا دیا۔

ہمیں جنگ کے التوا کی خبر سُن کر بڑا غصہ آیا۔ کیونکہ اس وقت ہماری قوت بڑھی ہوئی تھی اور ہم ہر محاذ پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ لیکن جیل خانے کے اندر ہماری مایوسی اور غصے سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ چنانچہ عدم تعاون ختم ہو گیا اور ترک موالات کی کلی کھلنے سے پہلے مُرجھا گئی۔ مہینوں کی تگ و دو اور پریشانی کے بعد حکومت نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور اب اسے پہلے پہل موقع ملا کہ پیش قدمی کرے چنانچہ چند ہفتے کے اندر اندر اس نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے طویل مدت کے لئے جیل خانے میں بند کر دیا۔

(۱۲)

عدم تشدّد یا تلوار

چورا چوری کے حادثے کی وجہ سے تحریک کا یکایک ملتوی ہو جانا غالباً مہاتما گاندھی کے سوا تمام نمایاں کانگریسی لیڈروں کو ناگوار ہوا۔ میرے والد بھی (جو اس وقت جیل ہی میں تھے) اس سے بہت بد دل ہوئے۔ نوجوان طبقہ قدرتی طور پر زیادہ مشتعل ہوا کیونکہ ہماری بڑھتی ہوئی امیدوں کا قلعہ یکایک بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل کا یہی ردعمل ہونا تھا۔ التوا سے زیادہ ہم ان وجوہ سے جو التوا کی تائید میں پیش کی گئیں اور ان نتائج سے جو ان سے نکلتے تھے، گھبرا گئے۔ مانا کہ چورا چوری کا واقعہ نہایت افسوسناک اور عدم تشدد کے اصول کے قطعی منافی تھا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ملک کے کسی کونے کا ایک گاؤں اور وہاں کے مشتعل کسانوں کا ایک گروہ جنگ آزادی کا اس طرح خاتمہ کر سکتا ہے؟ اگر تشدد کے کسی انفرادی واقعہ کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے تو عدم تشدد کی لڑائی کے اصول اور عمل میں ضرور کوئی نقص ہے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ ناممکن تھا کہ اتنی بڑی تحریک میں اس طرح کے اکّا دکّا واقعات پیش نہ آئیں۔ تو کیا ہمیں آگے بڑھنے سے پہلے ہندوستان کے تیس پینتیس کروڑ انسانوں کو عدم تشدد کے اصول اور عمل کی مکمل تعلیم دینا چاہیئے؟ اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش بھی کریں تو خود ہم میں سے کتنے لوگ نکلیں گے جنھیں اپنے اوپر اتنا اعتماد ہوگا کہ پولیس کے انتہائی اشتعال کے باوجود وہ پوری طرح پُرامن رہ سکیں گے؟ یا فرض کیجیئے کہ ہم کامیاب بھی ہو جائیں تو ان بیشمار سرکاری گرگوں کا کیا علاج کریں گے جو ہماری

تحریک میں پہلے سے گھس کر خود تشدد کی حرکتیں کرتے ہیں اور دوسروں کو ورغلاتے ہیں۔ اگر عدم تشدد کی تحریک چلانے کی یہی شرط ٹھہری کہ ملک کے طول و عرض میں تشدد کا ایک واقعہ بھی نہ ہونے پائے تو اس کی کامیابی معلوم۔

ہم یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ عدم تشدد کا طریقہ نہایت موثر اور نتیجہ خیز ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے اسے اختیار کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے کانگرس نے اسے تسلیم کیا تھا۔ گاندھی جی نے بھی اسے ملک کے سامنے نہ صرف صحیح بلکہ انتہائی موثر طریقے کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اگرچہ اس کا نام ایک منفیانہ نام تھا لیکن اس میں وہ زبردست عملی قوت پوشیدہ تھی جو ظالم کے سامنے سر جھکنے نہیں دیتی تھی۔ یہ ان بزدلوں کے لئے جو عمل سے جی چراتے ہیں پناہ کی صورت نہ تھی بلکہ وہ طاقت تھی جس کے ذریعے سے بہادر بدی اور غلامی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن بہادر اور طاقتور لوگ وہاں کیا کر سکتے ہیں جہاں معدودے چند اشخاص (جو ممکن ہے دوست کے بھیس میں دشمن ہوں) جب چاہیں اپنی بے عنوانیوں سے ہماری تحریک کو بند کرا دیں۔

گاندھی جی نے بڑی خوش بیانی اور دلنشین انداز سے جس کے وہ مالک ہیں عدم تشدد اور پرامن ترک موالات پر عمل کرنے کی سفارش کی تھی۔ ان کی زبان بہت سادہ تھی اور اس میں بناوٹ نام کو نہ تھی۔ ان کی آواز اور ان کا چہرہ بہ ظاہر جوش و خروش اور جذبات سے خالی نظر آتا تھا لیکن برف کی اس سطح کے نیچے دہکتی ہوئی آگ کی گرمی اور جذبات کا تلاطم خیز طوفان پوشیدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جو لفظ ان کی زبان سے نکلتا تھا وہ سننے والوں کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر کر آگ لگا دیتا تھا۔ جو راستہ انھوں نے بتایا تھا وہ سخت دشوار گذار ضرور تھا لیکن یہ ہمت والوں کا راستہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ منزل مقصود تک پہنچا کر رہے گا۔ اسی امید و بیم پر ہم نے اسے اختیار کیا اور آگے قدم بڑھانا شروع کر دیا۔ گاندھی جی نے "تلوار کے مشرب"

کے موضوع پر ۱۹۲۰ء میں ایک مشہور و معروف مضمون لکھا تھا۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"بیشک میرا یہ ایمان ہے کہ اگر صرف دو ہی صورتیں سامنے ہوں یعنی بزدلی یا تشدد تو تشدد پہ عمل کرنا چاہیئے۔ بجائے اس کے کہ ہندوستان بزدلی کے ساتھ اپنی ذلت کا خود شکار ہو جائے میں یہی چاہوں گا کہ وہ اپنی عزت کے تحفظ کی خاطر ہاتھ میں تلوار اٹھا لے۔ لیکن یہ میرا عقیدہ ہے کہ عدم تشدد تشدد سے بہر صورت برتر ہے۔ انتقام کے مقابلے میں عفو میں زیادہ مردانگی ہے۔

عفو سپاہی کی آن ہے لیکن وہ عفو اسی وقت کہلائے گا جب انتقام کی طاقت موجود ہو۔ اگر کوئی بے بس اور لاچار عفو کا دعوی کرے تو اس کی کوئی وقعت نہیں۔ ایک چوہا بلی کو اس وقت کبھی معاف نہیں کر سکتا جبکہ وہ پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہو...... لیکن میں ہندوستان کو کمزور نہیں سمجھتا۔ نہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتا ہوں...... اس معاملے میں آپ کو کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے میرا منشا یہ ہے کہ قوت جسمانی طاقت پر منحصر نہیں بلکہ یہ اٹل قوت ارادی سے پیدا ہوتی ہے...... میں خیالی دنیا کا رہنے والا نہیں ہوں۔ مجھے تو عملی اصول پرست ہونے کا دعوی ہے۔ عدم تشدد کا مذہب محض رشیوں اور منیوں کے لئے نہیں ہے بلکہ عام انسانوں کے لئے بھی ہے۔ جس طرح تشدد درندوں کا خاصہ ہے اسی طرح عدم تشدد انسانوں کی فطرت ہے۔ درندوں کی روح خوابیدہ ہوتی ہے وہ جسمانی طاقت کے سوا کسی دوسرے اصول سے واقف نہیں ہوتے لیکن انسانی شرف کا یہ تقاضا ہے کہ وہ بلند تر اصول یعنی روحانی قوت کے نظریہ پہ عمل کرے۔

اسی لئے میں نے ہندوستان کے سامنے قربانی کا قدیم اصول پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ ستیا گرہ اور اس کے لوازم یعنی ترک موالات اور سول نافرمانی

وغیرہ سب تکلیف برداشت کرنے کے اصول کے دوسرے نام ہیں۔ جن رشیوں نے تشدد کے طوفان میں عدم تشدد کا نظریہ معلوم کیا وہ نیوٹن سے زیادہ ہوشمند تھے درحقیقت وہ ولنگٹن سے اچھے سپاہی تھے۔ فن سپہ گری کے ماہر ہوتے ہوئے انھوں نے محسوس کیا کہ یہ ہتھیار سب عبث ہیں اس لئے جنگ سے اکتائی ہوئی دنیا کو انھوں نے یہ پیغام دیا کہ تمہاری نجات تشدد میں نہیں بلکہ عدم تشدد میں ہے۔

عدم تشدد پر عامل ہونے کا یہ مقصد ہے کہ انسان جان بوجھ کر تکلیفیں برداشت کرے۔ اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ ظالم کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے بلکہ اس کے مقابلے میں اپنا پورا زور صرف کیا جائے اور دل و جان سے اس کی مخالفت کیجائے چنانچہ اس قانون کے ماتحت یہ ممکن ہے کہ تن تنہا ایک فرد اپنی عزت اپنے مذہب اور اپنی روح کو بچانے کے لئے ظالم سلطنتوں کی مجموعی طاقتوں کا مقابلہ کرے اور اس کی بنیادوں کو ہلا دے۔

میں ہندوستان کو کمزور سمجھ کر اسے عدم تشدد پر عمل کرنے کی ترغیب نہیں دیتا ہوں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی قوتوں اور طاقتوں کا احساس کرتے ہوئے اس پر عمل کرے ...... میں ہندوستان کو جتانا چاہتا ہوں کہ اس کے پاس ایسی روح ہے جو کبھی فنا نہیں ہوسکتی جو جسمانی کمزوری کے باوجود فتحمند ہوسکتی ہے اور جو ساری دنیا کی مجموعی جسمانی طاقتوں کا مقابلہ کرسکتی ہے۔

میں ترک موالات کی اس پرامن تحریک کو آئرلینڈ کی سن فین تحریک سے ممتاز کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ اپنے تخیل کے اعتبار سے تشدد کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی لیکن میں تشدد کے حامیوں کو بھی دعوت دیتا ہوں کہ وہ پرامن ترک موالات کو آزما کر دیکھیں۔ اس میں کوئی فطری کمزوری نہیں جس سے ناکامیابی کا خطرہ ہو۔ ہاں اگر اسے عام تائید حاصل نہ ہو تو ناکامی کا امکان ضرور ہے۔ اس وقت البتہ حقیقی خطرہ پیدا ہوگا۔

جوشیلے لوگ قومی ذلت کو زیادہ عرصے تک گوارا نہ کر سکیں گے اس لئے ان کا غیض و غضب دوسرے راستے تلاش کرے گا ممکن ہے ہندوستان تلوار کا طریقہ اختیار کر کے وقتی طور پر فتح حاصل کر لے لیکن اس ہندوستان پر مجھے ہرگز فخر نہ ہوگا میں ہندوستان سے اس طرح وابستہ ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اور مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان ساری دنیا کے لئے ایک پیغام رکھتا ہے۔

گاندھی جی کی ان دلائل کا ہم پر بہت اثر پڑا لیکن ہمارے لئے یا بحیثیت مجموعی کانگریس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہب یا مستقل مسلک نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا یہ صرف ایک حکمت عملی تھی اور اس سے بعض نتائج کی توقع تھی اور انھیں نتائج کی کسوٹی پر اسے کسنا تھا۔ افراد تو اسے مذہب یا مستقل مسلک بنا سکتے تھے لیکن کوئی سیاسی انجمن جبتک اسے سیاسی کہلانے کا دعویٰ ہو ایسا نہیں کر سکتی۔

چوراچوری کے واقعات اور اس کے نتائج نے ہمیں موقع دیا کہ ہم عدم تشدد کے نشیب و فراز پر غور کریں۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ اگر التوائے تحریک کے معاملے میں گاندھی جی کے دلائل صحیح ہیں تو پھر ہمارے مخالفوں کو ہمیشہ یہ اختیار ہو گا کہ جب چاہیں ایسی صورت پیدا کر دیں جس سے جنگ خواہ مخواہ بند کرنا پڑے۔ کیا یہ عدم تشدد کا نقص تھا، یا گاندھی جی کی تشریح کا؟ بہرحال وہی اس کے بانی اور موجد تھے۔ اس لئے ان سے بہتر کون جا سکتا تھا کہ یہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ اور ان کے بغیر ہماری تحریک چل ہی نہیں سکتی تھی۔

کئی سال بعد ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہونے سے پہلے گاندھی جی نے اس مسئلے کو صاف کر دیا جس سے ہمیں بہت کچھ اطمینان ہو گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ تشدد کے انفرادی واقعات کی وجہ سے تحریک کو بند نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ان ناخوشگوار حادثات کی وجہ سے جن کا ہونا کسی حد تک یقینی ہے ہماری عدم تشدد

کی جنگ جاری نہیں رہ سکتی تو سمجھنا چاہیئے کہ یہ ہر موقع کے لئے موزوں طریق عمل نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو ماننے کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھے کیونکہ ان کے نزدیک صحیح طریق عمل ہر موقع پر کارگر ہوتا ہے۔ اور انتہائی ناموافق حالات میں بھی کسی نہ کسی حد تک جاری رہ سکتا ہے۔ یہ تشریح جس نے عدم تشدد کے دائرے کو وسیع کر دیا، گاندھی جی کی رائے میں تبدیلی کا نتیجہ تھی یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

اگرچہ اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا لیکن حقیقت میں فروری ۱۹۲۲ء میں سول نافرمانی کا التوا محض چوراچوری کے واقعے کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ اسباب کا ایک سلسلہ تھا جس کی یہ آخری کڑی تھی۔ گاندھی جی اکثر تقریباً وجدانی طور پر کام کرتے ہیں۔ عوام کے ساتھ ان کا قریبی تعلق بہت عرصے سے ہے اس لئے عظیم الشان اور ہردلعزیز رہبروں کی طرح ان میں بھی یہ معلوم کرنے کا ملکہ پیدا ہو گیا ہے کہ عام لوگوں کا رجحان اس وقت کیا ہے وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ اسی احساس سے متاثر ہو کر وہ اپنے طرز عمل کو بدلتے ہیں اور بعد میں اپنے رفقا کی حیرت اور خفگی کے خیال سے اپنے فیصلے کو دلائل کے غلاف میں لپیٹ دیتے ہیں کبھی کبھی یہ دلائل بہت ناکافی معلوم ہوتی ہیں مثلاً چوراچوری کے بعد سول نافرمانی کے التوا کے معاملے میں۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری تحریک ظاہری قوت اور عام جوش و خروش کے باوجود انتشار کی حالت میں تھی تنظیم اور انضباط کافور ہو چکا تھا۔ قریب قریب چوٹی کے تمام آدمی جیل میں تھے اور عوام کو ابھی اتنی تربیت نہیں ملی تھی کہ بطور خود سلیقہ سے کام جاری رکھ سکیں۔ ہر کس و ناکس جو چاہتا کانگریس کمیٹی پر قبضہ کر سکتا تھا بلکہ سچ پوچھئے تو بہت سے نااہل لوگ اور سرکاری گرگے صف اول میں آکھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے چند مقامی کانگریس اور خلافت کمیٹیوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ انھیں روکنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

ایسی لڑائیوں میں اس قسم کی باتیں ہونا لازمی ہیں لیڈروں کو جیل جانے میں سبقت کرنی پڑتی ہے اور کام دوسروں پر چھوڑنا پڑتا ہے ایسی صورت میں صرف یہی کیا جاسکتا ہے کہ عوام کو چند معمولی سرگرمیوں کے جاری رکھنے کی تربیت دی جائے اور اس سے ضروری یہ ہے کہ بعض دوسری ناروا حرکتیں کرنے کی ممانعت کردیجائے سنہ ۱۹۳۰ء تک ہم اس قسم کی کافی تربیت دے چکے تھے اس لئے سنہ ۱۹۳۰ء و سنہ ۱۹۳۲ء کی سول نافرمانی کی تحریک زیادہ منظم اور قوی تھی لیکن سنہ ۱۹۲۱ء و سنہ ۱۹۲۲ء میں یہ بات نہ تھی۔ اس وقت لوگوں کے جوش و خروش کی تہ میں کوئی ٹھوس چیز موجود نہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر تحریک جاری رہتی تو بہت جگہ تشدد کے انفرادی واقعات ظہور میں آتے حکومت انھیں نہایت خونخوار طریقے سے کچلتی اور خوف و دہشت کا دور دورہ ہوتا جس سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہو جاتیں اور دوبارہ ابھرنے کی طاقت بھی باقی نہ رہتی۔

گاندھی جی کے ذہن میں بھی غالباً یہی دلائل تھے اور یہی اثرات کام کر رہے تھے اس لئے اگر ان مقدمات کو تسلیم کرلیا جائے اور عدم تشدد کے طریقے کے جاری رکھنے کی ضرورت کو مان لیا جائے تو ہمیں ان کے فیصلے سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ انھیں اس نکمے مسالے کو خارج کرکے نئے سرے سے عمارت بنانی تھی۔ ایک دوسرے اور بالکل مختلف نقطۂ نظر سے ان کا فیصلہ غلط بھی کہا جاسکتا ہے لیکن اس نقطۂ نظر کو عدم تشدد سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک طرف عدم تشدد کا دعویٰ کیا جائے اور دوسری طرف تشدد سے چشم پوشی کی جائے اگر اس حد تک پہنچنے کے بعد انفرادی خونریزی کے واقعات کی وجہ سے قومی تحریک دبادی جائے تو اس کے ختم ہونے کا اندیشہ نہیں بلکہ اس قسم کی تحریکوں میں دب کر ابھرنے کی قوت ہوتی ہے۔ عارضی شکست اکثر معاملے کو صاف کرنے اور تحریک کو نئی قوت بخشنے میں

مدد دیتی ہے۔ ظاہری شکست سے کہیں زیادہ اہم اصول اور نصب العین ہے۔ اگر قوم اپنے نصب العین کو آلودگی سے پاک رکھے تو بہت جلد سنبھلنے کی توقع ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں ہمارا نصب العین تھا کیا؟ لے دے کر ایک مبہم قسم کا سوراج جس کا کوئی صاف تخیل ہمارے ذہن میں نہ تھا اور عدم تشدد کی جنگ کا ایک خاص مفہوم اگر ملک وسیع پیمانے پر انفرادی طور پر بھی تشدد سے کام لیتا تو عدم تشدد یوں ہی ختم ہو جاتا۔ رہا سوراج تو وہاں قدم جمانے کے لئے کوئی چیز ہی نہ تھی۔ لوگوں کو عام طور پہ ابھی اتنی قوت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ عرصہ تک جنگ کو جاری رکھ سکتے اور اگرچہ بدیشی حکومت کے خلاف عام بددلی اور کانگرس کے ساتھ ہمدردی پائی جاتی تھی۔ لیکن کوئی بنیادی قوت یا تنظیم نہ تھی۔ اس لئے یہ جذبات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ لوگ محض ہنگامی جوش میں جیل چلے گئے کیونکہ انھیں توقع تھی کہ یہ معرکہ بہت جلد فتح ہو جائے گا۔

اس لئے بہت ممکن ہے کہ ۱۹۲۲ء میں سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا فیصلہ صحیح ہو۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ التوا کا انداز بہت نامناسب تھا اور اس سے عوام کی اخلاقی حالت پر بڑا خراب اثر پڑا۔

شاید اس زبردست تحریک کے یکایک بند کر دینے ہی کی وجہ سے ملک میں وہ افسوسناک صورت حال پیدا ہوئی جس نے قومی تحریک کو اس قدر نقصان پہنچایا یا یہ اسی جنگ میں تو انفرادی اور اکا دکا تشدد کا سدباب ہو گیا لیکن تشدد کے دبے ہوئے جذبے نے اور طریقوں سے ہاتھ پیر نکالنا شروع کئے۔ آگے چل کر فرقہ وارانہ فسادات اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف جماعتوں کے فرقہ پرست جو سیاسی اعتبار سے عموماً رجعت پسند تھے۔ ترک موالات اور سول نافرمانی کی ہما ہمی اور غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ اب انھیں موقع مل گیا اور وہ اپنی اپنی کمین گاہ سے نکل آئے۔

بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی یعنی خفیہ پولیس کے آوردوں اور ان لوگوں نے جو فرقہ وارانہ فساد کرا کے افسروں کو خوش کرنا چاہتے تھے یہی انداز اختیار کیا موپلوں کی شورش بڑی بے رحمی سے دبائی جا چکی تھی۔ اس وحشیانہ ظلم کا تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہ موپلا قیدی ریل کے ڈبوں میں ٹھونس دیے گئے اور گرمی میں تڑپ تڑپ کر مر گئے بہرحال ان واقعات سے ان لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا جو فرقہ وارانہ منافرت کی آگ بھڑکایا کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اگر سول نافرمانی رد کی نہ جاتی اور حکومت اس تحریک کو سختی سے کچلتی تو شاید فرقہ وارانہ کشیدگی اتنی زیادہ بڑھنے نہ پاتی اور لوگوں میں اتنا بیکار جوش باقی نہ رہتا جس کی وجہ سے آگے چل کر یہ فساد اٹھ کھڑے ہوئے۔

سول نافرمانی بند کرنے سے پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے شاید صورت حالات بالکل بدل جاتی۔ تحریک کی پہلی لہر اس زور شور سے اٹھی کہ حکومت حیران اور خوفزدہ ہو گئی۔ اس وقت لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے ایک تقریر میں کھلم کھلا اپنی پریشانی کا اعتراف کیا پرنس آف ویلیس اس وقت ہندوستان میں تھے اور ان کی موجودگی نے حکومت کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کے آغاز میں کثیر تعداد میں گرفتاریاں ہو چکی تھیں لیکن اس کے بعد ہی حکومت نے یہ کوشش کی کہ کانگرس سے کوئی سمجھوتہ کر لے۔ خاص کر ولیعہد کے کلکتے کے دورے کے خیال سے یہ پیش قدمی کی گئی تھی۔ بہرحال حکومت بنگال کے نمائندوں اور دیش بندھو داس کے درمیان جو اس وقت جیل میں تھے اس سلسلہ میں کچھ گفت وشنید ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور کانگرس کے درمیان ایک چھوٹی سی گول میز کانفرنس کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ لیکن یہ تجویز وہیں ختم ہو گئی۔ کیونکہ گاندھی جی کو اس پر اصرار رہا کہ مولانا محمد علی جو اس وقت کراچی جیل میں تھے اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوں۔

مسٹر سی۔ آر۔ داس نے گاندھی جی کے اس رویے کو قطعاً ناپسند کیا

اور بعد میں جب وہ رہا ہو کر آئے تو انھوں نے کھلم کھلا ان پر اعتراض بھی کیا اور کہا کہ گاندھی جی نے بڑی زبردست غلطی کی۔ ہم میں سے اکثر لوگ جیل میں تھے اس لئے ہمیں تفصیلات معلوم نہیں ہیں اور پورے واقعات معلوم کئے بغیر کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ایسی کانفرنس سے کوئی نتیجہ نکلنے کی امید نہیں تھی۔ اصل میں حکومت کی صرف یہ کوشش تھی کہ ولیعہد کا کلکتہ کا دورہ کسی نہ کسی طرح بخیر وخوبی گذر جائے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر کانفرنس ہوتی بھی تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا اور جو بنیادی مسائل ہمارے سامنے تھے وہ جوں کے توں رہتے۔ نو سال بعد جب ہماری قوم اور کانگریس دونوں زیادہ قوی تھیں اسی قسم کی کانفرنس ہوئی مگر اس سے کوئی عظیم الشان نتائج حاصل نہیں ہوئے لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھئے تب بھی مولانا محمد علی کی شرکت پر گاندھی جی کا اصرار میرے نزدیک بالکل درست تھا۔ وہ نہ صرف کانگریس کے بلکہ تحریک خلافت کے بھی خاص رہنما تھے اور خلافت کا مسئلہ اس زمانے میں کانگریس کے پروگرام کا اہم جزو تھا اس لئے ان کی موجودگی قطعی ضروری تھی جس حکمت عملی کی خاطر کسی رفیق کار کو نظر انداز کر دیا جائے اسے کبھی صحیح نہ سمجھنا چاہیئے۔ جب حکومت انھیں جیل سے رہا کرنے تک کو تیار نہ تھی تو کیا امید ہو سکتی تھی کہ کانفرنس سے کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔

والد پر اور مجھ پر مختلف الزام عائد کئے گئے اور مختلف عدالتوں سے ہم دونوں کو چھ چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ مقدمے کیا تھے ایک کھیل تھا اور ہم نے اپنے اصول کے مطابق عدالتی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہماری تقریروں اور دوسری سرگرمیوں میں جیل بھیجنے کے لئے کافی مواد مل سکتا تھا لیکن ہم پر جو الزام عائد کئے گئے وہ بہت دلچسپ تھے والد پر خلاف قانون جماعت کارکن یعنی کانگریس کا والنٹیر ہونے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور اس کے ثبوت میں ایک فارم پیش کیا گیا جس پر ان کے ہندی

نی انھیں کے تھے لیکن اس سے پہلے انھوں نے شاید ہی کبھی ہندی
ں لئے ان کے ہندی دستخطوں کو بہت ہی کم لوگ شناخت
سنہ حال سا شخص عدالت میں پیش ہوا جس نے حلفیہ ان
ن یہ شخص بالکل ان پڑھ تھا اور شناخت کرتے وقت دستخطوں
یے تھا۔ میری لڑکی کی عمر اس وقت چار برس کی تھی اور والد
تدمہ کا تماشہ دیکھنے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔

تھا کہ میں نے ہڑتال کے اشتہارات تقسیم کئے۔ اس زمانے میں
، تھا، لیکن اب یہ جرم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ ہم "درجہ نو آبادیات"
بڑھا رہے ہیں! بہر حال مجھے بھی سزا ہو گئی۔ تین مہینے کے
جہاں میں اپنے والد اور دوسرے ساتھیوں کے پاس رہتا
ائی کرنے والی عدالت نے میرے مقدمے پر غور کیا اور اس
ا سزا دی گئی اس لئے رہا کر دیا جائے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ
ے پیروی نہیں کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سول نافرمانی کے التوا
نوں کو نیند سے چونکا دیا تھا۔ بہر حال والد کو جیل خانے میں
کا بہت افسوس ہوا۔

اندھی جی کے پاس احمد آباد جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ میرے
رہو گئے اور میری ان کی ملاقات سابرمتی جیل میں ہوئی۔ میں
کے وقت موجود تھا۔ یہ بڑا یادگار موقع تھا اور جو لوگ وہاں
ول نہیں سکتے۔ جج ایک انگریز تھا اور اس نے بڑے وقار
سے کام لیا۔ گاندھی جی نے عدالت میں جو بیان دیا اس سے
گئے۔ چنانچہ جب ہم عدالت سے باہر آئے تو ہمارے جذبات

میں ایک تلاطم برپا تھا اور ہمارے دلوں پر ان کے سلیس فقرے اور موثر استعارے نقش تھے۔

میں الہ آباد واپس آ گیا۔ چونکہ میرے بہت سے دوست اور ساتھی ابھی جیل میں تھے اس لئے باہر مجھے تنہائی سی محسوس ہوتی تھی اور میرا جی نہیں لگتا تھا۔ کانگریس کے اداروں میں اس وقت ابتری پیدا ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کی خاص طور پر کوشش شروع کر دی۔ سول نافرمانی کے التوا کے باوجود ہمارے پروگرام کا یہ جزو بحال رکھا گیا تھا۔ الہ آباد میں قریب قریب تمام کپڑے کے تاجروں نے یہ قسم کھائی تھی کہ بدیشی کپڑا نہیں منگائیں گے۔ اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس انجمن کے قواعد میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جو کوئی اس عہد کو توڑے گا اس پر جرمانہ کیا جائیگا۔ مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے بڑے بڑے تاجروں نے اپنا عہد توڑ دیا ہے اور بدیشی کپڑا منگا رہے ہیں۔ یہ گویا ان بے چاروں کے ساتھ بڑی بے انصافی تھی جو اپنے عہد پر قائم تھے۔ ہم نے بہت کچھ کہا سنا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اور تاجروں کی یہ انجمن بالکل بے بس معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے ہم نے طے کیا کہ عہد شکن تاجروں کی دوکانوں پر دھرنا دیا جائے۔ دھرنا دینے کا خیال ظاہر کرنا تھا کہ ہمارا کام بن گیا۔ فوراً جرمانے ادا کئے گئے اور نئے سرے سے قسمیں کھائی گئیں۔ جرمانے کی جو رقم وصول ہوئی وہ تاجروں کی انجمن ہی کو دیدی گئی۔

دو تین دن بعد ہی میں چند ساتھیوں کے ساتھ جو تاجروں سے گفت وشنید کرنے میں میرے شریک تھے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اب ہم پر یہ الزام لگایا گیا کہ ہم نے تاجروں پر مجرمانہ تشدد کیا اور زبردستی ان سے روپیہ وصول کیا۔ خاص مجھ پر چند اور الزام بھی لگائے گئے تھے جس میں ایک جرم بغاوت بھی تھا۔ میں نے مقدمہ کی پیروی نہیں کی لیکن عدالت میں ایک طویل بیان داخل کیا۔ مجھے تین جرموں کے مواخذے

میں سزا دی گئی جن میں ایک جرم یہ بھی تھا۔ کہ میں نے دوسروں پر تشدد کر کے ان سے زبردستی روپیہ وصول کیا، لیکن بغاوت کا مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ شاید یہ سمجھ لیا گیا کہ مجھے کافی سزا مل گئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، تین مختلف میعادوں کے لئے مجھے سزا ہوئی تھی جن میں دو ۱۸، ۱۸ مہینے کی تھیں اور دونوں ایک ساتھ شروع ہوتی تھیں۔ غرض سب ملا کر مجھے پونے دو برس کی سزا ہوئی تھی۔ یہ میری دوسری جیل یاترا تھی اور میں کوئی ڈیڑھ مہینے باہر رہ کے پھر جیل پہنچ گیا۔

(۱۴)

لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل

۱۹۲۱ء میں ہندوستان میں سیاسی کاموں کے جرم میں جیل جانا کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ یوں بھی جب سے تقسیم بنگالہ کے خلاف تحریک شروع ہوئی تھی سیاسی کارکنوں کے جیل جانے کا راستہ کھل گیا تھا اور ان میں سے اکثر کو لمبی سزائیں ہوئی تھیں۔ عدالت میں باضابطہ مقدمہ چلائے بغیر بھی لوگ نظر بند کردیے جاتے تھے اس وقت کے سب سے بڑے لیڈر لوکمانیہ تلک کو ضعیفی میں ۶ سال کی قید ہوئی تھی۔ جنگ عظیم نے نظر بندیوں اور قیدوں کی یہ رفتار اور تیز کردی۔ اب سازشوں کے مقدمے بھی اکثر چلنے لگے۔ جن میں عموماً حبس دوام یا پھانسی کی سزائیں ہوتی تھیں جنگ کے زمانے میں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی نظر بند ہوئے تھے۔ اور جنگ کے بعد ہی پنجاب میں بہت سے لوگ مارشل لا کے شکار ہوئے۔ اکثروں پر سازش کے مقدمے چلائے گئے اور اکثروں کو سرسری میں سزائیں ہوئیں۔ گویا اب ہندوستان میں سیاسی کاموں کے جرم میں جیل جانا معمولی بات ہوگئی تھی لیکن اب تک کوئی شخص اپنی خواہش سے جیل نہیں جاتا تھا۔ لوگوں کو اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں یا محض اس وجہ سے کہ خفیہ پولیس ان سے ناراض ہو سزا ہوجاتی تھی۔ بہرصورت لوگ یہ کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو عدالت میں پیروی کرکے اس سے بچ جائیں۔ البتہ جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی اور ان کے ہزاروں پیروؤں نے تحریک ستیاگرہ کے سلسلہ میں ایک نئی مثال پیش کی تھی

پھر بھی ۱۹۲۱ء تک جیل خانہ ایک اَن جان جگہ تھی اور بہت کم لوگوں کو یہ علم تھا کہ لوہے کے ان مہیب پھاٹکوں کے پیچھے جو نئے مجرم کو نگل جاتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ ہمارا گمان تھا کہ جیل کے باسی، بڑے خوفناک لوگ اور خطرناک مجرم ہوتے ہیں جیل کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں تنہائی، ذلت اور مصیبت کا تصور قائم ہو جاتا تھا اور ان سب سے بڑھ کر ایک بے جانی بوجھی جگہ کا خوف طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے جیل جانے کے اکثر تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے بہت سے ساتھی وہاں پہنچ بھی گئے تھے اس لئے اب رفتہ رفتہ ہماری طبیعت اس سے مانوس ہوتی جاتی تھی، اور جھجک اور نفرت کے غیر ارادی جذبے میں کمی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن چاہے ہم پہلے سے اپنے دل کو کتنا ہی مضبوط کرلیں پھر بھی جب پہلے پہل اس آہنی پھاٹک کے اندر قدم رکھتے تو سارے جسم میں ایک عجیب سنسنی اور ہیجان پیدا ہوجاتا تھا۔ ان باتوں کو اب کوئی تیرہ برس گذر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے قریب قریب تین لاکھ مرد اور عورتیں سیاسی جرائم کی پاداش میں (حالانکہ اکثروں کو تعزیرات ہند کی دوسری دفعات کے ماتحت سزائیں دی گئیں) ان پھاٹکوں کے اندر ہو آئے ہیں۔ ان میں سے ہزاروں کئی بار گئے اور آئے۔ انھیں اچھی طرح علم ہو گیا کہ اندر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس عجیب زندگی کا عادی بنانے کی بھی کوشش کی، جہاں تک کوئی شخص اس غیر طبعی کوفت اور وحشت کی زندگی کا عادی ہو سکتا ہے۔

ہم اس سے اسی طرح مانوس ہو گئے تھے جیسے انسان دنیا کی ہر چیز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ہر مرتبہ جب ہم ان پھاٹکوں کے اندر داخل ہوتے تھے، تو ایک حد تک وہی پرانی کیفیت، قلب کا اضطراب، اعصاب کی بے چینی نبض کی تیزی پیدا ہو جاتی تھی۔ اور ہماری نظریں سبزہ زاروں، کھلے ہوئے میدانوں،

آتے جاتے والے راہ گیروں اور سواریوں اور ان مانوس چہروں کی طرف جو شاید عرصے تک دیکھنے کو نہ ملیں ایک رخصتی نگاہ ڈالنے کے لئے خود بخود اٹھ جاتی تھیں۔

وہ زمانہ جب میں پہلی مرتبہ جیل گیا اور تین مہینے بعد یکایک رہا کر دیا گیا تھا ہمارے اور جیل کے عملے، دونوں کے لئے بڑا ہیجانی زمانہ تھا۔ ان نئے قسم کے قیدیوں کے ٹوٹ پڑنے سے جیل کے افسروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ان نو واردوں کی تعداد میں بھی آئے دن غیر معمولی اضافہ ہو رہا تھا۔ گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طوفان بڑھتا چلا آ رہا ہے، جو اپنی رو میں تمام روایتی حدود کو بہالے جائے گا۔ اس سے زیادہ پریشان کن ان نو واردوں کی نوعیت تھی۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ لیکن کثرت اوسط طبقے والوں کی تھی۔ بہر حال ان سب میں ایک چیز مشترک تھی۔ یعنی وہ عام مجرموں سے بالکل مختلف تھے اور ان سے وہ برتاؤ نہیں کیا جا سکتا تھا جو اب تک عام مجرموں سے کیا جاتا تھا۔ افسروں کو بھی یہ تسلیم تھا لیکن مروّجہ قانون کے سوا کوئی دوسرے قاعدے موجود نہ تھے۔ نہ اس قسم کا کوئی پچھلا تجربہ اور سابقہ مثال تھی کہ اس کے مطابق عمل کیا جاتا۔ عام طور سے یہ کانگرسی قیدی کچھ زیادہ حلیم اور مسکین نہ تھے۔ اس کے علاوہ جیل میں ان کی اتنی تعداد موجود تھی کہ وہاں بھی انھیں اپنی قوت پر ناز تھا۔ باہر کی زبردست ہلچل اور باہر والوں کی جیل کے حالات سے دلچسپی سونے پر سہاگہ تھی۔ باوجود اس کے کہ ہمارا طرز عمل کسی قدر جارحانہ تھا۔ پھر بھی ہمارا عام رویہ یہی تھا کہ جیل کے افسروں کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ چنانچہ اگر ہم ان کی مدد نہ کرتے تو شاید ان کی مشکلات اور بڑھ جاتیں۔ بیچارہ جیلر اکثر ہمارے پاس آتا تھا اور ہم سے درخواست کرتا تھا کہ ذرا ان بارکوں میں چلے چلئے جہاں آپ کے رضاکار رہتے ہیں اور انھیں سمجھا دیجئے یا کسی بات پر راضی کر دیجئے۔

ہم جیل میں خود اپنی مرضی سے آئے تھے۔ بلکہ بعض رضا کار تو بن بلائے مہمان تھے یعنی زبردستی جیل میں گھس آئے تھے۔ اس لئے ان کے نکل بھاگنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اگر وہ باہر جانا چاہتے تو معافی مانگ کر یا تحریک میں آئندہ کوئی حصّہ نہ لینے کا اقرار کر کے آسانی سے نکل سکتے تھے۔ بھاگنے کا بھی نتیجہ وہی ہوتا کہ وہ مقاومت مجہول کی تحریک سے الگ ہو جاتے اور جو رسوائی ہوتی وہ گھاٹے میں۔ ہمارے لکھنؤ جیل کے سپرنٹنڈنٹ اس بات کو خوب سمجھتے تھے اس لئے وہ اکثر جیلر سے جنھیں "خانصاحب" "خطاب مل چکا تھا، کہا کرتے تھے کہ اگر تم چند کانگریسی قیدیوں کو نکل بھاگنے پہ تیار کردو تو میں سفارش کر کے تمہیں "خان بہادر" کرادوں گا۔

ہمارے بہت سے ساتھی جیل خانے کے اندرونی حصے میں بڑی بڑی بارگوں ں رکھے گئے۔ ہم میں سے کوئی اٹھارہ شخص شاید کچھ بہتر سلوک کے مستحق سمجھے گئے اس لئے ہمیں ایک پرانے پارچہ بافی کے کارخانے میں جگہ دی گئی جس کے سامنے ہت بڑا صحن بھی تھا۔ والد، میرے دو چچازاد بھائیوں اور مجھ کو ایک علیحدہ سائبان ملا ۲۰ فٹ لمبا اور ۱۶ فٹ چوڑا تھا۔ ہمیں ایک بارگ سے دوسری بارگ میں جانے ی بھی پوری آزادی تھی۔ ہمارے عزیز و اقارب اکثر ہم سے ملنے آتے تھے اور ہمیں اخبار بھی پڑھنے کو ملتے تھے۔ چنانچہ نئی نئی گرفتاریوں کی اور تحریک کی غیر معمولی ترقی کی خبریں ہمیں روزانہ ملتی رہتی تھیں اور ان کی وجہ سے ہمارے جوش میں کمی نہ آنے پاتی تھی۔ ہم اپنا زیادہ وقت بحث مباحثہ یا گپ شپ میں گذارتے تھے۔ مجھے پڑھنے لکھنے یا کوئی ٹھوس کام کرنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ علی الصباح اٹھ کر میں اپنے سارے کمرے کو دھوتا اور صاف کرتا تھا۔ پھر والد کے اور اپنے کپڑے دھوتا تھا اس کے بعد چرخہ کاتتا تھا۔ سردیوں کا زمانہ تھا جو شمالی ہند کا بہترین موسم ہوتا ہے۔ شروع شروع میں ہمیں رضا کاروں کا مدرسہ جاری کرنے کی بھی اجازت مل گئی چنانچہ جو لوگ

پڑھے لکھے نہ تھے انھیں ہم اردو، ہندی اور چند ابتدائی مضامین پڑھاتے تھے اور شام کو والی بال کھیلتے تھے۔(۱)

رفتہ رفتہ پابندیاں بڑھنا شروع ہوئیں ہمیں اپنے احاطے سے باہر نکلنے کی اور ان بارگوں میں جانے کی جہاں ہمارے رضاکار مقید تھے۔ ممانعت کر دی گئی چنانچہ یہ مدرسہ بھی بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں میں رہا ہو گیا۔

میں شروع مارچ میں باہر آیا تھا اور چھ سات ہفتے بعد اپریل میں پھر جیل چلا گیا میں نے دیکھا کہ وہاں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ والد نینی تال کے جیل خانے میں بھیج دئے گئے تھے اور ان کی روانگی کے بعد ہی نئے نئے قانون نافذ ہو گئے تھے۔ وہ سب قیدی جو پہلے میرے ساتھ پارچہ بافی کے کارخانے میں رہا کرتے تھے اب جیل کے اندرونی حصے میں منتقل کر دئے گئے تھے اور ان بارگوں میں رہتے تھے جن میں علیحدہ علیحدہ کمرے نہ تھے بلکہ بڑے بڑے ہال تھے۔ ہر بارگ گویا جیل خانے کے اندر ایک اور جیل خانہ تھا اور مختلف جیلوں میں آمد و رفت کی اجازت نہ تھی۔ اب مہینے میں ایک بار عزیزوں سے ملاقات ہو سکتی تھی اور صرف ایک خط آ جا سکتا تھا۔ کھانا بھی اب نسبتاً ادنیٰ درجہ کا ملتا تھا لیکن ہمیں اس کی اجازت تھی کہ باہر سے اپنا کھانا منگا لیں۔

---

(۱) ایک بالکل لغو قصہ اخباروں میں نکلا تھا اور تردید ہو جانے کے باوجود اکثر شائع ہوتا رہتا ہے۔ وہ یہ کہ سر ہارکورٹ بٹلر، گورنر یو۔ پی نے والد کو جیل میں شامپین کی بوتلیں بھیجی تھیں۔ یہ محض غلط ہے۔ سر ہارکورٹ نے والد کو کبھی کوئی چیز جیل میں نہیں بھیجی۔ نہ کبھی کسی شخص نے شامپین یا کسی اور قسم کی شراب بھیجی۔ جب ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے ترک موالات کا اصول اختیار کیا اسی وقت سے والد نے شراب چھوڑ دی تھی اور اس زمانے میں وہ قطعاً تارک شراب تھے۔

جس بارگ میں میں تھا اس میں کوئی پچاس آدمی رہتے تھے جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہاں بڑی بھیڑ ہو گئی تھی۔ ہمارے بستر ایک دوسرے سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اتفاق سے جتنے آدمی اس بارک میں تھے میں ان سب کو جانتا تھا۔ اور ان میں سے بعض میرے دوست بھی تھے۔ لیکن دن رات میں کسی وقت تخلیہ میسر نہ آنا رفتہ رفتہ کھلنے لگا۔ ہمیشہ ایک مجمع ہر شخص کو گھورتا تھا اور بہت سی چھوٹی چھوٹی تکلیفیں اور ناگواریاں رہا کرتی تھیں۔ غرض کوئی ایسا پرسکون گوشہ نہ تھا جہاں انسان چند منٹ چین سے بیٹھ سکے۔ ہم سب کے سامنے نہاتے تھے۔ سب کے سامنے اپنے کپڑے دھوتے تھے۔ ورزش کے لئے بارک کے چاروں طرف دوڑا کرتے تھے۔ ہم اس قدر بکواس اور بحث کرتے تھے کہ معقول گفتگو کرنے کا دم باقی نہ رہتا تھا اور یہ ہماری خانگی زندگی کا، جس کا دائرہ سینکڑوں گنا وسیع ہو گیا تھا، ایک بے رس اور بے کیف نمونہ تھا جس میں خاندان کی خرابیاں تو سب موجود تھیں لیکن خوبی کوئی نہ تھی اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں کے مذاق اور خیالات میں بہت اختلاف تھا۔ ہم سب کو اس سے بڑی سخت کوفت ہوتی تھی اور میں اکثر تنہائی کے لئے تڑپا کرتا تھا۔ اس کے بعد تو ایک زمانے میں مجھے جیل خانے میں ایسی تنہائی اور اتنا تخلیہ ملا کہ مہینوں انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گیا۔ ہاں کبھی کبھی جیل کا کوئی افسر ضرور آنکلتا تھا اس حالت میں بھی میں بہت پریشان رہتا تھا اور اس وقت یہ تمنا تھی کہ کوئی اچھے ساتھی مل جائیں۔ اس وقت مجھے ۱۹۲۲ء کی لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل کی چہل پہل یاد آتی تھی۔ پھر بھی میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دونوں میں، میں پرسکون زندگی کو ترجیح دیتا ہوں بشرطیکہ مجھے پڑھنے لکھنے کا موقع ملے۔

پھر بھی ہمارے سب ساتھی بہت مہذب اور دلچسپ لوگ تھے اور مجموعی طور پر ہماری آپس میں خوب نبھتی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کبھی کبھی

دوسروں سے اکتا جاتا تھا اور چاہتا تھا کہ کچھ دیر کو تنہائی میسّر آجائے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے اتنا تخلیہ نصیب ہوتا تھا کہ بارک سے نکل کر صحن میں بیٹھ جاؤں۔ اب برسات شروع ہو گئی تھی اور بادل گھرا رہتا تھا اور اکثر اس کا موقع مل جاتا تھا میں گرمی بھی برداشت کرتا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار بھی لیکن جہاں تک ممکن ہوتا تھا بارک کے باہر ہی پڑا رہتا تھا۔

کھلے میدان میں لیٹ کر میں آسمان اور بادلوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس سے پہلے شاید کبھی مجھے اس حد تک یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ بادلوں کے بدلتے ہوئے رنگ کس قدر خوش نما معلوم ہوتے ہیں ؎

رنگ برنگ بادلوں کا وہ نقشہ جیسے زمین کے مختلف خطے آپس میں گتھے ہوئے ہوں؛

مزے ہیں اس کے جو لیٹا ہوا یہ نظارہ دیکھتا ہو اور عیش فرصت کو دعائیں دیتا ہو؛

ہمارے لئے یہ فرصت کوئی خوشگوار چیز نہ تھی بلکہ الٹی مصیبت ہو گئی تھی لیکن جتنا وقت میں ان چلتے پھرتے بادلوں کے نظارے میں گزارتا تھا وہ مجھے فرحت و انبساط سے لبریز کر دیتا تھا۔ مجھے اس کی خوشی تھی کہ میں نے اس قیدِ فرنگ سے عارضی چھٹکارا پانے کی ایک نئی ترکیب معلوم کر لی۔ معلوم نہیں اب کی بار برسات نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا یہ اثر نہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ اس کے بعد۔ میں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور سمندروں کے کنارے سے سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے سماں اکثر دیکھے تھے۔ میں اس کے نور میں نہایا تھا اور وقتی طور پر اس کی عظمت و جلال سے متاثر بھی ہوا تھا لیکن عموماً ان چیزوں کو معمولی بات سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتا تھا۔ اب جیل میں سورج کے طلوع اور غروب کا منظر دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں افق ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ بہت دن چڑھے جب سورج کی تمازت بڑھ جاتی تھی تو اس کی شعاعیں ہمارے

قید خانے کی دیواروں پر نمودار ہوتی تھیں۔ رنگ کہیں دیکھنے میں نہ آتے تھے۔ غرض ہماری آنکھیں روز روز وہی مٹیالے رنگ کی دیواریں دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں۔ وہ دھوپ چھاؤں اور رنگوں کی بھوکی تھیں۔ اس لئے جب برسات کے بادل قسم قسم کے روپ بدلتے، طرح طرح کے رنگوں سے کھیلتے، جھومتے، اٹھلاتے اُمڈ کر آسمان پر آتے تو میں حیرت اور مسرّت سے انھیں دیکھتا اور مجھ پر وجد کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ کبھی یہ بادل، کہیں کہیں سے پھٹ جاتے تو ان میں سے وہ حیرت انگیز کرشمہ دکھائی دیتا جو برسات سے مخصوص ہے یعنی گہرے۔ نیلے رنگ کے اتھاہ سمندر میں حسن لامحدود کی ایک جھلک۔

رفتہ رفتہ ہماری پابندیوں میں اضافہ ہوتے لگا۔ اور زیادہ سخت قانون نافذ کئے گئے۔ حکومت کو ہماری تحریک کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا اس لئے وہ چاہتی تھی کہ ہم پر دل کھول کر غصّہ اتارے اور ہمیں اس گستاخی کا مزہ چکھائے کہ ہم نے اس کے مقابلے کی جرأت کی۔ ان نئے قوانین اور ان کے نفاذ کے طریقوں کا یہ لازمی نتیجہ ہوا کہ اکثر جیل کے افسروں اور سیاسی قیدیوں میں اَن بَن ہو گئی۔ کئی مہینے تک ہم سب نے جن کی تعداد لکھنؤ جیل میں کئی سو کے قریب ہو گی، احتجاج کے طور پر عزیز و اقارب سے ملاقات کرنا بند کر دیا۔ افسروں کا یہ خیال تھا کہ ہم میں سے چند آدمی فساد کی جڑ ہیں۔ اس لئے سات اشخاص اصل بارگوں سے دور جیل کے ایک بالکل علیحدہ حصے میں بھیج دیئے گئے۔ یعنی پرشوتم داس ٹنڈن، مہادیو ڈیسائی، جارج جوزف، بال کرشن شرما، دیو داس گاندھی، میں اور ایک اور شخص۔

ہم ایک چھوٹے سے احاطے میں رکھے گئے۔ یہاں کچھ تکلیف ضرور تھی، لیکن مجموعی طور پر ہمیں اس سے بہت خوشی ہوا۔ کیونکہ یہاں کم سے کم وہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی اور ہمیں کچھ زیادہ سکون اور تخلیہ میسر آسکتا تھا۔ اب پڑھنے لکھنے اور دوسرے ضروری کام کرنے کو بھی کافی وقت ملتا تھا۔ جیل کے دوسرے ساتھیوں سے ہمارا کوئی تعلق باقی

نہ رہا تھا۔ نہ باہر کی دنیا کا کوئی حال معلوم ہوتا تھا، کیونکہ اب تمام سیاسی قیدیوں کو اخبار ملنا بند ہو گئے تھے۔

اخبار تو ہمارے پاس نہیں آتے تھے لیکن جس طرح ہمیشہ جیل میں باہر کی خبریں پہنچا کرتی ہیں ہمیں بھی کچھ نہ کچھ خبریں مل ہی جاتی تھیں۔ ہر مہینے جو ملاقاتیں ہوتی تھیں یا جو خطوط آتے تھے ان سے بھی تھوڑا بہت حال معلوم ہو جاتا تھا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اب تحریک کا زور گھٹ رہا ہے۔ وقتی جوش کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور منزل مقصود دور ہٹتی معلوم ہوتی تھی۔ کانگرس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ ایک جماعت طریق کار میں تبدیلی چاہتی تھی اور دوسری اس تبدیلی کی مخالف تھی۔ تبدیلی کے حامیوں کی رہبری دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال نہرو کر رہے تھے۔ یہ جماعت چاہتی تھی کہ اسمبلی اور کونسلوں کے نئے انتخاب میں کانگریس بھی حصہ لے اور اگر ممکن ہو تو ان پر قبضہ کر لے۔ دوسری جماعت کی رہنمائی سری راج گوپال اچاریہ فرما رہے تھے۔ یہ جماعت ترک موالات کے اصل پروگرام میں کوئی ترمیم گوارا کرنے کو تیار نہ تھی۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ تحریک کے وہ زرّیں اصول جنہوں نے ہمیں سیلاب کی طرح آگے بڑھایا تھا اب چھوٹے چھوٹے جھگڑے قضیوں اور اقتدار حاصل کرنے کی سازشوں سے آلودہ ہو رہے تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ جوش و خروش کی رو میں بڑے بڑے من چلے پن کے کام کر گزرنا کتنا آسان ہے۔ اور جب یہ ندی اتر جائے تو مستقل طور پر کام کو جاری رکھنا کتنا مشکل ہے۔ باہر سے جو خبریں آتی تھیں ان سے ہم میں بے دلی پھیلی ہوئی تھی اور پھر اس چڑچڑے پن کی وجہ سے جو جیل میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے ہماری مشکلات اور بڑھ گئی تھیں۔ پھر بھی ہمارے دل کو یہ اطمینان تھا کہ ہم نے خودداری اور وقار کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور چاہے کچھ بھی ہوا ہم راہ راست سے نہیں بھٹکے۔ مستقبل دھندلا نظر آتا تھا اور چاہے وہ کوئی شکل اختیار کرے یہ بات یقینی تھی،

کہ ہم میں سے اکثروں کی قسمت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گذارنا لکھا ہے۔ آپس میں ہم یہی باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جارج جوزف سے اسی قسم کی گفتگو ہوئی تھی اور ہم اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ اب تو جوزف میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے اور وہ ہماری تحریک کی دل کھول کر مخالفت کر رہے ہیں معلوم نہیں کبھی انھیں وہ گفتگو بھی یاد آتی ہے جو لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل کے سول وارڈ میں ایک دفعہ مجھ میں اور ان میں ہوئی تھی؟

غرض ہم روزمرہ کے معمولی کاموں اور ورزشوں سے دل بہلاتے تھے ورزش کی یہ صورت تھی کہ اپنے چھوٹے سے احاطے میں چاروں طرف دوڑ لگایا کرتے تھے یا اپنے صحن کے کنوئیں سے دو دو آدمی بیلوں کی طرح جُت کر چرس سے پانی کھینچتے تھے اور ترکاریوں کے کھیت کو جو ہمارے صحن میں تھا سینچتے تھے۔ ہم میں سے اکثر روزانہ تھوڑا بہت سوت بھی کاتتے تھے۔ لیکن ان سردی کے دنوں اور لمبی لمبی راتوں میں میرا خاص شغل کتابیں پڑھنا تھا۔ جب کبھی سپرنٹنڈنٹ آتا، ہمیشہ مجھے پڑھتے ہوئے پاتا۔ شاید وہ اس سے کچھ کھسیا گیا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے مجھ پر فقرہ کسا اور کہا کہ میں تو اپنا تمام مطالعہ بارہ برس کی عمر ہی میں ختم کر چکا تھا شاید پڑھنے سے یہ گریز ہی اس بہادر انگریز کرنل کے کام آیا اور اس نے اسے پریشان کن خیالات سے بچا لیا۔ اور شاید اسی کی بدولت وہ صوبہ متحدہ میں جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچا۔

جاڑے کی راتیں پہاڑ سی ہوتی ہیں اور اس زمانے میں ہندوستان میں مطلع بہت صاف ہوتا ہے چنانچہ ہمیں ستارے دیکھنے کا شوق ہو گیا۔ بعض نقشوں کی مدد سے ہم نے بہت سے ستاروں کو پہچان لیا۔ پھر تو ہر رات ہم ان کے نکلنے کا انتظار کیا کرتے تھے اور ان کا اس مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے تھے۔ جیسے کوئی

اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملتا ہے۔

اس طرح ہمارا وقت گذر رہا تھا۔ دنوں کے ہفتے اور ہفتوں کے مہینے ہوتے جاتے تھے۔ ہم روز کی مقررہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن باہر سارا بوجھ ہماری عورتوں پر، ہماری ماؤں، بیویوں اور بہنوں پر پڑ گیا تھا۔ وہ ہمارا انتظار کرتے کرتے اکتا گئی تھیں اور انھیں خود اپنی آزادی پر شرم معلوم ہوتی تھی جبکہ ان کے پیارے جیل خانے کی آہنی سلاخوں میں بند تھے۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہماری پہلی گرفتاری کے بعد ہی پولیس نے آنند بھون کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ والد پر اور مجھ پر عدالت سے کچھ جرمانہ بھی ہوا تھا وہ اسی کو وصول کرنے آتی تھی لیکن کانگریس کا حکم یہ تھا کہ جرمانہ ادا نہ کیا جائے۔ اس لئے پولیس آئے دن آدھمکتی تھی۔ اور فرنیچر میں سے جو کچھ ہاتھ لگتا وہ قرق کرکے لیجاتی تھی۔ میری لڑکی اندرا اس وقت چار سال کی تھی۔ اسے روز کی اس لوٹ مار پر بڑا غصہ آیا چنانچہ اس نے پولیس والوں کے سامنے سخت احتجاج کیا اور ان پر بہت بگڑی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے یہ ابتدائی تاثرات ہمیشہ کے لئے اسے ساری پولیس سے بدظن کر دیں گے۔

اس کی انتہائی کوشش کی جاتی تھی کہ ہم غیر سیاسی قیدیوں سے نہ ملنے پائیں اس لئے سیاسی قیدیوں کے لئے خاص جیل مخصوص تھے لیکن کبھی نہ کبھی یہ قیدی ہمیں مل جاتے تھے۔ ہمیں براہ راست بھی اور ان قیدیوں کے ذریعے سے بھی جیل کی زندگی کی حقیقت معلوم ہوئی۔ یہ گویا تشدد، لوٹ مار اور بد اخلاقیوں کی ایک دردناک داستان تھی، کھانا بھی انھیں بہت خراب ملتا تھا۔ میں نے خود بارہا یہ کھانا منگا کر کھانے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کسی طرح انسانوں کے کھانے کے قابل نہ تھا۔ عملہ عموماً نا اہل تھا اور اسے بہت تھوڑی تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن جب موقع ملتا تھا وہ قیدیوں اور ان کے رشتہ داروں سے کچھ نہ کچھ وصول

کرکے اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا جیل مینویل میں جیلر، نائب جیلر اور وارڈروں کی جو ذمہ داریاں اور فرائض درج تھے وہ تعداد میں اتنے زیادہ اور نوعیت میں اتنے مختلف تھے کہ کوئی انسان پوری طرح ان کی پابندی نہیں کر سکتا تھا ورشاید دوسرے صوبوں میں بھی جیل کی انتظامی پالیسی کو قیدیوں کی اصلاح سے یا ان کو نیکی کی تلقین کرنے اور کارآمد پیشے سکھانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جیل میں محض قیدیوں کو ستانے کے خیال سے مشقت لی جاتی تھی[1]

دراصل قیدی کو خوفزدہ کرنا اور اس سے بے چون وچرا تابعداری کرانا مقصود تھا تاکہ وہ دل میں جیل کی دہشت لے کر واپس جائے اور آئندہ قید کے ڈر سے پھر کسی جرم کا مرتکب نہ ہو۔

اب چند سال سے جیل کے حالات میں کچھ اصلاح ہوتی ہے کھانا اور کپڑا

---

(۱) یوپی جیل مینویل کا دفعہ ۹۸۷ جسے اب نئے اڈیشن سے حذف کر دیا ہے یہ تھا کہ :-

"جیل کی مشقت کا مقصد قیدیوں کو محض کام میں لگائے رکھنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد سزا دینا ہے۔ اس لئے اس چیز کو کوئی اہمیت نہ دینا چاہیئے کہ ان سے ایسے کام لئے جائیں جن سے آمدنی کافی ہو بلکہ خاص طور پر یہ لحاظ رکھنا چاہیئے کہ جیل میں مشقت اتنی دشوار اور ناقابل برداشت ہو کہ مجرم اس سے ڈریں"

اس کے مقابلے میں ذرا روسی تعزیرات کے چند دفعات ملاحظہ کیجئے۔

دفعہ ۹ - سماجی مدافعت کے قوانین کا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگوں کو جسمانی تکلیف پہنچائی جائے یا انسانوں کو ذلیل کیا جائے یا انتقام لیا جائے اور سزا دی جائے۔

دفعہ ۲۶ - سزائیں سماجی مدافعت کا ایک ذریعہ ہیں اس لئے ان میں ظلم کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیئے اور مجرم کو غیر ضروری اور نامناسب تکلیف نہ پہنچانا چاہیئے۔

بھی کچھ بہتر ملتا ہے اور دوسری باتوں میں بھی کسی قدر فرق ہو گیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ جو سیاسی قیدی رہا ہو کر باہر آئے انھوں نے ان ناگفتہ بہ حالات کے خلاف سخت جدو جہد کی۔ ترک موالات کی وجہ سے وارڈروں کی تنخواہوں میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تاکہ وہ سرکار کے اور زیادہ وفادار رہیں۔ اب لڑکوں اور نوعمر قیدیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی کچھ یوں ہی سی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ یہ تمام اصلاحیں غنیمت ہیں مگر ان سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کیونکہ روح تو ابتک وہی موجود ہے۔

زیادہ تر سیاسی قیدیوں کے ساتھ عام قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ انھیں کوئی خاص رعائتیں حاصل نہ تھیں، نہ وہ کسی خاص سلوک کے مستحق قرار دیے گئے تھے لیکن چونکہ وہ عام قیدیوں سے زیادہ سمجھدار اور دلیر تھے اس لئے ان سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا اور نہ ان سے جا بیجا روپیہ وصول کیا جا سکتا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سارا عملہ ان سے بغض رکھتا تھا اور جب موقع ملتا تھا جیل کے ضابطوں کی ذرا سی خلاف ورزی پر انھیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ کسی قسم کی معمولی سی لغزش پہ ایک پندرہ سولہ برس کے لڑکے کو جو اپنے آپ کو آزاد کہتا تھا کوڑے لگانے کی سزا دی گئی۔ جب اسے ننگا کر کے ٹکٹکی سے باندھا گیا اور کوڑے پڑنا شروع ہوئے تو ہر کوڑے پر وہ "مہاتما گاندھی کی جے" کا نعرہ لگاتا تھا۔ ہر بار جب کوڑا اس کی کھال میں پیوست ہو کر نکلتا تھا اور خون کا فوّارہ چھوٹتا تھا تو اس کی زبان سے یہی نعرہ نکلتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ بعد کو یہی لڑکا شمالی ہند کے تخویف پسندوں کا سرگروہ بن گیا۔

(۱۴)

دوبارہ رہائی

جیل میں انسان کو اکثر چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن شاید سب سے زیادہ وہ عورتوں کی نرم آواز اور بچوں کے معصوم قہقہوں کو ترستا ہے۔ یہاں عموماً جو آوازیں کانوں میں پڑتی ہیں وہ کچھ خوش گوار نہیں ہوتیں۔ لوگوں کا لہجہ درشت اور تحکمانہ ہوتا ہے اور زبان وحشیانہ جس میں گالیوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ تو ایک عجیب خواہش کا احساس ہوا یعنی لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں یکایک مجھے یہ خیال آیا کہ سات آٹھ مہینے سے میں نے کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں سنی ہے۔

۱۳ جنوری ۲۲ء کو لکھنؤ جیل کے سارے سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے اس وقت لکھنؤ میں اسپیشل کلاس کے قیدیوں کی تعداد سو اور دو سو کے درمیان ہو گی جن لوگوں کو ۲۱ء کے آخر یا ۲۲ء کے شروع میں کم و بیش ایک سال کی سزا ہوئی تھی، وہ تو اپنی میعاد پوری کر کے رہا ہو چکے تھے۔ البتہ جن کی لمبی سزائیں تھیں یا جو دوبارہ سزایاب ہوئے تھے وہ باقی تھے۔ ہمیں اس اچانک رہائی پر حیرت ہو گئی کیونکہ عام معافی کا کوئی تذکرہ سننے میں نہ آیا تھا۔ البتہ صوبہ متحدہ کی کونسل نے یہ قرارداد ضرور منظور کی تھی کہ تمام سیاسی قیدیوں کو فوراً آزاد کر دیا جائے لیکن ہم جانتے تھے کہ حکومت کب اس قسم کے مطالبوں کی پروا کرتی ہے۔ ہوا یہ کہ خود حکومت نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ کانگریس اس وقت حکومت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہی تھی اور کانگریسی خود آپس میں دست و گریباں تھے۔ اس کے علاوہ

اکثر مشہور لیڈر رہا ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ مہربانی کی گئی۔

جیل کے پھاٹک سے باہر نکل کر ہر انسان کو اطمینان اور مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ تازہ ہوا اور کھلے میدان، سڑکوں کی چہل پہل، بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملاقات۔ ان سب چیزوں سے مل ملا کر ایک نشہ سا ہو جاتا ہے۔ اور پہلے پہل اس کی حرکتیں خفقان کے مریض کی سی ہوتی ہیں۔ ہم پر بھی یہ کیفیت طاری ہوئی۔ لیکن زیادہ دیر تک نہیں رہی کیونکہ اس وقت کانگریس کی سیاست بہت بری حالت میں تھی۔ اعلیٰ مقاصد کے بجائے سازشوں کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ اس کوشش میں تھے کہ کانگریس کا سارا نظام ہمارے ہاتھ میں آجائے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایسے ناروا طریقے استعمال کر رہے تھے جس کی وجہ سے حساس لوگ سیاست کے نام سے گھبرا تے ہیں۔

میں خود داخلہ کونسل کے قطعاً خلاف تھا کیونکہ میری نظر میں اس کا یہ نتیجہ ہونے والا تھا کہ ہم خواہ مخواہ سمجھوتوں پر اتر آئیں گے اور ہمارا اصل مقصد رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا لیکن حقیقت میں اس وقت ملک کے سامنے کوئی دوسرا سیاسی پروگرام ہی نہ تھا۔ تبدیلی کے مخالف "تعمیری کام" پر زور دیتے تھے۔ یہ حقیقت میں سماجی اصلاح کا پروگرام تھا اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہمارے کارکنوں کو عام لوگوں سے میل جول کا موقع ملتا تھا لیکن اس سے وہ لوگ مطمئن نہ ہو سکتے تھے، جو عملی سیاست کے قائل تھے۔ عملی احتجاج کی تحریک اس زور شور سے اٹھی اور ناکامیاب رہی کہ اب دستوری تحریک کی باری تھی۔ اس تحریک کو بھی اس کے بانیوں یعنی دیش بندھو داس اور میرے والد نے حکومت کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے اور اس کی مخالفت کرنے کی شکل میں اٹھایا تھا تعاون اور تعمیر کی حیثیت سے نہیں۔

مسٹر سی۔آر۔ داس ہمیشہ سے داخلۂ کونسل کے حامی تھے تاکہ اس محاذ سے بھی قومی جنگ لڑی جا سکے۔ میرے والد کی بھی یہی رائے تھی۔ ۱۹۲۳ء میں جو انھوں نے کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا منظور کر لیا تھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو گاندھی جی کی رائے کا تابع کر دینا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنگ میں پوری طاقت سے شریک ہوں اور اس کی صورت صرف یہی تھی کہ وہ گاندھی جی کے نظریہ کو حرف بہ حرف قبول کر لیں۔ اس وقت سن فین جماعت کی مثال ہمارے سامنے تھی کہ اس نے دارالعوام کی نشستوں پر قبضہ کر کے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ ہمارے اکثر نوجوان اس سے متاثر تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی سے کہا تھا کہ بائیکاٹ کا یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔ ان معاملات میں وہ بہت سخت ہیں مولانا محمد علی اس وقت خلافت کا وفد لے کر یورپ گئے تھے۔ واپسی پر انھوں نے بائیکاٹ کے طریقہ کو پسند نہ کیا اور فرمایا کہ میں تو سن فین جماعت کا رویہ بہتر سمجھتا ہوں لیکن اس معاملے میں دوسروں کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اس لئے کہ ہونا وہی تھا جو گاندھی جی چاہتے تھے۔ وہ تحریک کے بانی تھے اس لئے عام طور پر یہ خیال تھا کہ جزویات کے معاملے میں انھیں پوری آزادی ملنی چاہیئے۔ سن فین طریقے پر ان کا خاص اعتراض یہ تھا کہ (اس سے قطع نظر کہ وہ تشدد کے حامی ہیں) عوام جس خوبی سے بائیکاٹ کو اور ووٹ نہ دینے کے مفہوم کو سمجھ سکیں گے۔ اس طرح سن فین طریقہ ان کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اگر ہم اپنے آپ کو منتخب کرا کے پھر کونسل میں نہ جائیں گے تو اس سے عوام کے ذہن میں ایک الجھن سی پیدا ہو گی۔ دوسرے یہ کہ اگر ایک مرتبہ ہمارے آدمی منتخب ہو جائیں گے تو پھر انھیں کونسلوں سے لگاؤ پیدا ہو جائے گا اور وہ انھیں مشکل سے چھوڑ سکیں گے۔ ہماری تحریک میں ابھی نہ تو اتنا انضباط ہے نہ اسے اتنی قوت حاصل ہے کہ انھیں زیادہ عرصے تک

کونسلوں میں جانے سے روکا جا سکے۔ اس لئے کونسلوں کے ذریعے حکومت کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے بہت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طریقے استعمال کئے جائیں گے جن سے ہماری اخلاقی حالت پر بڑا برا اثر پڑے گا۔

یہ دلائل بہت وقیع تھے اور ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں جب سوراج پارٹی کونسلوں میں گئی تو ہم نے دیکھا کہ گاندھی جی کا خیال بہت کچھ صحیح ثابت ہوا پھر بھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر واقعی ۱۹۲۰ء میں کانگرس نے کونسلوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوتا تو معاملات کیا صورت اختیار کرتے۔ چونکہ اس وقت کانگریس کو خلافت کمیٹی کی حمایت بھی حاصل تھی اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسمبلی اور کونسلوں کی قریب قریب تمام انتخابی نشستوں پر قبضہ ہو جاتا۔ اب (اگست ۱۹۳۴ء میں) پھر یہ تجویز ہو رہی ہے کہ اسمبلی کے انتخابات میں کانگریس کی طرف سے امیدوار کھڑے کئے جائیں۔ چنانچہ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہو گیا ہے لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد سے ایسے ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں کہ ہمارے سماجی اور سیاسی اتحاد میں بہت سے رخنے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے ۱۹۲۰ء میں جتنی کامیابی کی امید ہو سکتی تھی۔ آئندہ انتخابات میں وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے بعض دوسرے حضرات کے ساتھ مل کر دونوں فریقوں میں سمجھوتا کرانے کی کوشش کی لیکن ہمیں بہت کم کامیابی ہوئی اور میں تغیر کے حامیوں اور مخالفوں کے جھگڑوں سے عاجز آ گیا۔ یو۔پی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے میں کانگریس کی تنظیم میں مصروف ہو گیا۔ سال گذشتہ کانگرس میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے بہت کچھ کام کرنے کو تھا۔ اس لئے میں نے بہت سخت محنت کی لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان دنوں کوئی خاص کام نہ ہونے کی وجہ سے میں کچھ پریشان سا تھا کہ یکایک ایک نیا میدان

میرے سامنے آگیا۔ رہائی کے چند ہفتے کے اندر ہی میں الہ آباد میونسپلٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ یہ انتخاب بالکل غیر متوقع تھا کیونکہ انتخاب سے ۵ منٹ پہلے تک میرا نام پیش نہیں ہوا تھا۔ بلکہ شاید کسی کو اس کا خیال تک نہ تھا۔ بالکل آخری وقت میں کانگریس پارٹی نے یہ اندازہ کیا کہ کانگریسیوں میں صرف مجھی کو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے لہٰذا انھوں نے میرا نام پیش کر دیا۔ اور میں منتخب ہو گیا۔

اس سال اتفاق سے تمام ملک میں مشہور کانگریسی میونسپلٹی کے صدر ہوئے۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس کلکتہ کارپوریشن کے پہلے میئر منتخب ہوئے۔ مسٹر وٹھل بھائی پٹیل بمبئی کارپوریشن کے صدر ہوئے اور سردار ولبھ بھائی پٹیل احمدآباد میونسپلٹی کے۔ یو پی میں بھی کانگریسی تمام بڑی بڑی میونسپلٹیوں کے صدر ہو گئے۔

اب مختلف قسم کے بلدی کاموں سے مجھے دلچسپی پیدا ہونے لگی اور میں روز بروز اس میں زیادہ وقت دینے لگا۔ اس کے بعض پہلوؤں سے تو مجھے ایک خاص شغف ہو گیا تھا۔ میں نے اس موضوع کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ شہر کے انتظام میں اصلاحیں کرنا چاہیئے۔ بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ بالفعل ہندوستانی میونسپلٹیوں کا نظام کچھ ایسا ہے کہ بڑی اصلاحیں کرنے اور اولوالعزمی دکھانے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ کام کرنے کا موقع ضرور تھا یعنی یہ کوشش ہو سکتی تھی کہ اس مشین کے پرزوں کی صفائی کر دی جائے تاکہ اس کی رفتار تیز ہو جائے۔ اسی خیال سے میں نے خاصی محنت کی۔ اس زمانے میں میری کانگریس کی مصروفیت بھی بڑھنے لگی اور صوبہ کانگریس کمیٹی کے سکریٹری ہونے کے علاوہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سکریٹری بھی بنا دیا گیا۔ ان فرائض کے ادا کرنے میں اکثر مجھے روزانہ پندرہ گھنٹے تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اور جب رات گئے میں کام ختم کرتا تھا تو تھک کر چور ہو جاتا تھا۔

جیل سے واپس آنے کے بعد سب سے پہلا خط جو میری نظر سے گذرا وہ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر گرم وڈ مئیرس کا تھا۔ یہ خط میری رہائی سے پہلے کا لکھا ہوا تھا لیکن غالباً اس وقت انھیں یہ علم ہو چکا تھا کہ میں عنقریب رہا کر دیا جاؤں گا۔ انھوں نے بڑے شفقت آمیز الفاظ میں یہ خط لکھا تھا اور مجھے یہ دعوت دی تھی کہ میں کبھی کبھی ان سے ملا کروں۔ مجھے ان کا یہ رویہ دیکھ کر تھوڑی سی حیرت ہوئی کیونکہ میں ان سے بہت کم واقف تھا۔ وہ ۱۹۱۹ء میں اس وقت الہ آباد آئے تھے۔ جبکہ میں وکالت چھوڑتا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے صرف ایک مقدمے میں ان کے سامنے بحث کی تھی اور ہائی کورٹ میں یہ میرا آخری مقدمہ تھا کسی وجہ سے انھیں مجھ سے غائبانہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بعد میں انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کا خیال تھا کہ میں انتہا پسند ہو جاؤں گا۔ اس لئے وہ مجھ پر اتنا اثر رکھنا چاہتے تھے کہ میں برطانوی نقطۂ نظر کو سمجھ سکوں۔ ترکیب تو انھیں خوب سوجھی تھی۔ بہت سے انگریزوں کی طرح ان کی بھی یہ رائے تھی کہ ہندوستان کے اکثر انتہا پسند محض اس وجہ سے برطانیہ کے مخالف ہو گئے ہیں کہ معاشی حیثیت، سے انگریز ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے رنجش اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔ یہ قصہ بھی مشہور ہے اور ذمہ دار حضرات کی زبان سے سنا گیا ہے کہ والد انگریزوں کے ایک کلب میں داخل نہیں کئے گئے اس لئے وہ انتہا پسند اور برطانیہ کے مخالف ہو گئے یہ محض بے بنیاد فسانہ ہے اور دراصل ایک دوسرا واقعہ توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کر دیا گیا ہے (۱) لیکن ان روایات سے چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط اکثر انگریز یقین

---

(۱) اس واقعہ کی تفصیل کے لئے باب ۴۸ کا حاشیہ ملاحظہ کیجئے۔

کر لیتے ہیں کہ ہو نہ ہو قومی تحریک اور برطانیہ کے خلاف اشتعال کی یہی وجہ ہے۔ سچ پوچھئے تو نہ والد کو اور نہ مجھے انگریزوں سے اس قسم کی کوئی شکایت پیدا ہوئی انفرادی حیثیت سے انگریز ہمیشہ ہم سے بڑے اخلاق سے پیش آئے اور ہمارے ان سے بہت اچھے مراسم رہے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی کی حیثیت سے ہمیشہ یہ خیال ہمیں ستاتا تھا کہ ہماری قوم ان کی محکوم ہے۔ سچ پوچھئے تو اب بھی انگریزوں سے میری خوب نبھتی ہے سوا سرکاری افسروں کے جو مجھ پر رعب جمانا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس میں بھی ایک تفریح کا پہلو ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ شاید انگریزوں سے میں اتنا دور نہیں ہوں جتنے لبرل حضرات یا اور بزرگ جو ہندوستان میں انگریزوں سے سیاسی تعاون کرتے ہیں۔

سر گرم وڈ کا مقصد یہ تھا کہ دوستانہ مراسم صاف گوئی اور خوش اخلاقی سے کام لے کر رنجش کی اصل بنا کو دور کر دیں۔ میں ان سے اکثر ملتا تھا اور وہ بھی کسی میونسپل ٹیکس کے خلاف احتجاج کرنے کے بہانے سے میرے پاس آتے تھے اور دوسرے مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ ایک بار تو انھوں نے ہندوستانی لبرلوں کو خوب کھری کھری سنائیں اور کہا کہ وہ نرے موم کی ناک، بے پیندے کے برتن، اور ہوا کے رُخ پر چلنے والے ہیں بلکہ ان کے الفاظ اس سے زیادہ سخت اور حقارت آمیز تھے پھر سے کہنے لگے "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں"۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ان باتوں سے میں خوش ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے گفتگو کا رُخ نئی کونسلوں و وزارتوں کی طرف پھیر دیا۔ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ان وزارتوں کے ذریعے ملک کی خدمت کرنے کے بہت سے موقعے نکل سکتے ہیں مثلاً تعلیم کا مسئلہ ملک کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیا ایک وزیر تعلیم کو جسے اپنی مرضی کے مطابق

عمل کرنے کی آزادی ہو لاکھوں کی قسمتیں بدلنے اور ان کی زندگیاں بنانے کا زرّین موقعہ حاصل نہیں ہے؟ یہاں سے وہ گریز کرکے اصل مقصد پہ آئے اور فرمایا کہ فرض کیجیے آپ جیسا شخص جو ذہین۔ دیانت دار اور با اصول ہو اور جس میں کچھ کرنے کی ہمت اور جوش بھی ہو صوبہ کا وزیر تعلیم ہو جائے تو کیا کچھ نہ کر دکھائے گا۔ اس کے بعد انھوں نے گورنر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا جو حال ہی میں ہوئی تھی اور مجھے یقین دلایا کہ تمہیں اپنی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی پوری آزادی ہو گی۔ پھر فوراً ہی انھیں احساس ہوا کہ شاید وہ حد سے بڑھ گئے اس لئے وہیں سے بات بنائی اور کہا کہ ظاہر ہے میں کسی کی طرف سے سرکاری طور پہ زبان تو دے نہیں سکتا۔ صرف ذاتی طور پہ ایک تجویز پیش کر رہا ہوں۔

سرگرم ووڈ نے جس حکمت عملی اور داؤں پیچ سے یہ تجویز پیش کی، اس سے میں بہت محظوظ ہوا۔ یہ خیال تو کبھی آ ہی نہیں سکتا تھا کہ وزیر کی حیثیت سے حکومت کے ساتھ کام کروں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ میرے لئے کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی میرے دل میں یہ تمنا ضرور پیدا ہوئی کہ کاش مجھے ٹھوس اور مستقل تعمیری کام کرنے کا موقع ملتا۔ کسی کام کو بگاڑنا، مخالفانہ جدوجہد یا ترک موالات کرنا انسان کے لئے کوئی طبعی چیز نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے۔ ہماری قسمت ہی میں یہ لکھا ہے کہ ہم اس سرزمین تک جہاں ہمیں کچھ تعمیر کرنا ہے جنگ و جدال اور تباہیوں کے ریگستان میں سے گذر کر پہنچیں۔ شاید ہم میں سے اکثر لوگ اپنی زندگیاں انھیں دشوار گذار منزلوں کو طے کرنے میں صرف کر دیں گے اور ہماری اولاد یا اولاد کی اولاد کو یہ موقع نصیب ہو گا کہ وہ تعمیر شروع کر سکے۔

اس زمانے میں کم سے کم صوبہ متحدہ میں وزارتیں ٹکے سیر بکتی تھیں وہ دو لبرل حضرات جو ترک موالات کے زمانے میں وزارت پہ مامور تھے علیحدہ ہو چکے تھے۔

جب تک کانگرس کی تحریک سے موجودہ نظام کے تہ و بالا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس وقت تک حکومت نے کانگرس سے لڑنے کے لئے لبرل وزیروں کو آلۂ کار بنا رکھا تھا۔ اس وقت ان کی بڑی قدر اور عزت تھی۔ کیونکہ حکومت اسی کو غنیمت سمجھی تھی کہ دکھانے کے لئے اس کے کچھ حامی تو رہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ قدر و منزلت ان کا حق ہے حالانکہ یہ تو محض کانگریس کے زبردست حملے کا ایک ردعمل تھا۔ چنانچہ جب یہ حملہ ختم ہو گیا تو یہ لبرل وزیر بھی حکومت کی نظروں سے گر گئے اور ان کی قدر و منزلت کافور ہو گئی۔ وزیروں کو بہت برا معلوم ہوا مگر کر کیا سکتے تھے۔ آخر وہ استعفا دینے پر مجبور ہو گئے اس کے بعد نئے وزیروں کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر اس میں جلد کامیابی نہیں ہوئی۔ کونسل میں جو مٹھی بھر لبرل تھے انھوں نے اپنے رفقا کی وفاداری میں جنکے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تھی، وزارت قبول کرنے سے گریز کیا۔ باقی ممبر زیادہ تر زمیندار تھے۔ ان میں معدودے چند ایسے ہوں گے جنھیں تھوڑا بہت تعلیم یافتہ کہا جاسکتا تھا۔ چونکہ کانگریس نے کونسلوں کا بائیکاٹ کر دیا تھا، اس لئے وہاں عجیب عجیب طرح کے لوگ پہنچ گئے تھے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ اسی زمانے میں یا اس کے کچھ عرصے بعد ایک صاحب کو یو۔ پی میں وزارت پیش کی گئی تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے یہ مغالطہ نہیں ہے کہ میں غیر معمولی طور پر عقل مند آدمی ہوں۔ پھر بھی میں اپنے خیال میں اور شاید دوسروں کے نزدیک بھی تھوڑی بہت عقل ضرور رکھتا ہوں۔ کیا حکومت چاہتی ہے کہ میں وزارت قبول کر کے دنیا پر ظاہر کروں کہ میں محض احمق ہوں۔

اس طعن میں کچھ حقیقت ضرور تھی۔ لبرل وزیر اگرچہ تنگ خیال تھے اور سیاسی یا سماجی معاملات میں ان کی نظر وسیع نہ تھی لیکن یہ محض ان کے غلط عقیدے کا قصور تھا۔ کم سے کم ان میں آئینی قابلیت تو تھی اور انھوں نے معمولی دفتری

کام تو سمجھ بوجھ کر کیا، لیکن ان کے جانشینوں نے جو زمیندار طبقے کے افراد تھے معمولی تعلیم بھی واجبی ہی واجبی پائی تھی۔ میرے نزدیک تو ان کے متعلق بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گورنر نے انھیں محض اس وجہ سے منتخب کر کے اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا ہے کہ ہندستانیوں کی نااہلیت ثابت ہو سکے۔ ان پر ریچرڈ گارنٹ کا یہ مصرع بالکل صادق آتا تھا۔

"قسمت نے تجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا"

"تاکہ دنیا یہ کہہ سکے کہ وہ جو چاہے کر سکتی ہے"

بہرحال یہ وزرا تعلیم یافتہ ہوں یا نہ ہوں مگر انھیں زمیندار ممبروں کی تائید حاصل تھی اور وہ اعلیٰ افسروں کو عمدہ عمدہ پارٹیاں دے سکتے تھے۔ فاقہ کش کسانوں کی گاڑھی کمائی کا اس سے بہتر اور کیا مصرف ہو سکتا تھا۔

(۱۵)

شکوک اور ذہنی کش مکش

میں نے اپنے لئے طرح طرح کی مصروفیتیں پیدا کرلیں تاکہ میں جن الجھنوں میں پڑا ہوا تھا، ان کو بھول جاؤں، لیکن سوالوں سے کہاں نجات مل سکتی تھی جو میرے دل و دماغ میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے تھے اور جن کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اب عمل کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے آپ سے پیچھا چھڑاؤں۔ سنہ ۱۹۲۰ اور سنہ ۱۹۲۱ء کی طرح اب میری سرگرمیاں سراسر اظہار خودی کے لئے نہیں تھیں۔ یوں سمجھئے کہ میں نفس کی تنگ چاردیواری کو توڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ اور اب ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بہت سی نئی چیزیں، نئے خیالات، نئی تحریکیں دیکھیں جن پر اب تک نظر ہی نہیں پڑتی تھی۔ روشنی کی جگہ بڑھتی ہوئی تاریکی کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ گاندھی جی کی رہبری پر مجھے اب بھی پورا اعتماد تھا لیکن اب میں ان کے پروگرام کے بعض حصوں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اس میں ایک مشکل یہ تھی کہ وہ جیل میں تھے اور ان کی رائے اور مشورے سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا اس وقت کانگریس میں دو جماعتیں تھیں یعنی داخلۂ کونسل کی حامی جماعت اور سابقہ پروگرام میں تبدیلی کی مخالف جماعت۔ مجھے ان دونوں میں سے کسی سے دلچسپی نہ تھی۔ پہلی جماعت تو کھلم کھلا اصلاح پسندی اور آئین پرستی کی طرف جا رہی تھی جو میرے نزدیک بند گلی کا راستہ تھا۔ یہ ہے تبدیلی کے مخالف تو وہ اگرچہ مہاتما کے کٹر چیلے سمجھے جاتے تھے لیکن بڑے لوگوں کے تمام چیلوں کی طرح وہ بھی ان کی تعلیم کی روح کے نہیں بلکہ الفاظ کے

پجاری تھے۔ ان میں کوئی موثر چیز نہ تھی اور عملی طور پر وہ بے ضرر، اللہ والے لوگ تھے جن کی حیثیت سماجی مصلحین سے زیادہ نہ تھی البتہ ان میں ایک خوبی ضرور تھی یعنی کسانوں سے ان کا رشتہ برابر قائم تھا سوراج پارٹی والوں سے جو کونسلوں کے داؤں پیچ میں پھنس کر رہ گئے تھے یہ پھر بھی اچھے تھے۔

میرے رہا ہوتے ہی دیش بندھو داس نے مجھے اپنا ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی۔ اگرچہ خود میرے ذہن میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے لیکن میں ان کی دلیلوں سے متاثر نہیں ہوا میرے والد کو بھی سوراج پارٹی قائم کرنے کی دُھن تھی۔ یہ ان کی عجیب غریب خصوصیت تھی کہ انھوں نے اس معاملے میں کبھی مجھ پر زور یا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ اگر میں ان کا شریک کار ہو جاتا تو انھیں بڑی مسرت ہوتی لیکن انھیں میرے جذبات کا بڑا پاس تھا۔ اس لئے اس معاملے میں انھوں نے مجھے میری مرضی پر چھوڑ دیا۔

اس زمانے میں مسٹر سی۔ آر۔ داس اور میرے والدین بہت گہری دوستی ہو گئی۔ اس کی نوعیت سیاسی رفاقت سے کہیں زیادہ تھی اس میں وہ گرمجوشی اور خلوص تھا کہ مجھے دیکھ کر حیرت ہو گئی۔ کیونکہ زیادہ عمر میں گہری دوستیاں بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ میرے والد کے سینکڑوں ملنے والے تھے اور قدرت نے انھیں یہ ملکہ عطا کیا تھا کہ وہ سب کے ساتھ ہنسی خوشی سے گذار دیتے تھے، لیکن دوستی کے معاملے میں وہ بہت محتاط تھے بلکہ آخری عمر میں تو بہت روکھے ہو گئے تھے۔ تاہم دیش بندھو کے اور ان کے بیچ سے تمام رکاوٹیں رفتہ رفتہ ہٹ گئی تھیں اور ان کے دل ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ میرے والد ان سے نو برس بڑے تھے۔ لیکن جسمانی حیثیت سے وہ ان سے زیادہ قوی اور تندرست تھے۔ اگرچہ دونوں نے قانونی تربیت پائی تھی اور وکالت میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن بہت سی باتوں میں

وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مسٹر داس وکیل ہونے کے باوجود شاعر تھے اور جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھوں نے بنگلہ زبان میں بڑی عمدہ نظمیں لکھی ہیں وہ بڑے اچھے خطیب تھے اور طبیعت میں مذہبی رجحان تھا۔ بہ خلاف ان کے میرے والد خشک عملی آدمی تھے اور انھیں تنظیم کا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ مذہب سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ایک جنگجو سپاہی کی طرح ہمیشہ مارنے مرنے کو تیار رہتے تھے۔ جن لوگوں کو وہ بیوقوف سمجھتے تھے ان سے نبھانا ان کے لئے ناممکن یا کم سے کم دشوار تھا اور مخالفت کی انھیں مطلق برداشت نہیں تھی اسے وہ اعلان جنگ سمجھ کر لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ غرض دیش بندھو اور والد باوجود اتنے اختلافات کے باہم شیر و شکر ہو گئے۔ اور سوراج پارٹی کی رہنمائی کے لئے یہ عجیب و غریب زبردست جوڑی بن گئی جس میں ایک شخص دوسرے کی کمزوریوں کی تلافی کرتا تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے پر بے حد اعتماد تھا۔ یہاں تک کہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو عام اجازت تھی کہ وہ ہر بیان یا ہر اعلان پر بغیر پوچھے دوسرے کے دستخط کر سکتے ہیں۔

یہی وہ شخصی عنصر تھا جس نے سوراج پارٹی کو اتنا مستحکم کر دیا اور جس کی بدولت اسے ملک میں اس قدر قوت اور اقتدار حاصل ہو گیا۔ لیکن شروع ہی سے اس میں تفریق کے عناصر موجود تھے کیونکہ بہت سے نام و نمود چاہنے والے اس خیال سے اس میں شریک ہو گئے تھے کہ کونسلوں کے ذریعے سے ترقی کے مدارج آسانی سے طے ہو سکیں گے پھر اس میں بعض پکے اعتدال پسند بھی تھے جن کا خیال تھا کہ حکومت سے اور زیادہ تعاون کیا جائے۔ انتخاب کے بعد جیسے ہی یہ رجحانات ظاہر ہوئے پارٹی کے لیڈروں نے ان کی سختی سے مخالفت کی۔ میرے والد نے تو صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ "سڑے گلے عضو" کو کاٹ پھینکنے میں ذرا تامل نہ کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے اس پر عمل بھی کیا۔

سنہ ۱۹۲۳ء کے بعد سے مجھے گھر پر بڑا سکون اور مسرت حاصل ہونے لگی اگرچہ میں وہاں بہت کم وقت گذارتا تھا۔ میں اس معاملے میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ سارے خاندان سے میرے تعلقات بڑے خوشگوار ہیں اور پریشانی اور مصیبت کے وقت میں وہ لوگ ہمیشہ دلاسا دیتے ہیں اور میری مدد کرتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں اپنی نااہلی کا احساس کرکے بڑی شرم آتی ہے خصوصاً جب میں اس پر غور کرتا ہوں کہ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے میری بیوی کا سلوک کس قدر قابل تعریف رہا اپنی خودداری اور تندوحسی کے باوجود اس نے نہ صرف میرے لاابالی پن کو برداشت کیا بلکہ تنت کے وقت میری دلدہی اور غمگساری کی۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہماری معاشرت میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی تھی اب ہم بہت سادہ زندگی گذارنے لگے تھے اور ملازموں کی تعداد بھی بہت کم کردی تھی۔ پھر بھی معمولی آرام و آسائش کی کمی نہ تھی۔ کچھ تو فضولیات کو ترک کرنے کے خیال سے اور کچھ روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے ہم نے بہت سی چیزیں فروخت کردیں مثلاً گھوڑے گاڑیاں یا گھر کا وہ سامان جو ہماری موجودہ طرز زندگی سے میل نہ کھاتا تھا۔ کچھ فرنیچر پولیس اٹھالے گئی اور اس نے بیچ ڈالا۔ غرض فرنیچر اور نوکروں کی کمی کی وجہ سے ہمارے گھر میں وہ آرائش اور صفائی باقی نہیں رہی تھی اور مالیوں کے نہ ہونے سے سارا باغ اجڑ گیا تھا۔ تقریباً ۱۳ سال تک گھر یا باغ کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں کی۔ خرچ کے معاملے میں والد کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا اس لئے وہ زیادہ جزرسی کو ناپسند کرتے تھے چنانچہ انھوں نے خالی وقت میں مقدمات میں مشورہ دینے کا کام شروع کردیا تاکہ تھوڑی بہت آمدنی ہوجایا کرے۔ اس کام کے لئے انھیں بہت کم وقت ملتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے اچھا خاصا روپیہ کما لیا۔

یہ خیال میرے لئے سوہان روح تھا کہ میرا سارا بار والد پر ہے۔ جب سے میں نے وکالت ترک کی تھی میری کوئی آمدنی نہیں رہی تھی۔ البتہ چند حصوں کا منافع ضرور آتا تھا میرا اور میری بیوی کا خرچ کچھ زیادہ نہ تھا بلکہ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ہم کتنا کم خرچ کرتے ہیں سنہ ۱۹۲۱ء میں اس کا انکشاف کر کے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ میرا خیال تھا کہ کھادی کے کپڑوں اور تیسرے درجے کے سفر میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے اس وقت چونکہ میں والد کے ساتھ رہتا تھا اس لئے مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ گھر کے چھوٹے چھوٹے متفرق خرچ ملا کر خاصی بڑی رقم ہو جاتی ہے۔ بہرحال روپے کی کمی میرے لئے کبھی پریشانی کا باعث نہیں ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو میں کافی روپیہ پیدا کر سکتا ہوں اور ہمارا گذارا بہت تھوڑے میں ہو سکتا ہے۔

ہماری وجہ سے والد پر کچھ ایسا بوجھ نہیں پڑتا تھا اور اگر اس قسم کا ذرا سا اشارہ بھی کیا جاتا تو انہیں سخت تکلیف ہوتی پھر بھی مجھے والد کا دست نگر ہونا اچھا نہ لگتا تھا چنانچہ میں تین سال تک برابر اس مسئلے پر غور کرتا رہا لیکن کوئی صورت نہ نکلی۔ آمدنی کا ذریعہ نکال لینا کچھ مشکل نہ تھا لیکن اس کے معنی یہ ہوتے کہ مجھے قومی کام ترک کرنا پڑتا یا کم از کم اس میں بہت کمی ہو جاتی۔ اب تک تو میں سارا وقت کانگرس اور میونسپلٹی کے کام میں صرف کرتا تھا محض روپیہ پیدا کرنے کے لئے ان کاموں کو ترک کرنا مجھے کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ اس وجہ سے میں نے بڑے بڑے صنعتی اداروں کی ان پیشکشوں کو منظور نہیں کیا جو مالی حیثیت سے نہایت پر منفعت تھیں۔ وہ مجھے اتنی بڑی رقم کچھ میری اہلیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ غالباً اس وجہ سے دینے کو تیار تھے کہ میرے نام سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور میں اس طرح کسی بڑی صنعت سے متعلق نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وکالت دوبارہ شروع کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا مجھے اس سے سخت نفرت تھی۔ اور یہ نفرت روز بروز بڑھتی گئی۔

۱۹۲۴ء کی کانگرس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ جنرل سکریٹریوں کو تنخواہ دینا چاہیئے اس وقت ایک سکریٹری میں بھی تھا میں نے اس تجویز کو پسند کیا کیونکہ میرے نزدیک یہ طریقہ بالکل غلط تھا کہ کسی شخص کو اس کے گذارے کے لائق بھی تنخواہ نہ دی جائے اور پھر اس سے یہ توقع کی جائے کہ وہ رات دن کام میں لگا رہے۔ ایسی صورت میں ہمیں خواہ مخواہ وہ لوگ تلاش کرنے پڑیں گے جو گھر کے کھاتے پیتے ہوں لیکن اس قسم کے رئیس لوگ عموماً سیاسی خدمات کے لئے موزوں نہیں ہوتے اور نہ ان سے ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی توقع کی جاسکتی۔ کانگرس کو کچھ زیادہ خرچ نہ کرنا پڑتا کیونکہ ہم لوگ بہت کم گذارہ لیتے لیکن ہندوستان میں لوگوں کے ذہن میں یہ عجیب و غریب اور مہمل خیال جم گیا ہے کہ قومی سرمائے میں سے تنخواہ نہیں لینی چاہیئے، حالانکہ سرکاری خزانے سے لوگ بخوشی تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ بہرحال والد نے اس سے سخت اختلاف کیا کہ میں کوئی تنخواہ قبول کروں۔ میرے شریک کار دوسرے سکریٹری کو بھی روپے کی سخت ضرورت تھی، لیکن انھوں نے بھی کانگرس سے تنخواہ لینا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شرم نہیں آتی تھی اور میں تنخواہ لینے کے لئے بالکل تیار تھا، لیکن ان حالات میں مجھے بھی تنخواہ سے دست بردار ہونا پڑا۔

صرف ایک مرتبہ میں نے والد سے اس مسئلے پر گفتگو کی۔ اور ان سے عرض کیا کہ مجھے اپنا سارا بوجھ آپ پر ڈالنا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا میں نے حتی الامکان انتہائی لجاجت سے اور بڑے ایر پھیر سے یہ بات ان سے کہی تھی تاکہ انھیں کسی طرح تکلیف نہ ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ سخت حماقت ہوگی۔ اگر تم قومی کام کرنے کے بجائے روپیہ کمانے میں اپنا تمام یا اکثر وقت صرف کرو۔ میں تو آسانی سے چند روز میں اتنا کما سکتا ہوں کہ تمہاری اور تمہاری بیوی کی سال بھر کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ دلیل نہایت معقول تھی لیکن میرا ضمیر کسی طرح مطمئن نہ ہوا۔

بہرحال میں ان کی مرضی پر چلتا رہا۔

یہ خانگی معاملات اور مالی مشکلات ۱۹۲۳ء کے آغاز سے ۱۹۲۵ء کے آخر تک جاری رہیں۔ اس اثنا میں سیاسی حالات میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ مجھے میری مرضی کے خلاف آل انڈیا کانگریس کے بہت سے عہدے سپرد کر دیئے گئے اور مختلف ذمہ داریوں میں زبردستی کھینچ لیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کی سیاست بھی نہایت ہی عجیب تھی۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس گیا کانگریس کے گذشتہ اجلاس کے صدر ہوئے تھے۔ اس لیئے وہ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی صدر تھے لیکن کمیٹی کی اکثریت ان کے اور ان کی سوراجی پالیسی کے خلاف تھی۔ اکثریت اور اقلیت میں بہت تھوڑا سا فرق تھا اور دونوں جماعتیں قریب قریب برابر تھیں ۱۹۲۳ء کی شروع گرمیوں میں جب بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو یہ کش مکش حد سے گذر گئی اور مسٹر داس نے استعفا دیدیا۔ اس کے بعد دونوں کے بین بین ایک چھوٹی سی وسطی جماعت پیدا ہوئی اور اس نے نئی ورکنگ کمیٹی ترتیب دی۔ اس جماعت کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں کوئی تائید حاصل نہیں تھی اور وہ سابقہ دو جماعتوں میں سے کسی ایک کی حمایت سے قائم رہ سکتی تھی۔ ان میں سے کسی سے بھی مل کر وہ دوسری جماعت کو شکست دے سکتی تھی۔ ڈاکٹر انصاری اس کے صدر تھے اور میں دو اور حضرات کے علاوہ سکرٹری تھا۔

بہت جلد ہمیں دونوں طرف سے مشکلات کا سامنا ہوا۔ گجرات تبدیلی کے مخالفوں کا مرکز تھا۔ چنانچہ اس صوبے نے صدر دفتر کے احکام کی تعمیل کرنے سے انکار کردیا۔ اسی سال گرمیوں کے اختتام پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک دوسرا جلسہ ناگپور میں ہوا۔ جہاں اس وقت قومی جھنڈے کے معاملے میں ستیاگرہ ہو رہی تھی۔ ہماری ورکنگ کمیٹی جو بدنصیب وسطی جماعت پر مشتمل تھی مختصر اور بے کارسی زندگی کے بعد یہاں ختم ہوگئی۔ اسے دراصل اس لیئے ہٹنا پڑا کہ یہ کسی گروہ کی

نمائندگی نہیں کرتی تھی اور پھر ان لوگوں پر جن کے ہاتھ میں کانگریس کی باگ تھی رعب جمانا چاہتی تھی۔ اس کمیٹی نے گجرات کی حکم عدولی پر مذمت کی قرارداد پیش کی اور چونکہ اس میں ناکامی ہوئی اس لئے اسے استعفیٰ دینا پڑا۔ مجھے یاد ہے کہ استعفیٰ دینے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بوجھ سر سے اتر گیا۔ پارٹی بازی کا یہ مختصر سا تجربہ بھی مجھے بہت گراں گذرا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ بڑے بڑے کانگریسی بھی کس طرح سے سازشیں کر سکتے ہیں۔

اس جلسے میں مسٹر سی۔ آر۔ داس نے مجھ پر یہ فقرہ کسا تھا کہ تم تو بالکل ٹھنڈی مٹی ہو۔ غالباً اس وقت ان کا خیال صحیح تھا کیونکہ یہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ مقابلہ کن لوگوں سے ہے۔ اپنے بہت سے احباب اور رفقائے کار کے مقابلے میں واقعی میں ٹھنڈی مٹی ہوں لیکن عام طور پر مجھے ہمیشہ یہی خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں جذبات یا غصہ کی لہر میں بہہ نہ جاؤں۔ برسوں سے میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں ٹھنڈی مٹی بن جاؤں لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں مجھے جس حد تک کامیابی ہوئی ہے وہ محض سطحی ہے۔

(۱۶)

ریاست نابھا کا پُر مذاق واقعہ

سوراج پارٹی والوں اور ان کے مخالفوں میں کش مکش جاری تھی اور سوراجی زور پکڑ رہے تھے ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں دہلی میں کانگریس کا ایک خاص اجلاس ہوا اس میں سوراجیوں کو ایک اور فتح حاصل ہوئی۔ اس اجلاس کے بعد ہی مجھے ایک عجیب اور غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔

پنجاب میں سکھوں، خصوصاً ان کی اکالی جماعت اور حکومت کے درمیان لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ ان کے اصلاح پسند طبقے نے یہ طے کرلیا تھا کہ بداطوار مہنتوں کو نکال کر اپنے گوردواروں کو ان کے وجود سے پاک کرنا چاہیے اور تمام گوردواروں اور ان کے اوقاف پر قبضہ کرلینا چاہیے۔ حکومت نے اس معاملے میں مداخلت کی اور اس سے اور اکالیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ یہ تحریک کسی حد تک اس بیداری کی وجہ سے شروع ہوئی جو ترک موالات نے پیدا کردی تھی اور اکالی پر امن ستیا گرہ ہی کے اصولوں کی پیروی بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے ان میں سے خاص واقعہ گورو کے باغ کی مشہور جنگ کا ہے جس میں بیسیوں سکھوں کو (ان میں بہت سے سابق فوجی بھی تھے) پولیس نے نہایت بے دردی سے پیٹا لیکن انھوں نے نہ تو پولیس پر ہاتھ اٹھایا اور نہ اپنے مقصد سے منہ موڑا۔ سارے ہندوستان کو ان کی جرأت و استقلال پر حیرت ہوگئی۔ حکومت نے گوردوارہ کمیٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا اور یہ جنگ کئی برس تک جاری رہی آخر کار سکھوں

کو فتح ہوئی۔ کانگریس کو قدرتی طور پر سکھوں سے ہمدردی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک اس نے بطور اظہار دوستی اپنی طرف سے ایک ذمہ دار شخص کو امرتسر میں متعین کر دیا تھا تاکہ وہ اکالی تحریک کی تمام سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر رہے۔

جس واقعہ کا میں ذکر کروں گا اسے سکھوں کی عام تحریک سے کچھ زیادہ تعلق نہیں تھا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ سکھوں کی یہی ہل چل تھی پنجاب کی دو سکھ ریاستوں یعنی پٹیالہ اور نابھ کے رئیسوں میں آپس میں سخت عداوت تھی آخر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند نے مہاراجہ نابھا کو گدی سے اتار دیا۔ اس معزولی سے تمام سکھوں میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی۔ اور انھوں نے ریاست میں بھی اور ریاست سے باہر بھی اس کے خلاف سخت عملی احتجاج کیا۔ اسی احتجاج کے دوران میں ریاست کے نئے منتظم نے جیتو میں ایک مذہبی تقریب کو روک دیا۔ اس حکم کے خلاف احتجاج کرنے اور اس ممنوعہ تقریب کو منانے کے لئے سکھوں نے جیتو میں جتھے بھیجنا شروع کئے۔ پولیس ان جتھوں کو روک کر خوب مارتی۔ پھر گرفتار کر کے دور کہیں جنگل میں لے جا کر چھوڑ دیتی۔ میں وقتاً فوقتاً اخباروں میں اس مار دھاڑ کا حال پڑھا کرتا تھا۔ کانگریس کے خاص اجلاس کے بعد دہلی میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک اور جتھا عنقریب جانے والا ہے اور مجھے دعوت دی گئی کہ میں وہاں چل کر اپنی آنکھ سے سب کچھ دیکھ لوں۔ میں نے خوشی سے یہ دعوت قبول کر لی اور سوچا کہ جیتو دہلی کے قریب ہی تو ہے۔ صرف ایک دن کا معاملہ ہے کیوں نہ چلا چلوں میرے دو کانگریسی رفیق۔ اے۔ ٹی۔ گڈوانی اور مدراس کے مسٹر کے سنتانم بھی میرے ہمراہ ہو لئے۔ جتھا بہت دور سے پیدل چل کر آ رہا تھا۔ انتظام یہ کیا گیا کہ ہم لوگ قریب کے اسٹیشن پر اتر جائیں۔ پھر سڑک سے ٹھیک اس وقت جیتو پہنچ جائیں جب جتھا وہاں پہنچنے والا ہو۔ غرض ہم ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ گئے اور جتھے

سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے بیل گاڑی پر روانہ ہوئے۔ جیتو پہنچنے پر پولیس نے جتھے کو روکا اور فوراً ہم پر ایک حکمنامے کی تعمیل کی جس پر نابھے کے انگریز منتظم کے دستخط تھے۔ اس کی رو سے ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ نابھے کی حدود میں ہرگز داخل نہ ہو یا اگر ہو چکے ہو تو فوراً واپس چلے جاؤ۔ اسی قسم کے حکمنامے سنتانم اور گڈوانی کو بھی دئے گئے لیکن ان پر ان کے نام درج نہیں تھے کیونکہ نابھے کے افسر شاید ان سے واقف نہ تھے۔ میرے ہمراہیوں نے اور میں نے پولیس افسر کو یہ جواب دیا کہ ہم جتھے میں شامل نہیں بلکہ محض تماشائی کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ ہمارا یہ ارادہ نہیں کہ ریاست کے قوانین کی خلاف ورزی کریں۔ اس کے علاوہ چونکہ ہم نابھے کے حدود میں داخل ہو چکے ہیں اس لئے داخل نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہا واپس جانا تو ہم یکایک ہوا میں تو غائب ہونے سے رہے۔ جیتو سے اگلی گاڑی کئی گھنٹے بعد جاتی ہے اس لئے گاڑی چھوٹنے تک یہیں ٹھہریں گے چنانچہ ہم فوراً گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیئے گئے۔ ہمارے وہاں سے چلے جانے کے بعد جتھے کے ساتھ وہی برتاؤ کیا گیا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔

سارے دن پولیس نے ہمیں حوالات میں رکھا اور شام کو پیدل اسٹیشن لے چلی۔ سنتانم اور میں ایک ہتھکڑی میں بندھے تھے ان کی بائیں کلائی میں کڑا پڑا تھا اور میری سیدھی میں۔ اور ہتھکڑی کی زنجیر پولیس کا ایک سپاہی پکڑے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا۔ گڈوانی کے بھی ہتھکڑی پڑی تھی اور پیچھے پیچھے تشریف لا رہے تھے۔ غرض ہم اس طرح جیتو کی سڑکوں پر گذر رہے تھے جیسے کوئی شخص کتوں کے گلے میں زنجیر ڈالے انھیں گھسیٹتا لئے جا رہا ہو۔ شروع شروع میں ہمیں کسی قدر غصہ آیا مگر پھر واقعے کے مضحک پہلو کا احساس ہوا اور ہم نے اس کا پورا لطف اٹھایا لیکن رات بڑی بے لطفی سے کٹی۔ ریل کے تیسرے درجہ کے ڈبے کھچا کھچ بھرے تھے

اور گاڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور شاید آدھی رات کو کہیں گاڑی بدلنا بھی پڑی، غرض کچھ رات تو اس طرح گذری اور کچھ نابھے کی حوالات میں۔ ساری رات بلکہ دوسرے دن دوپہر تک (جب تک ہم نابھہ جیل میں داخل نہ ہو گئے) ان مشترک ہتھکڑیوں اور زنجیروں نے ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔

ہم میں سے ہر شخص ایک دوسرے کی مدد کے بغیر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ساری رات اور آدھے دن دوسرے شخص کے ساتھ ہتھکڑی میں بندھا رہنا ایسا تلخ تجربہ ہے کہ دوبارہ اس کا مزہ چکھنے کی ہوس نہیں۔

نابھا جیل میں ہم تینوں ایک نہایت ہی مکروہ اور گندی کوٹھری میں بند کر دیئے گئے۔ یہ بہت چھوٹی اور مرطوب جگہ تھی اور چھت اتنی نیچی تھی کہ ہم ہاتھ سے چھو سکتے تھے رات کو ہم زمین ہی پر پڑ رہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی چوہا یا چوہیا میرے چہرے پر سے گزری اور میں سوتے سوتے یکایک خوف سے اچھل پڑا۔

دو تین دن بعد ہم عدالت میں پیش کئے گئے اور وہاں ایک مدت تک کچھ عجیب غریب مضحکہ خیز سی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ مجسٹریٹ اور جج صاحب بالکل بے پڑھے معلوم ہوتے تھے۔ انگریزی تو وہ سرے سے جانتے ہی نہ تھے اور میرے خیال میں عدالتی زبان یعنی اردو لکھنے سے بھی معذور تھے۔ ہم ہفتوں ان کے سامنے پیش ہوتے لیکن مقدمے کی سماعت کے دوران میں کبھی انہوں نے ایک حرف بھی نہ لکھا۔ جب کچھ لکھنا ہوتا تو وہ پیشکار سے لکھوا لیتے تھے۔ اس دوران میں ہم نے بہت سی معمولی درخواستیں بھی دیں لیکن انھوں نے اس وقت ان پر کوئی حکم نہیں لکھا۔ وہ ہمیشہ انھیں رکھ لیتے۔ پھر دوسرے دن کسی اور سے حکم لکھوا کر لے آتے۔ ہم نے اپنے مقدمے کی باضابطہ پیروی نہیں کی۔ ترک موالات کے زمانے سے ہم مقدموں کی پیروی نہ کرنے کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ جب یہ جائز بھی

رکھا جاتا تب بھی ہم اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ بہرحال میں نے عدالت میں ایک طویل بیان پیش کیا جس میں تمام واقعات پر روشنی ڈالی اور ریاست نابھا میں برطانیہ کے دورانتظام میں جو اندھیر مچا ہوا تھا اس پر کھلم کھلا تنقید کی۔

ہمارا مقدمہ اگرچہ ایک معمولی سا مقدمہ تھا لیکن ایک مدت تک چلتا رہا۔ یکایک اس نے ایک پلٹا لیا اور ایک نئی صورت رونما ہوئی۔ ایک دن عدالت کے برخاست ہونے کے بعد ہم ایک دوسری عمارت میں روک لیے گئے پھر شام کے کوئی سات بجے ہمیں ایک کمرے میں لے گئے جہاں ایک شخص میز کرسی لگائے بیٹھا تھا اور چند اور شخص بھی جمع تھے۔ ہمارے پرانے دوست وہ پولیس افسر صاحب بھی جنھوں نے ہمیں جیتو میں گرفتار کیا تھا وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر ایک بیان دینا شروع کیا ہم نے دریافت کیا کہ آخر معاملہ کیا ہے اور یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے۔ اس پر ہمیں بتایا گیا کہ یہ عدالت کا اجلاس ہے اور سازش کے جرم میں تم پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ یہ اس مقدمے سے بالکل جداگانہ کارروائی تھی جو اب تک ہم پر چل رہا تھا اور جس میں ہم ریاست نابھا میں داخل نہ ہونے کے حکم کی خلاف ورزی میں ماخوذ تھے۔ شاید یہ خیال کیا گیا کہ اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا صرف ۶ ماہ ہے اور یہ ہمارے لیے کافی نہیں ہے اس لیے کوئی زبردست الزام لگانا ضروری ہے۔ سازش کے لیے ۳ کی تعداد کافی نہ تھی اس لیے ایک چوتھا شخص جسے ہم سے قطعی کوئی واسطہ نہ تھا گرفتار کیا گیا اور ہمارے ساتھ مقدمے میں نتھی کر دیا گیا ہم اس بدقسمت سکھ کو جانتے بھی نہ تھے۔ ہاں جب ہم جیتو آرہے تھے تو اسے کھیتوں میں دیکھا ضرور تھا۔

ایک وکیل کی حیثیت سے میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ کس قدر آسانی سے بے تکلف سازش کا ایک مقدمہ کھڑا کر دیا گیا۔ الزام از سرتا پا جھوٹا تھا لیکن دکھاوے ہی کے لیے سہی کچھ نہ کچھ ضابطہ کی پابندی تو ضروری تھی۔ ہم نے جج صاحب سے

کہا کہ ہمیں اس مقدمے کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی اور نہ اس کا موقع دیا گیا کہ ہم اپنی پیروی کا کوئی انتظام کر سکیں لیکن اس معقول اعتراض سے انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ نابھے کا یہی طریقہ ہے اگر تم کوئی وکیل کرنا چاہتے ہو تو ہمیں سے کسی کو مقرر کر لو۔ جب میں نے کہا کہ شاید میں باہر سے کوئی وکیل بلانا مناسب سمجھوں، تو جواب ملا کہ نابھے کے قانون کی رو سے اس کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بعد ریاست کے عجیب عجیب قواعد و ضوابط کا ہمیں پتہ چلا اور ہم نے پریشان ہو کر جج سے یہ کہہ دیا کہ جو آپ کے جی میں آئے کیجئے، ہم اس مقدمے کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیں گے لیکن میں اس فیصلے پر برابر قایم نہ رہ سکا۔ ہمارے متعلق جو بے سر و پا جھوٹ تراشا جا رہا تھا اسے سننا اور چپ رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی ہم گواہوں کے متعلق مختصر مگر معقول رائے زنی کر دیتے تھے ہم نے عدالت میں ایک بیان تحریری بھی داخل کیا جس میں تمام واقعات درج کر دیئے۔ یہ دوسرے جج جو مقدمہ سازش کی سماعت کر رہے تھے پہلے جج سے زیادہ ذہین اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔

عرصے تک ., یہ دونوں مقدمے چلا کئے۔ ہم ان دونوں عدالتوں کی پیشی کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے کیونکہ اس طرح تھوڑی دیر کے لئے جیل کی گندی کوٹھری سے نجات مل جاتی تھی۔ اسی دوران میں منتظم ریاست کی جانب سے سپرنٹنڈنٹ جیل میرے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ معافی مانگ لیں اور اقرار کریں کہ فوراً نابھے سے چلے جائیں گے تو مقدمہ بالکل ختم کر دیا جائے گا میں نے جواب دیا کہ ہم کس بات کی معافی مانگیں معافی تو ریاست کو مانگنا چاہیئے کہ اس نے ہمارے ساتھ بدسلوکیاں کیں۔ اس کے علاوہ ہم کوئی اقرار کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

ہماری گرفتاری کے کوئی پندرہ دن بعد دونوں مقدمے ختم ہو گئے۔ یہ تمام وقت ثبوت فراہم کرنے میں صرف ہوا تھا اور ہم نے کوئی صفائی پیش نہیں کی تھی

اس میں زیادہ عرصہ وقفوں میں گزرا کیونکہ جہاں کوئی دقت پیش آتی فوراً مقدمہ ملتوی کردیا جاتا اور پس پردہ غالباً انگریز منتظم سے مشورے کئے جاتے۔ آخری روز جب ثبوت ختم ہوگیا تو ہم نے اپنے بیان تحریری داخل کردیے۔ پہلی عدالت برخاست ہوئی اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ تھوڑی ہی دیر میں جج صاحب اردو میں لکھا ہوا ایک طول طویل فیصلہ لئے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبا چوڑا فیصلہ اس قلیل وقفہ میں نہیں لکھا جاسکتا تھا اور یہ ہمارے بیان داخل کرنے سے پہلے ہی تیار کرلیا گیا تھا فیصلہ ہمیں پڑھ کر سنایا بھی نہیں گیا۔ صرف اتنا بتا دیا گیا کہ ریاست نابھے سے نکل جانے کے حکم کی خلاف ورزی میں تمہیں چھ مہینے کی سزا دی جاتی ہے۔

اسی دن سازش کے مقدمے میں بھی مجھے ڈیڑھ یا دو برس کی سزا ہوئی۔ صحیح مدت مجھے یاد نہیں ہے۔ یہ سزا پہلی ۶ مہینے کی سزا کے علاوہ تھی۔ گویا مجموعی طور پر ہمیں دو یا ڈھائی برس جیل میں گذارنے تھے۔

مقدمے کے دوران میں شروع سے آخر تک بہت سے دلچسپ واقعات ہوئے جن سے ہم پر ہندوستانی ریاستوں کے طرز حکومت کی، یا یوں کہیئے کہ ریاستوں کی برطانوی حکومت کی حقیقت آشکارا ہوگئی۔ ساری کارروائی محض ایک ڈھونگ تھا شاید اسی وجہ سے اخباروں کے نامہ نگاروں یا باہر والوں کو عدالت میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ پولیس من مانی کارروائی کرتی تھی۔ اکثر جج یا مجسٹریٹ کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو کھلم کھلا ان کی حکم عدولی کرتی تھی۔ بیچارہ مجسٹریٹ چپ چاپ اسے گوارا کرتا تھا لیکن ہم ایسا کیوں کرتے اس لئے اکثر موقعوں پر میں کھڑا ہوجاتا اور اس پر زور دیتا کہ پولیس کو اپنا طرز عمل درست کرنا چاہیئے اور مجسٹریٹ کا حکم ماننا چاہیئے۔ بعض اوقات پولیس نہایت بیہودہ طریقے سے ہاتھوں میں سے کاغذات چھین لیتی اور چونکہ عدالت کا نہ کوئی رعب تھا نہ وہ اس کی

اہل تھی کہ کوئی حکم دے یا اپنے اجلاس میں امن و سکون قائم رکھ سکے اس لئے اس کا بہت کچھ کام نہیں انجام دینا پڑتا تھا۔ بے چارہ مجسٹریٹ بڑی مشکل میں تھا ایک طرف وہ پولیس سے خائف تھا۔ دوسری طرف ہم سے بھی کچھ سہما ہوا تھا کیونکہ ہماری گرفتاری پر ملک کے تمام اخباروں نے شور مچا رکھا تھا جب ہمارے ساتھ جو سیاسیات میں ذرا نمایاں حیثیت رکھتے تھے یہ کیفیت تھی تو بے چارے غیر معروف لوگوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا ہوگا؟

میرے والد ہندوستانی ریاستوں سے واقف تھے اس لئے نابھے میں میری غیر متوقع گرفتاری سے وہ سخت پریشان ہو گئے انھیں بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے آگے انھیں کوئی خبر ہی نہ ملتی تھی۔ پریشانی میں انھوں نے وائسرائے کو تار بھی دیا کہ میری خیریت سے مطلع کیا جائے۔ شروع میں تو مجھ سے ملنے کے لئے ان کے نابھے آنے میں بھی روڑے اٹکائے گئے۔ آخر کار انھیں جیل خانے میں مجھ سے ملاقات کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ میری کیا مدد کر سکتے تھے کیونکہ میں مقدمے کی پیروی ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ الہ آباد واپس تشریف لے جائیں اور پریشان نہ ہوں وہ واپس تو چلے گئے لیکن ہمارے ایک ہم عصر نوجوان وکیل کپل دیو مالویہ کو نابھے میں چھوڑ گئے تاکہ وہ مقدمے کی نگرانی کرتے رہیں۔ یقین ہے کہ نابھے کی عدالتوں کے اس مختصر سے تجربے سے کپل دیو کی قانون اور ضابطے کی معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہوگا۔ پولیس نے کھلی عدالت میں ان کے ہاتھ سے بھی زبردستی چند کاغذات چھیننے کی کوشش کی تھی۔

ہندوستان کی اکثر ریاستیں اپنی پستی اور قدیم جاگیرداری طریقے کی وجہ سے بدنام ہیں۔ عموماً وہاں استبدادی حکومت ہے جس میں وہ شخصی قابلیت اور مروت

بھی نہیں ہے جو ایسی حکمرانوں میں کبھی کبھی ہوا کرتی ہے اکثر وہاں عجیب عجیب واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کا ہمیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ پھر کبھی ان کی یہ نا اہلی بعض وقت غنیمت ہوتی ہے اور بدنصیب رعایا کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں عملہ کمزور ہوتا ہے جس کی وجہ سے ظلم اور ناانصافی بھی کامیابی کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ اس سے ظلم کی شدت میں کمی نہیں ہوتی مگر اس کا دائرہ عمل محدود ہو جاتا ہے۔ مگر جب کوئی ریاست براہ راست برطانوی حکومت کی نگرانی میں آجاتی ہے تو یہ توازن بگڑ جاتا ہے اور عجیب غریب صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جاگیرداری نظام بدستور قائم رہتا ہے۔ استبدادیت اسی طرح باقی رہتی ہے۔ پرانے قانون قاعدے ویسے ہی جاری رہتے ہیں اور انفرادی اور اجتماعی آزادی اور ہر طرح کے اظہار رائے پر وہی پابندیاں عاید رہتی ہیں لیکن ایک تبدیلی ایسی ہو جاتی ہے جس سے تمام پس منظر بدل جاتا ہے یعنی عملہ زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور اس میں کسی حد تک اہلیت پیدا ہو جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان استبدادی بندشوں میں زیادہ سختی آجاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد برطانوی حکومت چند قدیم رسم و رواج اور قاعدے ضرور بدل دیتی ہے کیونکہ اچھی طرح حکمرانی کرنے میں اور تجارتی حیثیت سے حادثاً ہونے میں یہ حارج ہوتے ہیں۔ لیکن شروع شروع میں رعایا پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے وہ ان سے پورا فائدہ اٹھاتی ہے اور اب غریب رعایا کو نہ صرف جاگیرداری نظام اور استبدادیت کے اصول گوارا کرنے پڑتے ہیں بلکہ ایک مضبوط عملے کے ذریعے سے ان پر سختی سے عمل بھی ہونے لگتا ہے۔

میں نے نابھے میں ایک حد تک ان باتوں کا مشاہدہ کیا۔ ریاست ایک انگریز منتظم کی نگرانی میں تھی جو انڈین سول سروس کا رکن تھا۔ اسے مطلق العنان حکمراں کے پورے اختیارات حاصل تھے اور وہ صرف حکومت ہند کے ماتحت تھا۔ پھر بھی جب کبھی ہمیں معمولی سے معمولی حقوق دینے سے پہلو تہی کرنی ہوتی۔ فوراً ریاست کے

قانون قاعدوں کا حوالہ دیا جاتا۔ ہمیں قدیم جاگیرداری نظام اور جدید قسم کی استبدادی طرز حکومت دونوں کے ایک معجون مرکب سے واسطہ پڑا تھا۔ یعنی اس میں دونوں کی خرابیاں موجود تھیں اور دونوں کی خوبیاں مفقود تھیں۔

بہر حال ہمارا مقدمہ ختم ہو گیا اور ہمیں سزا ہو گئی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ فیصلے میں کیا لکھا تھا لیکن محض طویل سزا کی وجہ سے ہم پر اس کا رعب تھا۔ ہم نے فیصلوں کی نقل مانگی تو حکم ہوا کہ باضابطہ درخواست دو۔

اسی دن شام کے وقت جیل میں سپرنٹنڈنٹ نے ہمیں طلب کیا۔ اور ضابطہ فوجداری کے ماتحت منتظم کا ایک حکم دکھایا جس کی رو سے ہماری سزا ملتوی کر دی گئی۔ اس التوا کے ساتھ کوئی شرط نہ تھی جس کے معنی یہ تھے کہ ہم قانونی طور پر بالکل آزاد تھے اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ نے ایک دوسرا حکم پیش کیا جسے وہ عاملانہ حکم کہتے تھے۔ یہ بھی انھیں منتظم صاحب نے جاری کیا تھا۔ اس کی رو سے ہمیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہم فوراً نابھے سے نکل جائیں اور پھر کبھی بلا اجازت ریاست کے حدود میں داخل نہ ہوں۔ میں نے ان دونوں حکموں کی نقل مانگی لیکن سپرنٹنڈنٹ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہمیں ریلوے اسٹیشن پر لے جا کر رہا کر دیا گیا۔ ہم نابھے میں کسی سے واقف نہ تھے اس کے علاوہ ساری رات شہر کے پھاٹک بھی بند رکھے گئے۔ پھر ہمارے لئے باہر جانے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک ٹرین تھوڑی دیر میں انبالے جانے والی ہے چنانچہ ہم اسی میں بیٹھ گئے۔ انبالے سے میں دہلی آیا اور دہلی سے پھر الہ آباد پہنچا۔

الہ آباد پہنچ کر میں نے منتظم کو خط لکھا اور ان سے دونوں فیصلوں اور دونوں احکام کی نقلیں بھیجنے کی درخواست کی تاکہ مجھے یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں کیا لکھا تھا۔ انھوں نے نقلیں دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے پھر انھیں لکھا کہ

شاید میں اپیل دائر کروں لیکن وہ برابر انکار کرتے رہے۔ متواتر کوششوں کے باوجود مجھے آج تک ان فیصلوں کی زیارت نصیب نہیں ہوئی جن کی رو سے مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو دو ڈھائی سال کی سزا دی گئی تھی۔ ممکن ہے یہ سزا کے احکام آج بھی موجود ہوں اور جب برطانوی حکومت یا نابھے کے حکمراں چاہیں ان کو نافذ کر دیں۔

ہماری سزائیں اس طرح ملتوی کر کے ہم تینوں تو رہا کر دیئے گئے لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ اس گڑھی ہوئی سازش کے چوتھے رکن کا کیا حشر ہوا یعنی اس بیچارے سکھ کا جو ہمارے ساتھ دوسرے مقدمے میں خواہ مخواہ نتھی کر دیا گیا تھا۔ غالباً وہ رہا نہیں ہوا۔ اس کے نہ کوئی قوت و اقتدار والے دوست تھے نہ پبلک کو اس سے کوئی ہمدردی تھی کہ اسے کوئی امداد پہنچتی۔ غرض اور بہت سے لوگوں کی طرح اس پر بھی ریاست کے قید خانے میں گمنامی کا پردہ پڑ گیا لیکن ہم نے اسے فراموش نہیں کیا۔ جو کچھ ہمارے امکان میں تھا وہ ہم نے کیا مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ گوردوارہ کمیٹی نے اس کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ "کوماگاٹا مارو" کے ستم زدوں میں سے تھا اور بہت طویل عرصہ کے بعد حال ہی میں جیل سے باہر آیا تھا۔ پولیس کو ایسے آدمیوں کا باہر رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ چنانچہ اس نے ہمارے ساتھ اسے بھی پھانس لیا۔

گڈوانی سنتانم اور میں تینوں نابھے جیل کی کوٹھری سے ایک بلا اپنے ساتھ لائے یعنی میعادی بخار کے جراثیم۔ چنانچہ ہم تینوں میعادی بخار میں مبتلا ہو گئے مجھ پر بخار کا خاصا سخت حملہ تھا اور کچھ عرصے کے لئے خطرناک بھی ہو گیا تھا۔ لیکن ان دونوں کے مقابلے میں پھر بھی ہلکا تھا۔ میں تین چار ہفتے میں لوٹ پوٹ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن وہ دونوں تو ایک مدت تک سخت بیمار رہے۔

نابھے کے اس حادثے کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ اس کے کوئی چھ مہینے بعد گڈوانی کانگریس کے نمائندے بنا کر امرتسر بھیجے گئے تاکہ سکھ گوردوارہ کمیٹی کے حالات سے باخبر رہیں۔ کمیٹی نے جیتو کو پانچ سو آدمیوں کا ایک خاص جتھا روانہ کیا اور گڈوانی محض نگراں کی حیثیت سے نابھے کے حدود تک ان کے ساتھ گئے۔ ریاست میں داخل ہونے کا ان کا ارادہ نہ تھا۔ نابھے پہنچتے ہی جتھے پر گولیاں برسائی گئیں اور غالباً بہت سے شخص ہلاک اور زخمی ہوئے۔ گڈوانی زخمیوں کی مدد کو بڑھے لیکن ریاست کے حدود میں قدم رکھتے ہی پولیس ان پر جھپٹ پڑی۔ اور انھیں اٹھا کر لے گئی۔ عدالت میں ان کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ لیکن قریب قریب سال بھر تک وہ جیل خانے میں رکھے گئے۔ پھر جب ان کی صحت بالکل جواب دینے لگی تو رہا کر دئے گئے۔

میرے نزدیک گڈوانی کی گرفتاری اور قید کے معاملے میں عاملانہ اختیارات کا نہایت ہی بے جا استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے منتظم کو (جو اب بھی وہی انگریز آئی سی۔ ایس تھا) خط لکھا اور اس سے دریافت کیا کہ گڈوانی کے ساتھ آخر یہ بدسلوکی کیوں کی گئی۔ انھوں نے جواب دیا کہ گڈوانی کو اس لئے قید کیا گیا ہے کہ انھوں نے ہمارے پچھلے حکم کی خلاف ورزی کی اور بلا اجازت لئے ہوئے نابھے کے حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں نے لکھا کہ آپ کا یہ طرز عمل قانونی حیثیت سے قطعی غلط ہے اس کے علاوہ جو شخص زخمیوں کو امداد پہنچانے کے لئے آگے بڑھا ہو اس کا گرفتار کر لینا کہاں تک مناسب ہے۔ میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ اپنے حکم کی نقل یا تو مجھے ارسال فرمائیے یا اخباروں میں شائع کرا دیجئے۔ لیکن انھوں نے ان دونوں باتوں سے انکار کر دیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں خود نابھے جاؤں اور منتظم صاحب کو موقع دوں کہ انھوں نے گڈوانی سے جو سلوک کیا تھا وہی میرے ساتھ بھی کریں لیکن

میرے بہت سے احباب نے اس کی مخالفت کی اور مجھے وہاں جانے سے باز رکھا۔ سچ پوچھئے تو میں نے ان دوستوں کی نصیحت کی آڑ لی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کا ایک بہانہ نکال لیا۔ کیونکہ حقیقت میں اپنی کمزوری اور نابھا جیل میں دوبارہ قدم رکھنے کے خوف ہی کی وجہ سے مجھے وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنے ایک ساتھی کو اس طرح چھوڑ دینے پر میں ہمیشہ شرمندہ رہوں گا لیکن جیسا کہ ہم سب اکثر کرتے ہیں میں نے بھی شجاعت پر مصلحت کو ترجیح دی۔

(۱۷)

کوکوناڈا، اور مولٰنا محمد علی

دسمبر ۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکوناڈا (دکن) میں ہوا مولٰنا محمد علی صدر تھے حسب عادت انھوں نے ایک بیحد طویل خطبہ صدارت پڑھا لیکن تھا وہ دلچسپ۔ انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور فرقہ وارانہ احساسات کی نشو و نما کا خاکہ کھینچا اور یہ دکھایا کہ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا جو مشہور وفد آغاخان کی سرکردگی میں وائسرائے کے پاس گیا تھا اور جس کے جواب میں حکومت نے جداگانہ انتخاب کی پہلے پہل سرکاری طور پر حمایت کی تھی وہ ایک فرمائشی سوانگ تھا اور حکومت کے اشارے سے ترتیب دیا گیا تھا۔

محمد علی نے میری مرضی کے خلاف مجھے مجبور کیا کہ ان کی صدارت کے دوران میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکرٹری کا عہدہ قبول کرلوں۔ ایسی حالت میں کہ ملک کے آئندہ پروگرام کے متعلق کوئی بات صاف طور پر میرے ذہن میں نہ تھی میں کوئی انتظامی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں محمد علی سے انکار نہ کرسکا۔ اس کے علاوہ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کوئی دوسرا شخص سکرٹری مقرر ہوا تو شاید وہ نئے صدر کے ساتھ اس ہم آہنگی سے کام نہ کرسکے جس طرح میں کرسکتا تھا۔ ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی دونوں بہت شدید ہوا کرتی تھیں اور میں خوش قسمتی سے ان لوگوں میں تھا جنھیں وہ پسند کرتے تھے۔ ہم میں الفت و محبت کے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان پر مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا جس میں میرے خیال میں



مولنا محمد علیؒ

عقلیت کی جھلک تک نہ تھی میں اس معاملے میں ان کے بالکل برعکس تھا۔ مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت کا دلدادہ تھا۔ ان کی تیزی طبع کی کوئی حد نہ تھی لیکن بعض اوقات ان کے طنز کا وار بہت گہرا پڑتا تھا۔ اسی کی وجہ سے کتنے دوست ان سے چھوٹ گئے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی چست فقرہ ان کے ذہن میں آجائے اور وہ اسے بے کہے چھوڑ دیں۔ اس وقت انھیں اس کا ذرا خیال نہ آتا کہ نتیجہ کیا ہوگا۔

ان کی صدارت کے زمانے میں ہم دونوں میں اچھی طرح نبھی۔ اگرچہ معمولی اختلافات اکثر ہو جاتے تھے۔ میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں یہ طریقہ رائج کرنا چاہا کہ تمام اراکین کو القاب و آداب کے بغیر مخاطب کیا جائے۔ ہندوستان میں القاب کی بڑی کثرت ہے مثلاً مہاتما، مولانا، پنڈت، شیخ، سید، منشی، مولوی اور پھر مسٹر اور اسکوائر۔ اب کچھ دن سے اس فہرست میں شریمت اور شری کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کا استعمال بے موقع اور بے ضرورت اس کثرت سے ہوتا ہے کہ میں انھیں مٹا کر ایک اچھی مثال قائم کرنا چاہتا تھا لیکن میری ایک بھی نہیں چلی۔ محمد علی نے مجھے ایک زور شور کا تار بھیجا جس میں صدر کی حیثیت سے یہ ہدایت کی تھی کہ پرانے دستور کو جاری رکھوں اور خصوصاً گاندھی جی کو ہمیشہ مہاتما کے لقب سے مخاطب کروں۔

ان میں اور مجھ میں خدا کے وجود کے بارے میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ محمد علی کی یہ عادت تھی کہ کانگریس کی قراردادوں میں بھی کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے مثلاً شکر کے طور پر یا دعا کے انداز میں۔ میں اس کے خلاف احتجاج کرتا تو مجھ پر برس پڑتے اور میری بے دینی پر مجھے خوب ڈانٹتے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہی وہ ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ چاہے تم ظاہری طور پر کچھ بھی کرو لیکن دل سے مذہبی آدمی ہو۔ میں نے اکثر اس پر غور کیا کہ ان کے اس بیان میں کہاں تک

صداقت ہے۔ پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہے کہ مذہب اور مذہبی کا مفہوم کیا قرار دیا جاتا ہے۔

میں مذہبی بحث سے ہمیشہ بچتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس طرح ہم دونوں کو غصہ آجائے گا۔ اور ممکن ہے کہ میری کسی بات سے ان کو تکلیف بھی پہنچے۔ ان لوگوں سے جو کسی عقیدے کے سختی سے پابند ہوں اس موضوع پر بحث کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے خصوصاً مسلمانوں سے مذہب کے معاملے میں گفتگو کرنا غالباً دشوار تر ہے اس لئے کہ ان کے مذہب میں آزادیٔ رائے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے ان کا تو ایک سیدھا اور تنگ راستہ ہے جس سے مومن کو بال بھر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹنا چاہیئے۔ ہندو اس سے کچھ مختلف ہوتے ہیں اگرچہ ہمیشہ نہیں۔ چاہے عمل میں وہ کتنے ہی کٹر کیوں نہ ہوں۔ اور چاہے وہ کتنی ہی دقیانوسی۔ رجعت پسندانہ اور فاسد رسوم کے پابند کیوں نہ ہوں، لیکن عام طور پر وہ مذہب کے متعلق سخت سے سخت انقلابی خیالات سننا اور ان پر گفتگو کرنا گوارا کر لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج کل کے آریہ سماجیوں کا نقطۂ نظر بھی اتنا وسیع اور رواداری نہیں ہے۔ مسلمانوں کی طرح وہ بھی ایک تنگ اور سیدھے راستے پر چلتے ہیں۔ ذی فہم ہندوؤں کے پاس کچھ فلسفیانہ روایات ایسی ہیں جن کا اثر ان کے اعمال پر تو نہیں پڑتا لیکن مذہبی مسائل پر عقلی نقطۂ نظر سے بحث کرنے میں ضرور فرق ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہندو مت کے دائرے میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت کتنی سخت ہے اور اس میں بقا کی کتنی زبردست قوت موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم ہندو فلسفی چارو ک تھا) لیکن کوئی یہ نہیں

کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں۔ ہندو مت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں میرے نام سے پنڈت کا لقب کسی طرح جدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ میں انتہائی کوشش کرتا ہوں کہ میرے نام کے ساتھ یہ یا اسی قسم کا اور کوئی لقب استعمال نہ کیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ سوئزرلینڈ میں ایک مرتبہ میں ایک ترکی عالم سے ملنے گیا۔ ان کے پاس ایک تعارفی خط میں نے پہلے ہی بھیجدیا تھا اس خط میں میرا نام پنڈت جواہرلال نہرو لکھا ہوا تھا۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت متعجب اور کچھ مایوس بھی ہوئے۔ کیونکہ پنڈت کے لقب سے وہ اس امید میں تھے کہ ان سے کوئی مقدس اور سن رسیدہ عالم ملنے آرہا ہے۔

مجھ سے اور محمد علی سے مذہبی بحثیں نہیں ہوتی تھیں لیکن ان میں خموشی کا وصف نہیں تھا۔ آخر چند سال بعد (غالباً ۱۹۲۵ء یا شروع ۱۹۲۶ء میں) ان کو یارائے ضبط نہ رہا اور ایک دن جب میں دہلی میں ان کے گھر ان سے ملنے گیا تو برس ہی پڑے کہنے لگے کہ تم سے مذہب کے معاملے میں بحث کئے بغیر نہ مانوں گا۔ میں نے انھیں باز رکھنے کی ہزار کوشش کی اور ان کو لاکھ سمجھایا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑسکتا۔ لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے کہنے لگے کہ "یہ بحث تو آج ہوگی ضرور۔ تم سمجھتے ہوگے کہ مجھے مذہبی جنون ہے لیکن میں آج یہ ثابت کرکے رہوں گا کہ مجھے جنون نہیں سچا جذبہ ہے"۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں مذہبی مسائل کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کرچکا ہوں اور مجھے ایک الماری دکھائی جس میں مختلف مذاہب خصوصاً اسلام اور عیسائیت پر کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں بعض جدید کتابیں بھی تھیں مثلاً ایچ۔ جی۔ ویلس کی کتاب

نذا، نادید بادشاہ" جنگ کے زمانے میں جب وہ کئی سال نظر بند رہے تھے تو انھوں نے قرآن کو بار بار پڑھا تھا اور سب تفسیروں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قرآن میں ۹۷ فی صدی ایسی باتیں ہیں جو سراسر عقل کے مطابق ہیں اور قرآن سے الگ کر کے اپنی جگہ پر بھی انھیں ثابت کیا جا سکتا ہے۔ باقی ۳ فی صدی باتوں کو اگرچہ عقل پہلی نظر میں تسلیم نہیں کرتی لیکن یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ جب قرآن کی ۹۷ فی صدی باتیں بدیہی طور صحیح ہیں تو باقی ۳ فی صدی بھی صحیح ہوں گی، بہ نسبت اس خیال کے کہ ہماری ناقص عقل صحیح ہے اور قرآن غلط۔ اس طرح قرآن کے حق میں شہادت اتنی قوی تھی کہ وہ اسے سو فی صدی صحیح تسلیم کرنے لگے۔

اس دلیل کی منطق اگرچہ واضح نہ تھی لیکن میں بحث سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ انھوں نے کہا اس پر واقعی مجھے بہت تعجب ہوا۔ کہنے لگے کہ میرا ایمان ہے کہ جو کوئی بھی قرآن کو بے تعصب ہو کر تلاش حق کے خیال سے پڑھے گا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ باپو (گاندھی جی) نے قرآن کو غور سے پڑھا ہے اور وہ ضرور اسلام کی حقانیت کے قائل ہوں گے لیکن محض خود بینی کی وجہ سے اس کا اعلان نہیں کر سکتے۔

اپنے زمانۂ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں، کانگریس ان سے دور ہونے لگی۔ یہ صورت بہت آہستہ آہستہ واقع ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی سال تک وہ کانگریس اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شریک ہوتے اور زور و شور سے حصہ لیتے رہے۔ لیکن اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی اور بیگانگی برابر بڑھتی گئی۔ اس میں غالباً کسی فرد یا افراد کا قصور نہیں تھا۔ بلکہ ان حالات کا جو ملک میں رونما ہوئے یہ لازمی نتیجہ تھا۔ وجہ کچھ

بھی ہو لیکن اس افسوسناک نتیجے سے ہم میں سے بہتوں کو رنج ہوا۔ اس لئے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رہا ہو۔ سیاسی معاملے میں بہت کم اختلاف تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے وہ دل سے شیدائی تھے۔ اس بنا پر اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل پر بھی ان سے کوئی ایسا سمجھوتا ہو جاتا، جو دونوں فریقوں کو پسند ہوتا۔ سیاسی حیثیت سے وہ ان رجعت پسندوں سے جو فرقہ وارانہ مفاد کے علمبردار بنتے ہیں کوسوں دور تھے۔

یہ ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ وہ ۱۹۲۸ء کی گرمیوں میں یورپ چلے گئے اس زمانے میں فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی اور کامیابی کی امید ہو چلی تھی۔ اگر محمد علی اس وقت موجود ہوتے تو یقین ہے کہ حالات کچھ اور ہوتے لیکن ان کے واپس آنے تک پھوٹ پڑ چکی تھی۔ اور جب وہ آئے تو ناچار انھیں مخالف گروہ کے ساتھ ہونا پڑا۔

دو برس بعد ۱۹۳۰ء میں جب سول نافرمانی پورے زور پر تھی اور ملک کے بیشمار آدمی قید میں پڑے تھے محمد علی نے کانگریس کے فیصلے کا کوئی پاس نہیں کیا اور گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مجھے ان کے جانے سے بہت دکھ ہوا۔ میرے خیال میں وہ خود اپنی شرکت سے خوش نہ تھے۔ ان کی لندن کی سرگرمیوں سے بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہاں انھیں یہ احساس ہوا کہ ان کی اصلی جگہ آزادی کی جنگ میں تھی جو ہندوستان میں چھڑی ہوئی تھی نہ کہ اس بے نتیجہ کانفرنس کے اجلاس میں جو لندن میں ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے ملک کو واپس آگئے ہوتے تو ضرور اس جنگ میں شریک ہو جاتے۔ ان کی صحت جواب دے چکی تھی اور کئی سال سے ان کی حالت بگڑتی جاتی تھی۔ لندن پہنچ کر انھیں یہ فکر چین نہیں لینے دیتی تھی کہ کچھ حاصل کرنا چاہیئے اور کوئی معقول کام کرنا چاہیئے۔ حالانکہ اس

وقت انھیں علاج اور آرام کی سخت ضرورت تھی اسی فکر نے ان کی زندگی کا چراغ بہت جلد بجھا دیا۔ نینی جیل میں جب ان کی موت کی خبر پہنچی تو مجھے بہت سخت صدمہ پہنچا۔

ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس میں ہوئی تھی۔ میرے خطبہ صدارت کے بعض حصے ان کو پسند نہیں آئے اس لئے ان پر انھوں نے بڑی سختی سے اعتراض کئے۔ انھوں نے دیکھا کہ کانگریس آگے بڑھ رہی ہے اور اس کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ جارحانہ ہوتی جاتی ہیں۔ وہ خود جارحانہ طبیعت رکھتے تھے اس وجہ سے انھیں یہ بات پسند نہیں آتی تھی کہ وہ تو پچھلی صف میں بیٹھے رہیں اور کوئی دوسرا ان سے آگے نکل جائے۔ انھوں نے مجھے اس موقع پر یوں متنبہ کیا "جواہر! میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے موجودہ ساتھی تمہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ جب نازک وقت آئے گا تو یہ لوگ تمہارا ساتھ نہیں دینگے۔ اور تمہارے اپنے کانگریسی تمہیں پھانسی کے تختے تک پہنچا دیں گے"۔ کیسی ہیبت ناک پیشین گوئی تھی!

کوکوناڈا کانگریس میں جو دسمبر ۱۹۲۳ء میں منعقد ہوئی تھی میری دلچسپی کا ایک خاص سامان بھی تھا۔ تمام ہندوستان کے رضاکاروں کی جماعت "ہندوستانی سیوا دل" کی بنیاد وہیں رکھی گئی۔ انتظامی کام یا جیل جانے کے لئے رضاکاروں کی کمی پہلے بھی نہ تھی۔ لیکن اتحاد عمل و انضباط کی کمی ضرور تھی۔

ڈاکٹر ن۔ س۔ ہارڈیکر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ تمام ہندوستان کے رضاکاروں کی ایک باضابطہ اور منظم جماعت قائم کی جائے اور اسے کانگرس کی ہدایات کے مطابق قومی کام کی تعلیم دی جائے۔ انھوں نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اس کام میں ان کی مدد کروں اور میں نے خوشی سے اسے منظور کر لیا۔ کیونکہ یہ خیال مجھے خود بہت پسند تھا۔ کوکوناڈا میں اس کام کی ابتدا ہوئی۔ بعد میں ہیں

یہ معلوم کرکے بہت تعجب ہوا کہ کانگرس کے بڑے رہنماؤں میں سے بہت سے حضرات سیوادل کے مخالف تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ خطرناک بدعت ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کانگرس میں ایک فوجی عنصر کا اضافہ کیا جائے۔ ان کو یہ خوف تھا کہ کہیں یہ فوجی عنصر سول عنصر پر غالب نہ آجائے۔ دوسروں کا یہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ رضاکاروں کو صرف اتنی تربیت درکار ہے کہ اوپر سے انھیں جو حکم ملے اس کی بے چون وچرا تعمیل کریں۔ انھیں اس کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ قدم ملا کر چلنا سیکھیں اس رائے کی تہ میں غالباً یہ خیال تھا کہ ایک ایسی جماعت کا وجود جسے صف بندی اور فوجی قواعد کی تعلیم دی گئی ہو، کانگرس کے عدم تشدد کے اصول کے منافی تھا لیکن ہارڈیکر نے اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کردی اور سالہا سال کی ان تھک کوشش سے یہ ثابت کردکھایا کہ تربیت یافتہ رضاکار کتنے مستعد۔ کارآمد اور اسی کے ساتھ عدم تشدد کے پابند ہو سکتے ہیں۔

جنوری ۱۹۲۴ء میں کوکناڈا سے واپسی کے بعد ہی الہ آباد میں مجھے ایک نئی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ میں اپنی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے تاریخوں میں گڑبڑ ہو جائے، لیکن جہاں تک مجھے خیال ہے یہ کمبھ یا اردھ کمبھ کا زمانہ تھا جب الہ آباد میں گنگا کے کنارے اشنان کا زبردست میلہ ہوتا ہے۔ لاکھوں یاتری وہاں آتے ہیں اور گنگا جمنا کے سنگم پر اشنان کرتے ہیں۔ اسے تربینی کہتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سرسوتی ندی جس کے افسانے مشہور ہیں زمین کے نیچے نیچے ان دونوں میں آملی ہے۔ یہاں گنگا کا پاٹ عموماً کوئی ایک میل چوڑا ہوتا ہے لیکن جاڑوں میں دریا سوکھ جاتا ہے اور بہت بڑا ریتیلا میدان چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں یاتری اترا کرتے ہیں۔ اس حصے میں گنگا کی دھار بدلتی رہتی ہے ۱۹۲۴ء میں گنگا کی دھار کچھ اس طرح واقع ہوئی تھی کہ یاتریوں کے لئے تربینی

میں نہانا صریحاً خطرناک تھا اور اگر بعض احتیاطیں کر لی جائیں اور ایک وقت میں اشنان کرنے والوں کی تعداد مقرر کر دی جاتی تو خطرے کے امکانات کم ہو سکتے تھے۔

مجھے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ میں ان مقدس ایام میں گنگا میں اشنان کر کے ثواب حاصل کرنے کا قائل نہ تھا لیکن میں نے اخباروں میں پڑھا کہ صوبے کی حکومت (یا مقامی حکومت) نے یہ حکم دیا تھا کہ کوئی شخص تربینی پہ ہرگز نہ نہائے۔ اور اس معاملے میں پنڈت مدن موہن جی مالویہ اور حکومت کے درمیان جھگڑا چل رہا تھا۔ مالویہ جی کو اس پہ مذہبی نقطۂ نظر سے اعتراض تھا کیونکہ اس تقریب کا سارا مقصد ہی یہ تھا کہ تربینی میں اشنان کیا جائے۔ حکومت بھی اپنی جگہ پہ بالکل حق بجانب تھی کہ احتیاط کی تدابیر اختیار کرے تاکہ زیادہ حادثے نہ ہونے پائیں اور جانیں ضائع نہ ہوں۔ لیکن حسب معمول اس نے اپنا کام نہایت کھرے اور ناگوار طریقے سے شروع کیا۔

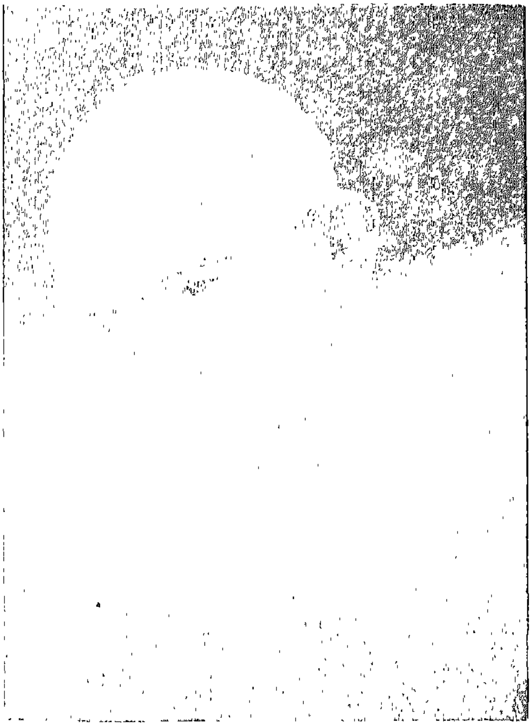
خاص کمبھ کے دن میں صبح صبح اٹھ کر میلہ دیکھنے کے لئے سنگم پہ گیا۔ نہانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ گھاٹ پہ پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ مالوی جی نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو کوئی مہذب قسم کا الٹی میٹم بھیجا تھا۔ یعنی ان سے تربینی میں اشنان کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ مالویہ جی بہت برہم تھے اور ساری فضا پہ جوش چھایا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پہ مالوی جی نے ستیا گرہ کرنا طے کر لیا اور کوئی دو سو آدمیوں کو ساتھ لے کر سنگم پر روانہ ہوئے۔ مجھے اس قسم کے واقعات سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ وقت کے وقت میں بھی ستیا گرہیوں میں شامل ہو گیا۔ سنگم کے قریب ریتیلے میدان میں لکڑیوں کا ایک زبردست کٹہرا بنا دیا گیا تھا تاکہ لوگ تربینی تک نہ پہنچ سکیں جب ہم اس اونچے کٹہرے کے قریب پہنچے تو پولیس نے ہمیں روک دیا اور ہمارے پاس جو سیڑھی تھی اسے چھین لیا۔ چونکہ ہم عدم تشدد کے ماننے والے ستیا گرہی تھے اس

لیے ہم کٹہرے کے پاس ہی ریت پر خاموشی سے بیٹھ گئے ہم وہاں صبح سے سہ پہر تک برابر بیٹھے رہے۔ دن چڑھتا جاتا تھا، دھوپ تیز ہوتی جاتی تھی۔ ریت گرم ہونے لگی اور ہم سب کو بھوک بھی لگنے لگی۔ پیدل اور سوار پولیس ہمارے دونوں طرف، پرے جمائے کھڑی تھی۔ شاید باضابطہ فوج بھی وہاں موجود تھی۔ اب ہم میں سے اکثروں کو صبر کا یارا نہ رہا اور سوچنے لگے کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ حکام بھی بے چین ہو رہے تھے اس لیے انھوں نے طے کیا کہ پیش قدمی کرنا چاہیے۔ سواروں کو کچھ حکم دیا گیا۔ چنانچہ وہ گھوڑوں پہ سوار ہونے لگے۔ مجھے یہ خیال پیدا ہوا (نہ جانے صحیح تھا یا غلط) کہ وہ ہم پہ حملہ کرنے والے ہیں اور اس طرح ہمیں مار بھگانا چاہتے ہیں۔ سواروں کے ہاتھوں یوں رگیدا جانا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا اس کے علاوہ میں بیٹھے بیٹھے بھی اکتا گیا تھا۔ اس لیے جو لوگ میرے پاس بیٹھے تھے ان سے میں نے یہ کہا کہ اب کٹہرے پر چڑھائی کرنا چاہیے۔ یہ کہہ کر میں یکایک اس پر چڑھ گیا۔ فوراً ہی بیسیوں آدمی اس پہ چڑھنے لگے۔ بعض نے اس میں سے چند لکڑیاں کھینچ کر پھینک دیں۔ بس پھر راستہ بن گیا کسی نے میرے ہاتھ میں ایک قومی جھنڈا دے دیا۔ میں نے اسے کٹہرے کے اوپر لگا دیا اور خود وہیں بیٹھا رہا۔ میں اس وقت بڑے جوش میں تھا اور یہ دیکھ دیکھ کر مجھے ایک خاص لطف آ رہا تھا کہ لوگ کٹہرے پہ چڑھ رہے ہیں اسے پھاند پھاند کر آگے بڑھ رہے ہیں اور سوار پولیس انھیں دھکے دے دے کر پیچھے ہٹا رہی ہے۔ یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سواروں نے اپنا کام حتی الامکان اس طرح انجام دیا کہ کسی کے چوٹ نہ آنے پائے۔ وہ اپنے لکڑی کے ڈنڈے چاروں طرف گھماتے تھے۔ لوگوں کو ان سے دھکے دیتے تھے لیکن مارتے نہیں تھے۔ اس وقت انقلابی محاصروں کا ایک دھندلا سا خاکہ میری نظروں کے سامنے کھنچ گیا۔

آخر کار میں بھی دوسری طرف کود گیا اور چونکہ سخت تنگ دو کی وجہ سے مجھے

بڑی گرمی لگ رہی تھی اس لئے میں نے بڑھ کر گنگا میں ایک غوطہ لگا لیا۔ جب میں واپس آیا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ مالویہ جی اور بہت سے دوسرے ستیا گرہی اب بھی وہیں بیٹھے ہیں لیکن اب سوار اور پیدل پولیس کاندھے سے کاندھا ملائے ستیا گرہیوں اور کٹہرے کے درمیان کھڑی تھی اس لئے میں ذرا چکر کاٹ کر گیا اور مالویہ جی کے پاس پھر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے میں دیکھ رہا تھا کہ مالویہ جی پیچ و تاب کھا رہے ہیں معلوم ہوتا تھا وہ کسی زبردست اندرونی جذبے پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یکایک بغیر کسی سے کچھ کہے سنے پولیس والوں اور گھوڑوں کے بیچ سے عجیب و غریب طریقے سے کود کر نکل گئے۔ کوئی بھی اس طرح جست لگاتا تو دیکھ کر تعجب ہوتا لیکن مالویہ جی جیسے بوڑھے اور نحیف البجثہ شخص کے لئے یہ پھرتی اور بھی حیرت انگیز تھی۔ غرض ہم سب ان کے پیچھے پیچھے چلے اور سب نے اسی طرح کود کود کر نکلنا شروع کیا۔ پیدل اور سوار پولیس نے کچھ دیر تو ہمیں روکنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد چپ ہو رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہاں سے ہٹا لی گئی۔

ہمیں کچھ کچھ خیال تھا کہ حکومت ہم پر مقدمہ چلائے گی لیکن اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ غالباً حکومت مالویہ جی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے ان کے طفیل میں چھوٹے لوگ بھی صاف بچ گئے۔



مہاتما گاندھی

(۱۸)

میرے والد اور گاندھی جی

سنہ ۱۹۲۴ء کے آغاز میں یکایک یہ خبر ملی کہ گاندھی جی جیل میں سخت بیمار ہیں اس کے بعد وہ اسپتال میں منتقل کر دیئے گئے اور وہاں ان کا آپریشن ہوا۔ سارے ملک میں انتہائی تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ سب سناٹے میں تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے بہر حال یہ نازک وقت گذر گیا اور ملک کے گوشہ گوشہ سے جوق جوق لوگ انھیں دیکھنے کے لئے پونا جانے لگے۔ ابھی وہ زیرِ حراست قیدی کی حیثیت سے اسپتال ہی میں تھے لیکن دوستوں کی ایک مقررہ تعداد سے انھیں ملنے کی اجازت تھی چنانچہ والد اور میں بھی ان سے اسپتال میں ملنے گئے۔

وہ اسپتال سے پھر جیل خانے نہیں بھیجے گئے۔ جب وہ ذرا رو بہ صحت ہوئے تو حکومت نے ان کی باقی سزا معاف کر دی اور انھیں رہا کر دیا۔ وہ چھ سال میں سے دو سال کی سزا پوری کر چکے تھے۔ بمبئی کے قریب ساحل سمندر پہ ایک مقام جوہو ہے۔ رہائی کے بعد وہ بحالی صحت کے لئے وہاں چلے گئے۔

ہمارا خاندان بھی جوہو گیا اور وہاں سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی کٹی میں ٹھہر گیا۔ ہم کئی ہفتے وہاں رہے اور ایک عرصے کے بعد مجھے دل بھر کے تفریح کا موقع ملا۔ میں بے تکلف سمندر میں تیرتا تھا۔ ساحل پر دوڑتا تھا اور گھوڑے کی سواری کرتا تھا۔ لیکن ہمارے وہاں جانے کا اصل مقصد تفریح نہ تھا۔ بلکہ ہم گاندھی جی سے گفتگو کرنے کے لئے وہاں گئے تھے۔ والد یہ چاہتے تھے کہ

ے سامنے سوراجیوں کا نقطۂ نظر پیش کریں اور اگر عملی امداد نہیں تو کم سے کم ان کا
ن تعاون ہی حاصل ہو جائے ہیں بھی ان مسائل پر جو دن رات میرے دل
انٹے کی طرح کھٹکتے تھے ان سے گفتگو کر کے تسکین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اصل
مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ آئندہ ان کا عملی پروگرام کیا ہو گا۔

جو ہوئے بحث مباحثے میں سوراجی گاندھی جی کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب نہیں
ئے اور نہ انھیں ذرا بھی متاثر کر سکے۔ بات چیت بہت دوستانہ طریقے سے ہوئی اور ایک
ے سے بہت اخلاق سے پیش آئے لیکن اس کے باوجود حقیقت میں کوئی سمجھوتا
ہو سکا۔ دونوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہم ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو سکتے چنانچہ
روں میں اسی مضمون کے اعلان شائع کر دیے گئے۔

میں بھی جوہو سے کچھ مایوس لوٹا۔ کیونکہ گاندھی جی میرے شبہات کو بھی رفع
کر سکے حسب عادت انھوں نے آئندہ کی فکر میں سر کھپانے سے یا ایک طویل
ے کے لئے کوئی پروگرام بنانے سے انکار کر دیا۔ ان کا قول تھا کہ ہمیں نہایت
ملال کے ساتھ قوم کی خدمت کرتے رہنا چاہیئے اور کانگرس کے تعمیری اور اصلاحی
رام پر عمل کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ جارحانہ کارروائی کا وقت آجائے لیکن میرے
میں اصلی شبہہ یہ تھا کہ فرض کیجئے وہ وقت آ بھی جائے تو کیا چورا چوری کا سا کوئی
واقعہ پیش نہ آئے گا جو ہماری تمام امیدوں پر پانی پھیر دے اور دوبارہ ہماری
ت کو روک دے؟ اس سوال کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اس کے علاوہ
کے ذہن میں کوئی واضح اور معین منزل مقصود نہیں تھی لیکن ہم میں سے اکثر لوگ
ننا چاہتے تھے کہ آخر ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ہمیں اس پر اصرار نہیں تھا کہ کانگرس
وقت کوئی باضابطہ اعلان کر دے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آیا کانگرس مکمل
ی اور کسی حد تک سماجی انقلاب کی حامی ہے یا ہمارے رہنما اس سے بہت

کم پر راضی ہو جائیں گے؟ ابھی چند مہینے پہلے میں نے صوبہ متحدہ کی کانفرنس میں اپنے خطبہ صدارت میں مکمل آزادی کے مسئلے پر زور دیا تھا۔ یہ کانفرنس ۲۳ء کے موسم خزاں میں ہوئی تھی۔ یعنی نابھے سے میری واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد ان دنوں میں اس مرض میں مبتلا تھا جو نابھے سے تحفے کے طور پر اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں کانفرنس میں شریک تو نہیں ہو سکا لیکن میرا خطبہ صدارت وہاں پڑھ کر سنا دیا گیا جو میں نے تیز بخار میں لیٹے لیٹے لکھا تھا۔

ایک طرف تو ہم کانگرس میں مکمل آزادی کے مسئلے کو صاف کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف ہمارے لبرل دوست ہم سے اتنے دور ہوتے جاتے تھے (یا یوں کہیے کہ ہم انھیں اتنا پیچھے چھوڑتے جاتے تھے) کہ وہ کھلم کھلا سلطنت برطانیہ کے جاہ و حشم پر اتراتے تھے۔ حالانکہ سلطنت ہمارے ہموطنوں کو پاپوش کے برابر نہیں سمجھتی تھی اور اس کی نوآبادیاں ہمارے بھائیوں کو غلاموں کی طرح رکھتی تھیں یا انھیں گھسنے تک نہیں دیتی تھیں۔ مسٹر شاستری شاہی سفیر بن بیٹھے تھے۔ اور سر تیج بہادر سپرو نے ۱۹۲۳ء کی امپیریل کانفرنس (لندن) میں بڑے فخر سے یہ اعلان کیا تھا کہ "مجھے اس بات پر ناز ہے کہ آج میرا ہی ملک سلطنت کو سلطنت بنائے ہوئے ہے"۔

غرض ہمارے اور ان لبرل لیڈروں کے درمیان کوئی معمولی خلیج نہیں بلکہ زبردست سمندر حائل تھا۔ ہم ایک دوسرے سے مختلف دنیا میں بستے تھے مختلف زبانیں بولتے تھے اور مختلف قسم کے خواب دیکھتے تھے (مجھے اسی میں شک ہے کہ وہ کوئی خواب دیکھتے بھی تھے) اس لئے کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ ہماری منزل مقصود واضح اور معین ہو جاتی؟ لیکن یہ خیالات اس وقت معدودے چند اشخاص تک محدود تھے۔ تعین اکثر حضرات کو پسند نہیں ہوتا خصوصاً قومی تحریک

میں جو فطرتاً مبہم اور تھوڑی بہت پُراسرار ہوتی ہے۔

۱۹۲۴ء کے آغاز میں پبلک کی توجہ زیادہ تر ان سوراجیوں کی طرف تھی جو اسمبلی اور کونسلوں میں گئے تھے۔ لوگ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں یہ جماعت "گھر میں گھس کر مخالفت کرنے" اور کونسلوں کو توڑنے کے لمبے چوڑے دعووں کے بعد وہاں کیا کرتی ہے۔ بہرحال شروع شروع میں سوراجیوں نے دو چار اثر ڈالنے والے کام کئے۔ اسمبلی نے سال آئندہ کا بجٹ نامنظور کر دیا۔ اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے گول میز کانفرنس کے مطالبے کی قرارداد منظور کی۔ بنگال کونسل نے بھی دیش بندھو کی رہبری میں سرکاری اخراجات کے مطالبے کو ٹھکرا دیا لیکن اسمبلی اور صوبوں کی کونسلوں دونوں میں وائسرائے یا گورنر نے ان نامنظور شدہ بجٹوں پر اپنی منظوری صادر فرما دی اور یہ حسب معمول نافذ ہو گئے۔ کونسلوں میں کچھ زوردار تقریریں ہوئیں، کچھ جوش و خروش کا مظاہرہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے لئے سوراجیوں کو اپنی فتح کا نشہ ہو گیا اور اخباروں میں موٹی موٹی سرخیوں سے مضمون نکلے لیکن اس کے آگے اور کچھ نہ تھا۔ اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتے تھے، سوا اس کے کہ وہ انھیں ترکیبوں کو بار بار دُہراتے۔ مگر اب ان میں کوئی جدّت نہیں رہی تھی۔ لوگوں کا جوش و خروش ختم ہو گیا اور وہ اس کے عادی ہو گئے کہ وائسرائے یا گورنر نے نامنظور شدہ بجٹ یا قانون کو منظور کر کے نافذ کر دیا۔ اس کے آگے جو قدم اٹھایا جا سکتا تھا وہ کونسلوں کے اندر سوراجیوں کے امکان سے باہر تھا۔ وہ تو صرف ایوان کونسل کے باہر ہی ممکن تھا۔

اسی سال وسط ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک جلسہ احمد آباد میں ہوا۔ اس جلسے میں گاندھی جی اور سوراجیوں کے درمیان خلاف توقع ایک تیز جھڑپ ہو گئی۔ اور عجیب تماشے ہوئے۔ ابتدا گاندھی جی نے کی۔ انھوں نے کانگرس کے

دستور میں بعض بنیادی تبدیلیوں کی تجویز پیش کی جس سے رکنیت کے قواعد اور رائے دہندگی کی نوعیت بدل گئی۔ اب تک جو شخص کانگریس کے آئین کی پہلی دفعہ کو تسلیم کرتا تھا (یعنی سوراج کا مسلک اور پرامن ذرائع سے اس کا حاصل کرنا) اور چار آنے سالانہ ادا کرتا تھا وہ کانگریس کا رکن بن سکتا تھا۔ اب وہ رکنیت کو صرف ان لوگوں تک محدود کر دینا چاہتے تھے جو چار آنے کے بجائے اپنے ہاتھ کے کتے ہوئے سوت کی ایک مقررہ مقدار داخل کریں۔ اس تجویز سے حق رائے دہی پر زبردست اثر پڑتا تھا۔ اس لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ اس مسئلے کا فیصلہ کرے۔ لیکن اگر دستور کے الفاظ یا اس کی ظاہری شکل کبھی گاندھی جی کے راستے میں حائل ہوتی تھی تو وہ اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ میں اسے کانگریس کے دستور کی توہین سمجھتا تھا اس لئے مجھے گاندھی جی کے اس طرز عمل سے سخت صدمہ ہوا اور میں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے سکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس کے بعد بعض نئی صورتیں پیدا ہوگئیں اور میں نے اپنے استعفے پر اصرار نہیں کیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں میرے والد اور مسٹر سی۔ آر۔ داس نے اس تجویز کی بڑی شدومد سے مخالفت کی۔ اور بالآخر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کی غرض سے وہ اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت رائے شماری سے پہلے جلسے سے اٹھ کر چلے گئے۔ پھر بھی اس تجویز کے بہت سے مخالف جلسے میں بیٹھے رہے۔ یہ تجویز اکثریت سے منظور ہو گئی۔ لیکن آخر کار واپس لے لی گئی۔ کیونکہ گاندھی جی پر سوراجیوں کے اٹھ کر چلے جانے کا اور اس مسئلے پر دلیش بندھو اور والد کے سخت رویہ کا بے حد اثر ہوا ان کے جذبات میں سخت ہیجان تھا۔ کسی رکن نے اتفاقاً کوئی ایسا فقرہ کہہ دیا جس سے وہ پھوٹ پڑے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں روحانی تکلیف پہنچی ہے۔ انھوں نے کمیٹی کے سامنے بڑے رقت انگیز انداز میں تقریر کی۔ جس سے اکثر اراکین کے آنسو

نکل آئے۔ یہ بڑا غیر معمولی اور دل ہلا دینے والا سماں تھا۔"(۱)

---

(۱) میں نے مذکورہ بالا واقعہ جیل میں محض اپنی یاد سے لکھا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میری یادنے غلطی کی۔ اور میں نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے مباحث کے ایک اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا جس سے اصل واقعہ کی نوعیت بدل گئی۔ گاندھی جی جس قرار داد سے متاثر ہوئے تھے وہ ایک نوجوان بنگالی تخریب پسند گوپی ناتھ ساہا کے متعلق تھی۔ یہ قرار داد کمیٹی کے جلسے میں پیش ہو کر نا منظور ہو گئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس قرار داد کے ذریعہ اس کے فعل کی تو مذمت کی گئی تھی۔ لیکن اس کی نیت کی بنا پر اس سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا قرار داد سے زیادہ گاندھی جی کو ان تقریروں سے تکلیف پہنچی جو اس کی حمایت میں کی گئیں۔ اور یہ خیال کہ بہت سے کانگریسی دل سے عدم تشدد کے معتقد نہیں ہیں ان کے لئے زیادہ پریشانی کا باعث ہوا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے ینگ انڈیا میں اس جلسے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا "اپنی چار قرار دادوں کے حق میں معمولی سی اکثریت تو مجھے حاصل ہو گئی لیکن میں اپنے آپ کو اقلیت ہی میں سمجھتا ہوں۔ کمیٹی کی رائیں تقریباً برابر برابر تقسیم تھیں۔ گوپی ناتھ ساہا والی قرار داد نے مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا۔ جو تقریریں اس کی حمایت میں کی گئیں ان کا جو نتیجہ ہوا اور اس نتیجے کے بعد جو مناظر میں نے دیکھے۔ ان سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ گوپی ناتھ ساہا والی قرار داد کے بعد جلسے کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اسی جلسے کے سامنے مجھے اپنا آخری رزولیوشن پیش کرنا پڑا۔ جیسے جیسے جلسے کی کارروائی ہو رہی تھی میری پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس دل دکھانے والی فضا سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ میرے سپرد جو قرار داد تھی اسے پیش کرتے ہوئے مجھے خوف معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں میں نے اس چیز کو صاف کر دیا ہے یا نہیں کہ کسی مقرر کے دل میں کسی قسم کا بغض نہ تھا۔ مجھے صرف یہ (باقی)

معلوم نہیں کہ وہ صرف سوت کاتنے کو رائے دہندگی کی شرط قرار دینے پر اتنے کیوں مصر تھے۔ کیونکہ انھیں علم تھا کہ اس کی سخت مخالفت ہوگی۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ کانگرس میں صرف وہ لوگ رہیں جو ان کے کھادی وغیرہ کے تعمیری پروگرام کے حامی ہوں۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ دوسرے یا تو اس کے قائل ہو جائیں یا بالکل چلے جائیں لیکن اگرچہ انھیں اکثریت حاصل تھی پھر بھی وہ اپنے ارادے میں نرم پڑ گئے اور فریق ثانی سے سمجھوتا کرنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ آئندہ دو تین ماہ میں انھوں نے اس مسئلے میں کتنے پلٹے کھائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود چکر میں ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں ہیں اور کدھر جانا چاہتے ہیں۔ کم سے کم ان کی نسبت مجھے یہ توقع نہ تھی کہ ان کی بھی ایسی حالت ہو سکتی ہے۔ میرے تعجب کی بس یہی وجہ تھی ورنہ خود یہ مسئلہ کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ خیال اپنی جگہ پر بہت مناسب تھا کہ جسمانی محنت رائے دہندگی کی شرط قرار دی جائے لیکن اس محدود شکل میں اسے پیش کرنے سے اس کا سارا مفہوم ہی خبط ہو جاتا تھا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱۶) خیال ستاتا تھا کہ لوگ غیر ارادی طور پر کتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دے رہے ہیں اور کانگرس کے عدم تشدد کے مسلک کو کس بُری طرح ٹھکرا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ کانگرس کے اندر ستر آدمی ایسے نکل سکتے ہیں جو اس قرارداد کی حمایت کریں میرا دل تو بیٹھ گیا۔"

یہ واقعہ اور گاندھی جی کی یہ تنقید نہایت اہم ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عدم تشدد کو کتنی غیر معمولی اہمیت دیتے تھے اور اس کی مخالفت کا چاہے وہ بالکل غیر ارادی اور بالواسطہ کیوں نہ ہو ان پر کتنا زبردست اثر ہوتا تھا۔ آگے بھی انھوں نے جو کچھ کیا غالباً اس کا بیشتر حصہ اصل میں انھیں اثرات کا نتیجہ تھا۔ عدم تشدد تو گویا ان کی پالیسی اور ان کی تمام سرگرمیوں کی جان تھی۔

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گاندھی جی کو ان مشکلات کا سامنا محض اس لئے ہے کہ وہ نامانوس میدان سے گزر رہے ہیں. ستیاگرہ کی عملی جدوجہد کے نشیب و فراز سے وہ خوب واقف ہیں اس لئے خود بخود ان کا قدم بالکل صحیح پڑتا ہے. وہ سماجی اصلاح کے لئے عوام میں نہایت خاموشی سے خود کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں. وہ خالص جنگ یا خالص صلح کے قائل تھے. کسی درمیانی چیز کو پسند نہیں کرتے تھے. اس لئے سوراجیوں کے اس پروگرام سے کہ کونسلوں کے اندر جا کر حکومت کو پریشان کریں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی. ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص کونسلوں میں جانا چاہتا ہے تو وہ اس مقصد سے جائے کہ حکومت کے ساتھ تعاون کرکے اچھے اچھے قوانین بنوائے گا. اُسے زیادہ آئینی طریقے سے حکومت کرنے پر مجبور کرے گا، وغیرہ وغیرہ. لیکن مخالفت کے خیال سے وہاں جانے کے کوئی معنی نہیں ہیں اور اگر مخالفت کرنا ہے تو اسے کونسلوں سے باہر رہنا چاہیئے. سوراجی ان دونوں حالتوں کے بین بین تھے. یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی کے اور ان کے تعلقات میں گتھیاں پڑ گئی تھیں.

آخرکار انھوں نے لوگوں کے ساتھ تصفیہ کرلیا. سوت کاتنے کی شرط اختیاری قرار دے دی گئی اور چار آنے ادا کرکے ممبر بننے کا اصول بھی قایم رہا کونسلوں میں سوراجیوں کے کام کو گاندھی جی نے آشیرباد بھی دی لیکن جہاں تک ان کی ذات کا تعلق تھا وہ قطعاً علیحدہ رہے. لوگ یہ کہنے لگے کہ وہ سیاسیات سے کنارہ کش ہوگئے ہیں. اور حکومت اور اس کے عمّال نے یہ سمجھ لیا کہ ان کی ہردل عزیزی کم ہوگئی اور ان کی قوت ختم ہوچکی ہے. بعض لوگوں کا خیال تھا کہ داس اور نہرو نے انھیں میدان سے نکال دیا. اور اب سیاسیات میں انھیں دونوں کا سکہ چلتا ہے. گذشتہ پندرہ برس میں کم و بیش انھیں خیالات کا

بار بار اعادہ کیا گیا ہے اور ہر مرتبہ یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ہمارے حکمران ہندوستانیوں کے جذبات سے کس قدر نا آشنا ہیں حقیقت یہ ہے کہ جب سے گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئے ہیں جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کی مقبولیت میں کبھی کمی نہیں آئی بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے اور یہ ترقی اب بھی جاری ہے لوگ چاہے ان کے حکم کی تعمیل نہ کریں کیونکہ انسان فطرتاً کمزور ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل مہاتما کی عقیدت سے معمور ہیں جب حالات موافق ہوتے ہیں تو لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور زبردست تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں ورنہ خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی رہنما کسی عام تحریک کو جادو کے ذریعے وجود میں نہیں لاتا۔ بلکہ جب موزوں حالات پیدا ہو جاتے ہیں تو ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ان حالات کے لئے لوگوں کو تیار کر سکتا ہے۔ حالات کو پیدا نہیں کر سکتا۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں ان کا اثر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے جب تحریک کا زور ہوتا ہے تو یہ لوگ ان کی پیروی کرنے لگتے ہیں، جب وہ سست پڑ جاتی ہے تو نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی ان کی جو عظمت لوگوں کے دلوں میں ہے اس میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی دوسرا موثر پروگرام موجود نہیں ہے۔ لبرل اور ان ہی کی طرح کی دوسری جماعتیں، مثلاً جوابی تعاون کے حامی، کسی شمار میں نہیں ہیں۔ تخویف پسند جدید تہذیب میں ٹکسال باہر ہیں۔ اور ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اشتراکی پروگرام ابھی اچھی طرح روشناس نہیں ہوا ہے اور کانگرس کے اونچے طبقے کے اراکین اس سے ڈرتے ہیں۔

۱۹۲۴ء کے وسط میں معمولی سے سیاسی اختلاف کے بعد گاندھی جی اور والد کے درمیان قدیم مراسم بھی پھر قائم ہو گئے بلکہ ان میں اور زیادہ خلوص پیدا ہو گیا۔ چاہے ان میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہوتا، لیکن ایک دوسرے کا غیر معمولی لحاظ کرتے

اور حفظ مراتب میں کبھی فرق نہ آنے پاتا۔ آخر گاندھی جی میں وہ کون سی بات تھی جس کی وہ اتنی عزت کرتے تھے؟ گاندھی جی کی تحریروں کا ایک انتخاب "خیالات کے دھارے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ والد نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ یہ مقدمہ اس معاملے میں ان کے خیالات کا آئینہ ہے۔

وہ تحریر فرماتے ہیں "میں نے مہاتماؤں اور ما فوق الفطرت انسانوں کے تذکرے سُنے ہیں لیکن کبھی ان کی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ اس لئے مجھے ان کے وجود میں شک ہے۔ میں تو انسانوں اور انسانی باتوں کا قائل ہوں۔ "یہ خیالات کے دھارے" جو اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ ایک انسان کی فکر کا نتیجہ اور انسانی باتیں ہیں۔ وہ انسانی فطرت کی دو زبردست خصوصیات کے مظہر ہیں یعنی عقیدہ اور طاقت ....

جو شخص نہ عقیدہ رکھتا ہے اور نہ طاقت، یہ سوال کرتا ہے کہ آخر ان سب باتوں کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ جواب کہ "فتح یا موت" اسے مطمئن نہیں کر سکتا...... لیکن ایک عاجز اور مسکین شخص غیر متزلزل عقیدے اور غیر مفتوح طاقت کی بنیادوں پر قدم جمائے سیدھا کھڑا ہے اور اپنے ہموطنوں کو مادر وطن کی خاطر قربانی کرنے اور مصیبتیں جھیلنے کا پیغام دے رہا ہے۔ اور یہ پیغام لاکھوں کروڑوں دلوں پر اثر کر رہا ہے......"

اس کے بعد انھوں نے سوئن برن کے ایک مصرعہ پر اپنے مقدمے کو ختم کیا ہے۔

"کیا ہم میں شاہانہ آن بان کے لوگ نہیں،
جو دنیا کی چیزوں پر اپنا سکہ بٹھا دیتے ہیں"

یعنی وہ اس چیز پر زور دینا چاہتے ہیں کہ وہ دلی یا مہاتما کی حیثیت سے نہیں بلکہ انسان کی حیثیت سے گاندھی جی کے قائل ہیں۔ وہ خود بہت قوی اور محکم

ارادہ رکھتے تھے اس لئے گاندھی جی کے عزم و استقلال کی بھی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس دُبلے پتلے کمزور شخص میں فولاد کی سی قوت اور پہاڑ کا ثبات موجود ہے اور وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہیں جھکتا۔ اگرچہ گاندھی جی شکل سے کم رو معلوم ہوتے ہیں اور ان کا لباس ایک لنگوٹی سے زیادہ نہیں لیکن ان میں ایک شاہانہ رعب و جلال موجود ہے جس کی وجہ سے لوگ خود بخود اُن کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر عجز و انکسار کرتے ہیں لیکن وہ زبردست قوت و اقتدار کے مالک ہیں اور انھیں خود اس کا احساس ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایسے تحکم کے انداز سے حکم دیتے ہیں کہ جو ان کی زبان سے نکلے سب کو ان کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ ان کی پُرسکون اور گہری نظریں لوگوں کو مسحور کر لیتی ہیں اور چپکے چپکے ان کے نفس کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہیں۔ ان کی صاف اور واضح آواز سننے والوں کے دل میں سما جاتی ہے اور اس کے جذبات پر اثر ڈالتی ہے۔ چاہے ان کا مخاطب ایک فرد ہو یا ہزاروں افراد، ان کا جادو سب پر برابر چلتا ہے اور ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا وجود ان کی ہستی میں فنا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جذبے کو عقل سے بہت کم تعلق ہے۔ گو وہ اس چیز کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ اپنی بات عقلی طور پر لوگوں سے منوالیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل اور دلیل کو ان کے یہاں ثانوی حیثیت حاصل ہے انھوں نے "تسخیر" کا یہ عمل خطابت کے جادو یا دلکش لفظوں کے افسوں کے ذریعے سے نہیں کیا ہے۔ ان کی زبان تو بالکل سیدھی سادی ہوتی ہے اور شاید وہ ایک لفظ بھی بے محل اور بے ضرورت استعمال نہیں کرتے۔ اصل میں ان کے انتہائی خلوص اور ان کی زبردست شخصیت نے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا اور لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کے اندر قوتوں کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ شاید اس کی یہ بھی وجہ ہو کہ ان کے متعلق کچھ ایسی روایات قائم ہو گئی ہیں جنھوں نے

ایک موثر فضا پیدا کردی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک اجنبی شخص پر جو ان روایات سے واقف نہ ہو اور اس فضا سے ہم آہنگ نہ ہو، اس عمل تسخیر کا اتنا اثر نہ ہو۔ پھر بھی گاندھی جی کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اپنے مخالف کو اپنی طرف کر لیتے ہیں یا کم سے کم اس کے جوش مخالفت کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔

گاندھی جی حسن فطرت کے شیدا ہیں لیکن انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کے حسن اور کاریگری کی انھیں بہت کم حس ہے مثلاً تاج محل کو مزدوروں کی بیگار کی یادگار سمجھتے ہیں۔ ان کی قوت شامہ بھی بہت کمزور ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی ضرورت کے مطابق فن زندگی کے اصول معلوم کر لئے اور بحیثیت مجموعی اپنی زندگی میں ایک خاص حسن پیدا کر لیا ان کی ہر ادا میں ایک معنویت اور لطافت ہے۔ ایک نغمہ بھی خارج از آہنگ نہیں۔ ان میں وہ ناہمواری اور ناتراشی، وہ سوقیانہ پن اور عامیانہ پن نام کو بھی نہیں جو بد قسمتی سے ہمارے اوسط طبقے میں بہت عام ہے۔ انھیں اطمینان قلب کی دولت حاصل ہے۔ وہ اسے دوسروں کو بانٹتے ہوئے زندگی کے دشوار گذار راستوں پر ہمت اور مضبوطی سے قدم رکھتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

میرے والد ان سے کس قدر مختلف تھے! لیکن وہ زبردست شخصیت کے مالک تھے اور ان میں بھی ایک حد تک وہی شاہانہ انداز موجود تھا۔ انھوں نے سون برن کا جو شعر گاندھی جی کے متعلق لکھا ہے وہ خود ان پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ جس مجلس میں بھی بیٹھ جاتے سب سے سربلند اور ممتاز نظر آتے۔ جس محفل میں موجود ہوتے، بقول ایک مشہور انگریز جج کے، اس کے صدر ہی معلوم ہوتے۔ ان میں نہ عاجزی تھی نہ نرمی اور گاندھی جی کے برعکس وہ اپنے مخالفوں سے بدلہ لئے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر تحکم سے کام لیتے تھے، اس لئے لوگ ان سے یا انتہائی عقیدت رکھتے تھے یا زبردست مخالفت۔ ان کے ساتھ غیر جانب داری

کا احساس رکھنا ناممکن تھا۔ ہر شخص مجبور تھا کہ ان سے محبت کرے یا نفرت، ان کی فراخ پیشانی، بھچے ہوئے ہونٹ، پُرعزم ٹھوڑی، غرض مجموعی شکل شاہان روم کے ان مجسموں سے بہت ملتی جلتی تھی جو اٹلی کے عجائب خانے میں محفوظ ہیں۔ میرے بہت سے اطالوی دوستوں نے ان کی تصویر دیکھ کر اس مشابہت کی تصدیق کی۔ آخر عمر میں جب ان کے بال ریشم کی طرح سفید ہو گئے تھے (میری طرح ان کے بال گرے نہیں بلکہ آخر تک رہے) تو ان میں ایک عجیب شوکت اور وقار پیدا ہو گیا تھا جو افسوس ہے آج کل کے لوگوں میں ڈھونڈھے نہیں ملتا۔ ممکن ہے میں اپنی محبت کی بنا پر اس معاملے میں کچھ غلو کر رہا ہوں لیکن آج اس دنیا میں جو چھچھورے پن اور کمزوریوں سے بھری ہے مجھے ان کی شاندار شخصیت کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے میں چاروں طرف اس زبردست عزم و ثبات کو تلاش کرتا ہوں جس کے وہ مالک تھے، لیکن آج وہ کہیں نظر نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۲۳ء میں جب گاندھی جی اور سوراج پارٹی میں خوب چل رہی تھی میں نے انھیں والد کی ایک تصویر دکھائی تھی۔ اس تصویر میں والد کے موچھیں نہیں تھیں۔ اس سے پہلے گاندھی جی نے ہمیشہ والد کے چہرے پر بڑی خوشنما موچھیں دیکھی تھیں۔ وہ اس تصویر کو دیکھ کر چونک پڑے اور دیر تک غور کرتے رہے۔ کیونکہ مونچھوں کے نہ ہونے سے دہانے اور ٹھوڑی کی درشتی نمایاں ہو گئی تھی۔ انھوں نے ذرا خشک مسکراہٹ کے ساتھ کہا اب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے کیسے شخص کا مقابلہ کرنا ہے۔ لیکن والد کی آنکھوں سے اور ان شکنوں سے جو اکثر ہنستے رہنے سے ان کے چہرے پر پڑ گئی تھیں۔ ان کی صورت میں ایک خاص نرمی پیدا ہو گئی تھی البتہ کبھی کبھی یہ آنکھیں غصّے سے چمک بھی اٹھتی تھیں۔

والد کے لئے اسمبلی کا کام ایسا تھا جیسے بطخ تالاب میں تیرتی ہے اپنی

قانونی اور دستوری تربیت کی وجہ سے ان کی طبیعت کو اس سے خاص مناسب تھی۔ وہ ستیاگرہ اور اس کی باریکیوں سے اتنے واقف نہ تھے جتنے اس کام ک نشیب و فراز سے۔ انھوں نے اپنی پارٹی میں سختی سے انضباط قائم رکھا اور دوسر افراد اور جماعتوں کی حمایت بھی حاصل کرلی لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرنے پایا خود ان کے آدمی انھیں پریشان کرنے لگے۔ سوراج پارٹی کو اپنے ابتدائی زما میں کانگریس کے اندر ان لوگوں سے مقابلہ کرنا تھا جو ترک موالات کے پرانے پر میں تبدیلی کے مخالف تھے۔ اس لئے اس میں بہت سے نااہل لوگ بھی ش کر لئے گئے تاکہ کانگریس میں پارٹی کی قوت بڑھ جائے۔ اس کے بعد انتخابات کا آیا۔ اس کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی اور روپیہ امیروں سے مل سکتا تھا۔ اس ان کی دلجوئی ضروری تھی بلکہ ان میں سے بعض سوراجی امیدوار بنا کر کھڑے گئے۔ سیاسیات کے متعلق امریکہ کے ایک اشتراکی کی رائے سر اسٹیفورڈ کرپس ن ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "سیاست وہ نازک فن ہے جس میں غریبوں سے و اور امیروں سے اپنے کام کے لئے روپیہ لیا جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ ہم تمہیں دوسرے سے بچائیں گے۔"

ان تمام عناصر نے شروع ہی سے پارٹی کو کمزور کردیا تھا جب اسمبلی اور کو میں کام شروع ہوا تو اعتدال پسند جماعتوں سے سمجھوتے کرنے پڑے اور وہ کی شان زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہی۔ رفتہ رفتہ پارٹی کی شعلہ مزاجی ک لگی اور انضباط بگڑنے لگا۔ کمزور طبیعت کے لوگ اور ابن الوقت موقع پاکر اسے کرنے لگے۔ سوراج پارٹی نے کونسلوں پر اس دعوے کے ساتھ حملہ کیا تھا ک کی صفوں میں گھس کر لڑیں گے لیکن حریف بھی اس کھیل میں استاد تھ حکومت نے طے کیا کہ وہ سوراجیوں کی صفوں میں پھوٹ ڈال کر اپنا کام بنا۔

ہمارے کمزور طبیعت والے بھائیوں کے سامنے اعلیٰ عہدے پیش کئے گئے اور طرح طرح کی لالچیں دی گئیں۔ ان کا انھیں قبول کرنا تھا کہ ان کی قابلیت ان کے تدبر اور ان کی معقول پسندی کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے گئے۔ ان کے چاروں طرف ایسی خوشگوار اور موزوں فضا پیدا کردی گئی جو کھیتوں اور بازاروں کے شور وشغب اور گرد وغبار سے قطعی مختلف تھی۔ پھر وہ اس سے نکل کے کہاں جاسکتے تھے۔

غرض سوراجیوں کی عام اخلاقی حالت گرنے لگی۔ ایک ایک کرکے دوسری طرف کھسکنے لگے میرے والد بہت چیخے چلائے اور انھوں نے دھمکی دی کہ "بیمار عضو" کو کاٹ کر پھینک دیں گے لیکن اس دھمکی کا کیا اثر ہوسکتا تھا جبکہ وہ عضو خود ہی جُدا ہونے کو تیار تھا۔ بعض سوراجی وزیر بن گئے بعض مختلف صوبوں میں گورنر کی اگزیکیٹو کونسل کے رکن ہو گئے۔ کچھ نے ایک علیحدہ جماعت "حامیان جوابی تعاون" کے نام سے قائم کرلی۔ یہ اصطلاح لوکمانیہ تلک نے بالکل مختلف معنوں میں استعمال کی تھی۔ اب تو اس کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ جب کوئی عہدہ ملے اسے قبول کرلو اور اس سے پورا فائدہ اٹھاؤ۔ ان خرابیوں کے باوجود سوراج پارٹی کا کام چلتا رہا لیکن والد اور مسٹر داس ان باتوں سے بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے اس کے علاوہ وہ کونسلوں کے بے نتیجہ کام سے بھی اُکتا گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ شمالی ہند میں ہندو مسلمانوں میں کشیدگی پیدا ہوگئی جو برابر بڑھتی جاتی تھی اور کبھی کبھی فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔

بعض کانگریسی جو ہمارے ساتھ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں جیل گئے تھے اب وزیر تھے یا اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مامور تھے ۱۹۲۱ء میں تو ہمیں اس پر فخر تھا کہ اس حکومت نے ہمیں مجرم قرار دیا تھا اور جیل بھیجا تھا جس کے رکن بعض لبرل تھے (یہ بھی کسی زمانے میں کانگریسی تھے) لیکن اب ہم جانتے تھے کہ بعض صوبوں

میں ہمیں خود اپنے رفیقوں کے ہاتھوں مجرم بننے اور جیل بھیجے جانے کا فخر حاصل ہوگا۔ یہ نئے وزیر اور اگزیکیٹو کونسل کے رکن لبرلوں کے مقابلے میں اس کام کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ وہ ہم سے اور ہماری کمزوریوں سے واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہم سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ وہ ہمارے کام کے طریقوں سے بھی اچھی طرح آشنا تھے اور انھیں عوام کے جذبات اور مجمع کی ذہنیت کا بھی تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ نازیوں کی طرح انھوں نے بھی برسرِ حکومت ہونے سے پہلے انقلابی کھیل کھیلے تھے۔ اس لئے وہ اپنی ان معلومات سے فائدہ اٹھا کر اپنے کانگریس کے ساتھیوں کو بہت اچھی طرح کچل سکتے تھے، جو سرکاری عہدے دار اور لبرل وزرا اپنی لاعلمی کی وجہ سے نہیں کرسکتے تھے۔

۱۹۲۴ء میں کانگرس کا اجلاس بلگام میں ہوا اور گاندھی جی اس کے صدر ہوئے۔ ان کے لئے صدر ہونا گویا تنزل تھا کیونکہ وہ تو عرصے سے کانگرس کے مستقل مہا صدر تھے۔ مجھے ان کا خطبۂ صدارت پسند نہیں آیا۔ مجھے تو یہ محسوس ہوا جیسے اس میں بالکل جان ہی نہیں تھی۔ اجلاس کے اختتام پر میں گاندھی جی کے ایما سے دوبارہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سکریٹری منتخب ہوا۔ اپنی مرضی کے خلاف میں رفتہ رفتہ کانگریس کا نیم مستقل سکریٹری بن گیا تھا۔

۱۹۲۵ء کی گرمیوں میں والد کی طبیعت ناساز ہوگئی اور انھیں دمے کا سخت دورہ پڑا۔ اس لئے وہ گھر کے سب لوگوں کو ساتھ لے کر ڈلہوزی چلے گئے۔ میں بھی چند روز بعد کچھ عرصے کے لئے ان کے پاس چلا گیا۔ ڈلہوزی سے ہم چمبا کو روانہ ہوئے جو ہمالیہ کے وسط میں واقع ہے جون کی کسی تاریخ کو ہم وہاں پہنچ گئے۔ پہاڑی راستوں پر سفر کرنے کی وجہ سے ہم بہت تھک گئے تھے۔ ابھی ہماری تکان دور بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ہمیں ایک تار ملا جس میں چترنجن داس کی موت کی خبر درج تھی۔

بڑی دیر تک وہ سکوت کے عالم میں بیٹھے رہے۔ ان کی زبان سے ایک حرف بھی نہیں نکلا۔ البتہ غم کے بوجھ سے ان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ان کے لئے یہ بڑا جانکاہ صدمہ تھا۔ میں نے شاید کبھی ان کو اتنا متاثر نہیں دیکھا تھا۔ داس ہی ایک ایسے شخص تھے جو اُن کے قریب ترین اور محبوب ترین رفیق بن گئے تھے۔ آج وہی یکایک ان سے جُدا ہو گئے اور انھیں سوراج پارٹی کا سارا بوجھ سنبھالنے کو تنہا چھوڑ گئے۔ یہ بوجھ برابر بڑھ رہا تھا اور وہ اور دیش بندھو دونوں اس لایعنی کام سے اور اپنے لوگوں کی کمزوریوں سے گھبرا اُٹھے تھے۔ دیش بندھو کی آخری تقریر سے جو انھوں نے فرید پور کانفرنس میں کی تھی، ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ تھک سے گئے ہوں۔

دوسرے ہی دن صبح ہم چمبا سے روانہ ہو گئے اور پہاڑوں کو پار کر کے ڈلہوزی پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے بہت دور تھا چنانچہ موٹر سے وہاں پہنچے اور پھر الہ آباد ہوتے ہوئے کلکتے روانہ ہو گئے۔

(۱۹)

فرقہ پرستی کا زور

جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں ۲۳ء کے موسم خزاں میں نابھے کے جیل سے واپس آکر میں بیمار پڑ گیا۔ یہ علالت جس میں میعادی بخار کے جراثیم سے سابقہ تھا میرے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اب تک نہ میں کبھی سخت بیمار پڑا تھا اور نہ معمولی بخار یا نقاہت کی وجہ سے بستر پر پڑے رہنے کا عادی تھا۔ مجھے اپنی صحت پر تھوڑا سا گھمنڈ تھا اور میں اعتراض کیا کرتا تھا کہ ہندوستان میں لوگ ہمیشہ بیمار بنے رہتے ہیں۔ اپنی جوانی اور مضبوط قویٰ کی بدولت میں بچ تو گیا لیکن بحران کے گذر جانے کے بعد اس قدر کمزور ہو گیا کہ ایک عرصے تک بستر سے نہیں اٹھ سکا اور کامل صحت پانے میں بہت دن لگ گئے۔ اس زمانے میں، میں اپنے ماحول اور روزمرہ کے کام سے ایک عجیب قسم کی اجنبیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے کوئی دور سے تماشہ دیکھ رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں جزئیات کے چکر سے نکل کر کل کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ میرا دماغ بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ پرسکون اور خیالات زیادہ واضح تھے۔ میرا خیال ہے کہ جو لوگ کبھی سخت بیمار پڑے ہیں انہیں بھی اسی قسم کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا لیکن میرے لئے تو یہ ایک روحانی تجربے کی نوعیت رکھتا تھا (یہاں محدود مذہبی معنی میں روحانی استعمال نہیں ہوا ہے) کیونکہ اس کا مجھ پر بہت گہرا اثر پڑا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میں سیاست کی جذباتی فضا سے بہت بلند ہو گیا ہوں اور ان چیزوں کو جو اب تک میرے عمل کی محرک تھیں زیادہ وضاحت سے دیکھ رہا ہوں مگر اس بصیرت کے بعد پھر

دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوئے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا بہر حال میں زندگی اور سیاست کے مذہبی پہلو سے روز بروز دور ہوتا چلا گیا۔ میں اپنے اس تجربے کا ذکر زیادہ تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ اس واردات کو بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ اس بات کو اب گیارہ برس ہو چکے ہیں اور ذہن میں اس کے دھندلے سے نشان باقی رہ گئے ہیں پھر بھی اتنا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا مجھ پر اور میرے خیالات پر بہت گہرا اثر پڑا تھا اور آئندہ دو تین سال تک میں اپنا کام اسی بے تعلقی کے انداز سے انجام دیتا رہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ایک وجہ وہ تغیرات تھے جو سراسر میرے اختیار سے باہر تھے، اور جن سے میری طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں تھی میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ملک کی سیاسی حالت بہت کچھ بدل گئی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ خاص طور پر شمالی ہند میں ہندو مسلم تعلقات رفتہ رفتہ بہت کشیدہ ہو گئے تھے۔ بڑے شہروں میں بہت سے فساد بھی ہوئے جن میں انتہائی بیدردی اور درندگی کا ثبوت دیا گیا۔ بے اعتمادی اور غصے نے جھگڑے کے ایسے ایسے نئے سبب کھڑے کر دئے جو ہم نے پہلے کبھی سُنے بھی نہ تھے۔ پہلے تو نزاع کی خاص وجہ بقر عید کے موقع پر گائے کی قربانی تھی یا اگر کبھی دونوں کے تہوار مثلاً محرم اور رام لیلا ایک ساتھ پڑ جاتے تھے تب بھی اکثر فساد ہو جاتا تھا۔ محرم ایک دردناک سانحے کی یادگار ہے جو نوحہ و ماتم کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ اور رام لیلا ناحق پر حق کی فتح کی یادگار ہے جس کا جشن منایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں نبھ سکتیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ان کا ساتھ کہیں تیس سال میں ایک بار ہوتا ہے کیونکہ رام لیلا تو شمسی سال کے مطابق ایک مقررہ وقت پر ہوتی ہے اور محرم کا زمانہ قمری سال کے لحاظ سے ہر سال بدلتا رہتا ہے یہاں تک کہ تیس سال بعد دونوں

مل جاتے ہیں۔

لیکن اب جھگڑے کی ایک نئی صورت پیدا ہوگئی اور یہ ایسی تھی کہ آئے دن پیش آتی تھی۔ یہ مسجد کے سامنے باجا بجانے کا سوال تھا مسلمانوں کو نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجانے اور شور کرنے پر اعتراض تھا کیونکہ اس سے ان کی عبادت میں خلل پڑتا ہے۔ ہر شہر میں بیشمار مسجدیں ہیں اور ہر مسجد میں روزانہ پانچ وقت نماز ہوتی ہے۔ شور و شغب اور جلوس کی بھی کمی نہیں ہے (جس میں برات اور جنازے بھی شامل ہیں) اس لئے جھگڑے کا ہر وقت موقع تھا۔ خاص طور پر مغرب کی نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجانے یا شور کرنے پر زیادہ اعتراض ہوتا تھا اتفاق سے اسی وقت مندروں میں بھی "سندھیا" ہوتی ہے اور سنکھ اور گھڑیال بجتے ہیں۔ اسے آرتی کہتے ہیں۔ غرض آرتی نماز کے جھگڑوں کی کثرت ہوگئی۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک مسئلہ جو ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ کرکے ذرا سے تدبر سے طے ہو سکتا ہو آپس کی رنجش اور فساد کا باعث بن جائے لیکن مذہبی جذبات کو عقل، لحاظ یا تدبیر و تدبر سے کوئی تعلق نہیں ہے خصوصاً جب کوئی تیسرا فریق ایک کو دوسرے سے لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہو تو اس کا بھڑک اٹھنا معمولی بات ہے۔

شمالی ہند کے چند شہروں کے ان فسادوں کو لوگ خواہ مخواہ حد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حالانکہ اکثر شہروں اور قصبوں میں اور قریب قریب تمام دیہاتوں میں بالکل امن و سکون تھا اور ان واقعات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا لیکن اخبار ہر چھوٹے چھوٹے فرقہ وارانہ جھگڑے کو بہت بڑھا چڑھا کر لکھتے تھے۔ بہر حال یہ بالکل صحیح ہے کہ شہر والوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور رنجش بڑھ گئی تھی۔ دراصل فرقہ پرست لیڈر اس آگ کو بھڑکا رہے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ سیاسی مطالبے

زیادہ سخت ہوتے جاتے تھے۔ اس فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے وہ سیاسی رجعت پسند مسلمان جو ترک موالات کے زمانے میں منہ چھپا کر بیٹھ رہے تھے پھر میدان میں نکل آئے، اور حکومت نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ اب تو وہ آئے دن نئے نئے اور بھاری بھاری مطالبے پیش کرنے لگے جن سے قومی اتحاد اور ملکی آزادی کی جڑ کٹتی تھی۔ ہندوؤں میں بھی خاص خاص فرقہ پرست لیڈر سیاسی اعتبار سے رجعت پسند تھے اور کہنے کو تو وہ ہندو مفاد کی حفاظت کے علمبردار بنے لیکن اصل میں حکومت کے اشاروں پر چلتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے مختلف صورتوں سے بہت کوشش کی، لیکن جن مطالبات پر وہ زور دیتے تھے انھیں حاصل کرنے میں نہ وہ کامیاب ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے۔ البتہ انھوں نے ملک میں فرقہ پرستی کا بیج بو دیا۔

کانگرس عجیب کش مکش میں تھی۔ چونکہ وہ قومی احساسات کی نمائندگی کرتی تھی اور ان سے اثر پذیر ہوتی تھی اس لئے ان فرقہ وارانہ جذبات کا بھی اثر اس پر پڑا۔ بہت سے کانگرسی قوم پرستی کے پردے میں فرقہ پرست بن گئے لیکن کانگرس کے رہنما اپنے اصولوں پر قائم رہے اور بحیثیت مجموعی انھوں نے کسی فرقے یا فرقہ وارانہ جماعت کا ساتھ نہیں دیا۔ اب تو سکھ اور دوسری چھوٹی اقلیتیں بھی کھلم کھلا اپنے جداگانہ مطالبات پیش کرنے لگی تھیں۔ غرض ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگرس پر دونوں طرف سے لعن طعن ہونے لگی۔

بہت دن ہوئے یعنی ترک موالات کے شروع میں یا اس سے بھی پہلے گاندھی جی نے فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک حل تجویز کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسئلہ صرف اکثریت کی نیک نیتی اور فراخ دلی سے طے ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کا ہر مطالبہ ماننے کو تیار تھے۔ وہ ان کا دل ہاتھ میں لینا چاہتے تھے۔ ان سے سودا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دوراندیشی اور قدر و قیمت کے صحیح اندازے کی بدولت وہ حقیقت

ی نہ کو پہنچ گئے لیکن دوسرے لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں بازار کا بھاؤ خوب معلوم ہے حالانکہ ہ کسی چیز کی صحیح قدر و قیمت کو نہیں پہچانتے تھے مول تول کرنے میں لگے رہے۔ نہایت فسوس ہے کہ انھیں مہنگے دام تو نظر آئے مگر یہ نہ سوچا کہ مال کیسا ہے۔

دوسروں پر نکتہ چینی کرنا اور انھیں الزام دینا آسان ہے اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کرنا بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مگر اس ناکامی کا بار کسی کی اصولی غلطیوں یا عمل کی لغزشوں پر ڈالنے کے بجائے کیا یہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ دوسروں نے جان بوجھ کر ہمارے راستے میں روڑے اٹکائے؟ ہم حکومت اور فرقہ پرستوں کو الزام دیتے ہیں اور وہ کانگرس کو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت اور اس کے حلیف برابر ہمارے راستے میں جان بوجھ کر روڑے اٹکاتے رہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ماضی میں بھی اور اب بھی برطانوی حکومت کی یہی حکمت عملی رہی ہے کہ ہم کو آپس میں لڑائے۔ محکوموں میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کے اصول پر تمام سلطنتیں عمل کرتی ہیں اور جس حد تک وہ اپنی اس ترکیب میں کامیاب ہوتی ہیں اسی حد تک ان کا تسلط محکوموں پر ہوتا ہے ہمیں اس کی شکایت کرنے کا حق نہیں ہے یا کم سے کم اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس چیز کو نظر انداز کرنا یا اس کی کوئی تدبیر نہ کرنا خود اپنی جگہ پر ایک زبردست غلطی ہے۔

ہم اس کی کیا تدبیر کریں؟ سودا چکانے، بھاؤ ٹھیرانے اور بازار کا سا مول تول کرنے سے تو کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ ہم کتنی ہی بھاری قیمت لگائیں کتنی ہی بڑھ کر بولی بولیں، ایک تیسرا فریق موجود ہے جو ہم سے زیادہ دام لگا سکتا ہے اور یہی نہیں بلکہ نقد ادا کر سکتا ہے۔ غرض جب تک ہم میں ایک مشترک قومی اور اجتماعی نقطۂ نظر نہ پیدا ہو جائے ہم متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم موجودہ سیاسی اور اقتصادی

نظام کے چکر میں پڑے رہیں گے اور اسی پہ قناعت کریں گے کہ کچھ جزوی اصلاحات ہو جائیں اور حکومت میں ہندوستانیوں کا عنصر بڑھ جائے تو اتحادِ عمل کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ پھر تو دونوں فریقوں کا مقصد یہی ہوگا کہ مالِ غنیمت میں سے ہمیں بھی کچھ حصّہ مل جائے اور تیسرا فریق جس کے ہاتھ میں قوت ہے خود بخود سرپنچ بن کر بیٹھ جائے گا اور چن چن کر اپنے چہیتوں کو اچھی اچھی چیزیں بانٹے گا۔ ہم اتحادِ عمل کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پہ اسی وقت قائم کر سکتے ہیں جب ہم ملک کے سیاسی نظام اور سماجی نظام کو بالکل بدل ڈالیں۔ اس لئے مکمل آزادی کے مطالبے کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے، ہم جس چیز کی خاطر لڑ رہے ہیں وہ ایک بالکل نیا سیاسی نظام ہے، نہ کہ "درجہ نوآبادیات" جس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ موجودہ نظام بدستور قائم رہے۔ حکومت بظاہر ہندوستانیوں کی ہو اور پس پردہ برطانیہ کا ہاتھ کام کرتا رہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارا مطالبہ آزادی صرف سیاسی آزادی تک محدود تھا اور اس میں سماجی تغیرات اور عام لوگوں کی معاشی آزادی کا ذکر نہیں تھا مگر اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا، کہ وہ زنجیریں توڑ دی جائیں جن میں لندن کے تاجروں نے ہمیں جکڑ رکھا ہے اور ہمیں یقین تھا کہ اس سے سماجی نظام کے بدلنے میں سہولت ہوگی۔ اس وقت میرے یہی خیالات تھے۔ اب میں اس میں اتنا اور اضافہ کرتا ہوں کہ حقیقی سیاسی آزادی عموماً تنہا نہیں آتی، بلکہ اپنے ساتھ بہت کچھ سماجی آزادی بھی لاتی ہے۔

لیکن قریب قریب ہمارے تمام لیڈروں کی نظر موجودہ سیاسی سماجی نظام کے تنگ دائرے تک محدود تھی۔ وہ ہر مسئلے پہ چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا آئینی اسی نقطہ نظر سے غور کرتے تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ برطانوی حکومت کے ڈھب پر آجاتے تھے اس لئے کہ موجودہ نظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے سوا وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ حقیقت میں وہ انقلاب پسند نہیں بلکہ اصلاح پسند تھے

گو کبھی کبھی عملی جدوجہد بھی کرتے رہتے تھے لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا کہ ہندوستان کا کوئی سیاسی، اقتصادی یا فرقہ وارانہ مسئلہ اصلاحی طریقوں سے پوری طرح حل ہو سکے اب تو انقلابی خیالات اور انقلابی طریقِ عمل کی ضرورت تھی۔ مگر ہمارے لیڈروں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس ضرورت کو پورا کر سکے۔

ہماری جنگ آزادی کا مقصد واضح نہ ہونے سے فرقہ پرستی کو بہت تقویت پہنچی عام لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کی جنگ کو ہماری روزمرہ کی مصیبتوں سے کیا تعلق ہے۔ کبھی کبھی وہ ایک نامعلوم جذبے کے ماتحت خوب لڑتے تھے لیکن یہ تو بڑا اکھڑ ہتھیار ہے جو آسانی سے کند بھی کیا جا سکتا ہے اور غلط مقاصد کے لئے بھی کام آ سکتا ہے۔ ان کے جوش میں عقل کو دخل نہیں تھا اس لئے ردعمل کے زمانے میں فرقہ پرست بھی اسے آسانی سے بھڑکا سکتے تھے اور مذہب کا نام لیکر اس سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہندو مسلمان دونوں کے اونچے اوسط طبقے کے لوگوں نے کس طرح مذہب کو بیچ میں لا کر ان مطالبات کے لئے عام لوگوں کی تائید اور مدد حاصل کر لی جنھیں عام طبقہ تو درکنار نیچے اوسط طبقے سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ اگر تمام فرقہ وارانہ مطالبوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سارا جھگڑا عہدوں اور ملازمتوں کا ہے اور یہ عہدے اونچے اوسط طبقے کے لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کونسلوں میں نشستیں مخصوص کرنے اور ان میں اضافہ کرنے کا بھی مطالبہ تھا کیونکہ انھیں پر سیاسی اقتدار منحصر سمجھا جاتا ہے مگر انھیں بھی یاران طریقت نے اپنے ذاتی اثر کے بڑھانے کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے سیاسی مطالبات جن سے زیادہ سے زیادہ اونچے اوسط طبقے کے مٹھی بھر لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور قومی اتحاد و ترقی کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، بڑی ہوشیاری سے اس طرح پیش کیے گئے گویا یہ پورے فرقے

کے مطالبات ہوں اور ان کی بے وقعتی کو چھپانے کے لئے ان پر مذہب کا ملمع کر دیا گیا۔

غرض اس طرح سیاسی رجعت پسند، فرقہ وارانہ لیڈروں کے بھیس میں سیاسی میدان میں نکل آئے۔ ان کے طرز عمل سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا محرک فرقہ وارانہ تعصب نہیں ہے بلکہ اصل میں وہ سیاسی پیش قدمی کے راستے میں روڑے اٹکانا چاہتے ہیں۔ ہمیں سیاسی معاملات میں ان سے مخالفت کی توقع تو تھی ہی لیکن یہ دیکھ کر اور بھی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کیسی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں۔ مسلم فرقہ پرست لیڈر عجیب عجیب باتیں کہتے تھے اور انھیں نہ تو قوم پرستی کی پرواہ تھی اور نہ ہندوستان کی آزادی کی۔ رہے ہندو فرقہ پرست لیڈر تو یہ زبان سے قوم پرستی کا دعویٰ ضرور کرتے تھے لیکن عمل بالکل اس کے خلاف تھا اور چونکہ وہ کوئی معقول عملی کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اس لئے حکومت کے سامنے اپنے کو طرح طرح سے ذلیل کرتے تھے حالانکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن اشتراکی اور اسی قسم کی "تخریبی" تحریکوں کی مذمت کرنے میں دونوں متفق تھے اور جس چیز سے اونچے طبقے کے مستقل حقوق کو نقصان پہنچتا ہو، اس کی مخالفت میں دونوں حیرت انگیز طریقے سے ایک ہو جاتے تھے۔ مسلم فرقہ پرست لیڈر اگرچہ بہت سی ایسی باتیں کہتے اور کرتے تھے جو سیاسی اور اقتصادی آزادی کے منافی تھیں لیکن انفرادی طور پر بھی اور جماعتی حیثیت سے بھی حکومت اور پبلک کے سامنے وہ اپنے آپ کو لئے دیئے رہتے تھے۔ مگر ہندو فرقہ پرست لیڈروں میں اتنی خودداری بھی نہ تھی۔

کانگریس میں بہت سے مسلمان شریک تھے۔ ان کی تعداد کافی تھی اور ان میں بہت سے قابل آدمی بھی تھے بلکہ یوں کہیے کہ ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور اور ہر دلعزیز مسلمان لیڈر کانگریس کے ساتھ تھے۔ ان کانگریسی مسلمانوں نے اپنی ایک جماعت "قوم پرست مسلم پارٹی" کے نام سے ترتیب دی اور فرقہ پرست

مسلمان لیڈروں کا مقابلہ کیا۔ شروع شروع میں تو انھیں کچھ کامیابی ہوئی اور تعلیمیافتہ مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ ان کے ساتھ ہو گیا۔ لیکن وہ سب اونچے اوسط طبقے کے لوگ تھے اور ان میں کوئی مؤثر شخصیت نہ تھی وہ اپنے پیشے اور کاروبار میں لگ گئے اور انھیں عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا بلکہ سچ پوچھئے تو کبھی تعلق پیدا ہی نہیں ہوا تھا وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مشورے اور معاہدے کرتے تھے مگر اس کام میں ان کے حریف یعنی فرقہ پرست لیڈرز زیادہ ماہر تھے۔ چنانچہ ان حریفوں نے قوم پرست مسلمانوں کو مورچہ بہ مورچہ پیچھے ہٹانا شروع کیا اور انھیں ایک ایک کر کے اپنے سارے اصول ترک کرنے پڑے۔ بار بار قوم پرست مسلمانوں نے مزید پسپائی سے بچنے کے لئے یہ کوشش کی کہ اپنے مطالبات کو کم کر کے ان پہ اڑ جائیں لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا کہ انھیں اور پیچھے ہٹنا پڑا اور اپنے مطالبات کو اور کم کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس کوئی چیز باقی نہ رہی جسے وہ اپنی کہہ سکتے۔ کوئی بنیادی اصول نہ رہا جس پہ وہ قدم جما کر کھڑے ہو سکتے، سوائے ایک اصول کے جو ان کی کشتی کا لنگر تھا۔ یعنی مخلوط انتخاب مگر اس کے بعد اور ایک نازک موقع آیا، جب انھیں اپنے مطالبات کم کرنے پڑے اور ان کا یہ لنگر بھی ٹوٹ گیا۔ چنانچہ آج وہ ہر اصول اور عمل کو جس پر انھوں نے اپنی جماعت کی بنیاد رکھی تھی جسے وہ بڑے زور شور سے لے کر اٹھے تھے، کھو چکے ہیں اور ان کے پاس نام کے سوا کچھ بھی باقی نہیں۔

انفرادی حیثیت سے قوم پرست مسلمان اب بھی کانگریس میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں لیکن جماعت کی حیثیت سے ان کی تباہی کی داستان بڑی دردناک ہے یہ تباہی برسوں میں تکمیل کو پہنچی۔ لیکن اس پہ آخری مہر اسی سال ۱۹۳۷ء میں ثبت ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اور اس کے بعد بھی کئی برس تک ان کی جماعت بہت

طاقتور رہی اور انھوں نے مسلم فرقہ پرستوں کے خلاف سخت جارحانہ رویہ اختیار کیا بارہا ایسا ہوا کہ گاندھی جی ان فرقہ پرستوں کے بعض مطالبات اپنی مرضی کے خلاف منظور کرنے کو تیار ہو گئے۔ لیکن ان کے رفقائے کار یعنی قوم پرست مسلم لیڈروں نے خود انھیں رد کیا اور بڑی سختی سے مخالفت کی۔

۱۹۲۴ء و ۱۹۲۵ء میں باہمی مشوروں اور مباحثوں کے ذریعے سے (جو اتحاد کانفرنس کہلاتے تھے) فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ ان میں سب سے مشہور وہ کانفرنس تھی جو مولانا محمد علی نے اپنے صدارت کے زمانے میں ۱۹۲۴ء میں کی۔ یہ کانفرنس دہلی میں گاندھی جی کے ۲۱ روز کے برت کے دوران میں منعقد ہوئی تھی۔ ان کانفرنسوں میں بہت سے نیک نیت اور پر خلوص لوگ شامل ہوئے اور انھوں نے سمجھوتا کرنے کی انتہائی کوشش کی چند اچھی اچھی قراردادیں بھی منظور ہوئیں لیکن اصل مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے وہ ان کانفرنسوں سے طے نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا طے ہونا کثرت رائے پر نہیں بلکہ اتفاق رائے پر منحصر تھا۔ ان کانفرنسوں میں انتہا پسندوں کی مختلف جماعتیں بھی موجود ہوتی تھیں جن کے نزدیک سمجھوتے کا مفہوم یہ تھا کہ باقی سب لوگ ان کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اس لیے اتفاق رائے کیسے ہو سکتا تھا۔ سچ پوچھیے تو ان جلسوں کو دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ بعض سربرآوردہ فرقہ پرست کوئی سمجھوتا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ان میں سے اکثر سیاسی رجعت پسند تھے اور ان میں اور لوگوں میں جو بنیادی طور پر سیاسی تغیرات کے خواہشمند تھے اتحاد خیال کی گنجائش ہی نہ تھی۔

لیکن مشکلات کی اصل بنیاد زیادہ گہری تھی اور ان کا الزام محض افراد پر نہیں رکھا جا سکتا۔ اب سکھ بھی اپنے فرقہ وارانہ مطالبوں کو بڑے زور شور سے پیش کرنے لگے تھے اور پنجاب میں ایک نہایت پیچیدہ مثلث بن گیا تھا اصل

میں پنجاب ہی فرقہ وارانہ نزاع کا مرکز تھا۔ وہاں ہر فرقہ دوسرے سے خائف تھا اس لئے خواہ مخواہ جوش و تعصب کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ بعض صوبوں میں کسانوں کا مسئلہ بھی فرقہ وارانہ رنگ میں نمودار ہوا خصوصاً بنگال میں جہاں زمیندار عموماً ہندو اور کاشتکار مسلمان ہیں۔ پنجاب اور سندھ میں دولتمند طبقہ اور مہاجن عموماً ہندو ہیں اور قرضدار زیادہ تر مسلم کاشتکار ہیں اس لئے قرض خواہ کے خلاف جو اپنا "آدھ سیر گوشت" لئے بغیر نہیں مانتا۔ غریب قرضداروں میں فطرتاً جو اشتعال ہوتا ہے اس نے فرقہ وارانہ طوفان کو اور بڑھا دیا۔ عام طور پر مسلمان غریب ہیں اس لئے مسلم فرقہ پرست لیڈروں نے اس عداوت سے جو غریبوں اور امیروں میں ہمیشہ رہا کرتی ہے، فرقہ وارانہ مقاصد حاصل کرنے کے لئے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ حالانکہ غریبوں کی بہبودی سے ان مقاصد کو کوئی واسطہ نہیں ہے، اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم فرقہ پرست رہنما کسی حد تک عوام کی نمائندگی کرتے تھے اور انھیں ایک قوت حاصل تھی۔ لیکن ہندو فرقہ پرست رہنما اقتصادی لحاظ سے دولتمند مہاجنوں اور پیشہ ور طبقوں کے نمائندے تھے۔ انھیں ہندو عوام کی کوئی مستقل تائید حاصل نہ تھی۔ گو کبھی کبھی وہ ان کی ہمدردی حاصل کر لیتے تھے۔

غرض فرقہ وارانہ مسئلہ معاشی جماعت بندی سے کچھ خلط ملط ہو گیا ہے اگرچہ بدقسمتی سے لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ ممکن ہے آگے چل کر یہ کھلم کھلا معاشی طبقوں کی جنگ کی شکل اختیار کرلے لیکن اگر وہ وقت آیا تو دیکھ لیجئے گا کہ آجکل کے تمام فرقہ پرست لیڈر جو مختلف فرقوں کے اعلیٰ طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں جھٹ پٹ اپنے اختلافات رفع کرلیں گے تاکہ اپنے مشترک دشمن یعنی غریبوں کے طبقے کا مقابلہ کر سکیں۔ موجودہ حالات میں بھی سیاسی سمجھوتا کرلینا زیادہ مشکل نہیں بشرطیکہ (اور یہ شرط بہت زبردست ہے) تیسرا فریق موجود نہ ہو۔

۱۹۲۴ء میں دہلی کی اتحاد کانفرنس کے ختم ہوتے ہی الہ آباد میں ایک ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جہاں تک جانیں ضائع ہونے کا تعلق ہے دوسرے فسادوں کے مقابلے میں یہ کوئی بہت بڑا بلوہ نہ تھا لیکن مجھے زیادہ صدمہ اس لئے ہوا کہ یہ خود میرے شہر میں واقع ہوا تھا چنانچہ میں چند اور حضرات کے ساتھ دہلی سے فوراً الہ آباد پہنچ گیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اصل فساد ختم ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے اثرات فرقہ وارانہ کشیدگی اور مقدمے بازی کی شکل میں عرصے تک باقی رہے۔

مجھے صحیح یاد نہیں کہ فساد کیسے شروع ہوا۔ اسی سال یا شاید اس کے کچھ عرصے بعد الہ آباد میں رام لیلا کے موقع پر پھر جھگڑا ہو گیا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مسجد کے سامنے باجا بجانے کی ممانعت ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ تقریب جس میں بڑے بڑے جلوس بھی نکلتے تھے اس وقت سے بالکل بند کر دی گئی۔ اس بات کو اب آٹھ سال کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن اب تک الہ آباد میں رام لیلا نہیں ہوئی ضلع کے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے لئے یہ سال کا سب سے بڑا جشن ہوتا تھا لیکن اب صرف اس کی حسرتناک یاد باقی رہ گئی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں بچپن میں اور بچوں کے ساتھ رام لیلا دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اس وقت ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور وہ سارا مجمع بھی بہت خوش و خرم نظر آتا تھا جو الہ آباد کے سارے ضلع بلکہ قرب و جوار کے دوسرے اضلاع سے آکر یہ تماشا دیکھنے کو اکٹھا ہو جاتا تھا۔ اگرچہ یہ ہندو تہوار تھا لیکن اس میں کسی کے لئے روک ٹوک نہ تھی اس لئے مسلمان بھی بکثرت شریک ہوتے تھے اور چاروں طرف مسرت و شادمانی اور چہل پہل نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ تجارت کو بھی فروغ ہوتا تھا۔ برسوں کے بعد جب میں جوانی میں وہاں پھر گیا تو مجھے کچھ زیادہ لطف نہیں آیا بلکہ اس جلوس اور سوانگ سے وحشت ہونے لگی۔ اب میرا فنون لطیفہ اور تفریح کا معیار بہت

بلند ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں نے دیکھا کہ یہ سارا مجمع اس تماشے سے کتنا لطف اٹھاتا ہے اور کیسا خوش ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ رنگ رلیوں کا زمانہ تھا بوڑھوں اور جوانوں کو چھوڑیئے۔ الہ آباد کے بچوں نے آٹھ نو برس سے یہ کھیل تماشے نہیں دیکھے ہیں اور ان کی روکھی پھیکی بے رس زندگیوں میں جوش مسرت کا جو ایک خوش گوار دن آجاتا تھا اس سے بھی وہ محروم ہو گئے ہیں۔ یہ سب نتیجہ ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے جھگڑنے کا! سچ پوچھئے تو مذہب اور مذہبی جوش اس کا ذمّہ دار ہے۔ افسوس یہ بھی کتنی مسرّت کُش چیز ہے!

(۴۰)

میونسپلٹی کا کام

دو سال تک میں الہ آباد میونسپلٹی کا کام کرتا رہا لیکن میری بد دلی برابر بڑھتی گئی میں تین سال کے لئے چیرمین منتخب ہوا تھا لیکن ابھی دوسرا سال شروع ہی ہوا تھا کہ میں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے یہ کام دل سے پسند تھا اور میں نے اس میں بہت وقت اور توجہ صرف کی تھی۔ بڑی حد تک مجھے کامیابی بھی ہوئی اور اپنے تمام رفقائے کار کی خوشنودی کا فخر بھی حاصل ہوا۔ صوبہ متحدہ کی حکومت نے سیاسی مخالفت کے باوجود میرے بعض بلدی مشاغل کو سراہا۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو جکڑا ہوا پاتا تھا اور یہ دیکھتا تھا کہ جب کوئی معقول کام کرنا چاہتا ہوں تو میری راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ جان بوجھ کر کسی نے بھی میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا نہیں کیں بلکہ مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں نے بڑی خوشی سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ ایک طرف تو حکومت کا ایک مقررہ نظام تھا اور دوسری طرف پبلک اور میونسپلٹی کے اراکین کی بے حسی۔ حکومت نے بلدی نظام کا جو آہنی ڈھانچا تیار کیا تھا اس میں بنیادی ترقی یا تنوع کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ مالی حیثیت سے میونسپلٹیاں ہمیشہ حکومت کی محتاج رہتی تھیں۔ مروجہ قوانین بلدیہ کے ماتحت اس کی اجازت ہی نہ تھی کہ محصول لگانے کی، یا سماجی ترقی کی کوئی غیر معمولی تجویز پیش کی جا سکے۔ جو تجویزیں قانوناً جائز بھی تھیں ان کے لئے بھی حکومت کی منظوری لازمی تھی۔ اور یہ بڑے صبر

اور بہت کا کام تھا کہ اس قسم کی کوئی تجویز پیش کر کے برسوں منظوری کا انتظار کرتے رہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ جب کبھی سماجی اصلاح یا قومی تعمیر کا کوئی معاملہ ہوتا تو حکومت کی مشین کس مشکل سے اور کتنے آہستہ آہستہ حرکت کرتی لیکن اگر کسی سیاسی مخالف کو کچلنے یا دبانے کا سوال ہوتا تو پھر اس میں کس بلا کی تیزی پیدا ہو جاتی۔ یہ بھی ایک عجیب غریب تضاد ہے۔

صوبے کی میونسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ ایک سرکاری محکمے کے ماتحت ہیں اور اس محکمے کا صدر ایک ہندوستانی وزیر ہوتا ہے لیکن عموماً یہ صدر محترم بلدی معاملات تو کیا تمام امور عامہ میں بالکل کورے ہوتے ہیں۔ اصل میں وہ کسی شمار قطار میں نہیں ہیں اور خود ان کا محکمہ جسے انڈین سول سروس کے مستقل عہدے دار چلاتے ہیں ان کی ذرا پرواہ نہیں کرتا۔ ہندوستان کے اعلیٰ افسروں کی طرح ان عہدیداروں کی بھی یہی ذہنیت ہے کہ حکومت کا اصل کام نظم و ضبط قائم رکھنا ہے اس میں کسی قدر مربیانہ شفقت کا رنگ بھی ہے لیکن اعلےٰ پیمانے پر سماجی خدمت کی ضرورت مطلق محسوس نہیں کی جاتی۔

میونسپلٹیاں ہمیشہ حکومت کی مقروض ہوتی ہیں اس لئے نظم و ضبط کے بعد اسے ان سے قرضہ وصول کرنے کی فکر رہتی ہے۔ وہ بس یہی دیکھتی ہے کہ قرض کی قسطیں باقاعدہ ادا ہوتی رہیں میونسپلٹی کی مالی حالت خراب ہونے پائے اس کے پاس تحویل میں کافی روپیہ موجود ہو۔ یہ سب باتیں نہایت ضروری اور برمحل ہیں۔ لیکن یہ چیز ہمیشہ نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ میونسپلٹی محض روپیہ قرض لینے اور باقاعدہ ادا کرنے کا ادارہ نہیں ہے بلکہ اسے تعلیم حفظان صحت وغیرہ کی خدمات بھی انجام دینی ہیں۔ ہندوستان کی میونسپلٹیاں یوں بھی بہت کم سماجی خدمت انجام دیتی ہیں اور جہاں مالی مشکلات پیش آئیں ان میں اور بھی کمی کر دی جاتی ہے اور عام طور پر

سب سے پہلے تعلیم پر ہاتھ صاف ہوتا ہے۔ حکمراں طبقوں کو ذاتی طور پر میونسپل مدارس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ ان کے بچے اعلیٰ درجہ کے گراں خرچ مدرسوں میں پڑھتے ہیں جنھیں عموماً حکومت سے معقول امداد ملتی ہے۔

ہندستان کے بڑے شہروں کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک تو شہر خاص جہاں بہت گنجان آبادی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ وسیع رقبہ جس میں بنگلے اور کوٹھیاں ہوتی ہیں اور ہر بنگلے سے ملحق بہت بڑا احاطہ یا باغ ہوتا ہے۔ اس علاقے کو انگریز سول لائن کہتے ہیں۔ اسی سول لائن میں انگریز افسر اور تاجر اونچے اوسط طبقے کے ہندوستانی، وکیل، ڈاکٹر، سرکاری عہدیدار وغیرہ رہتے ہیں میونسپلٹی کو سول لائن کے مقابلہ میں شہر خاص سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن خرچ سول لائن پر زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ سول لائن کے وسیع رقبہ میں زیادہ سڑکیں درکار ہیں۔ ان کی باقاعدہ مرمت، صفائی، چھڑکاؤ اور روشنی بھی ضروری ہے اور وہاں گندے پانی کے نکاس، آب رسانی اور حفظان صحت کا انتظام بھی زیادہ وسیع پیمانے پر کرنا پڑتا ہے۔ شہر کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جاتی بلکہ غریبوں کے محلوں کی طرف تو کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ شہر میں اچھی سڑکیں بہت کم ہوتی ہیں گلیوں میں روشنی کافی نہیں ہوتی اور وہاں نہ پانی کے نکاس کا انتظام ہوتا ہے نہ حفظان صحت کا۔ شہر والے ان تمام مصیبتوں کو بہت صبر اور خاموشی سے برداشت کرتے ہیں، اور شکایت کا حرف زبان پر نہیں لاتے۔ اگر کبھی شکایت کرتے ہیں تو سنتا کون ہے، کیونکہ وہ لوگ جو منہ میں زبان رکھتے ہیں اور جن کی شنوائی ہو سکتی ہے سب سول لائن میں رہتے ہیں۔

غرض کچھ تو اس بوجھ کے مساوی طور پر تقسیم کرنے اور کچھ مزید اصلاحیں کرنے کے خیال سے میں نے زمین کی مالیت پر محصول لگانا تجویز کیا لیکن جیسے ہی میں نے

یہ تجویز پیش کی فوراً ایک سرکاری افسر (غالباً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور لکھا کہ یہ تجویز فلاں فلاں قانون اور ضابطہ آراضی کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس محصول کی زد میں زیادہ تر وہ لوگ آتے جن کے بنگلے سول لائن میں تھے۔ لیکن حکومت تو چنگی جیسے بالواسطہ محصول کو پسند کرتی ہے جس سے تجارت برباد ہو جاتی ہے۔ مختلف چیزوں کی خصوصاً اشیائے خوردنی کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اور بیچارے غریبوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اکثر ہندوستانی میونسپلٹیوں کا دارومدار اسی خلاف معاشرت اور نقصان دہ محصول پر ہے۔ مگر شاید اب بڑے بڑے شہروں میں یہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔

غرض میونسپلٹی کے چیرمین کی حیثیت سے ایک طرف تو مجھے حکومت کی اس لاشخصی مشین سے سابقہ پڑا جو دفتری گھِس گھِس کی عادی تھی اور نہ اپنی رفتار تیز کرنا چاہتی تھی نہ کسی نئے راستہ پر چلنے کو تیار تھی اور دوسری طرف اپنے رفقائے کار میونسپلٹی کے اراکین سے جو اسی طرح پرانی لکیر کے فقیر تھے۔ ان میں سے بعض تصور پرست تھے اور اپنا کام بڑے جوش اور انہماک سے کرنے لگے لیکن بحیثیت مجموعی ان میں نہ تبدیلی یا ترقی کا جذبہ تھا اور نہ تخیل۔ ان کا خیال تھا کہ پرانے طریقے اچھے خاصے ہیں، پھر نئے نئے تجربے کرنے سے کیا فائدہ جن کی کامیابی موہوم ہے۔ تصور پرست اور جوشیلے لوگ بھی رفتہ رفتہ بندھے ٹکے معمول کے خواب آور اثر کا شکار ہو گئے۔ البتہ جب ملازموں کے تقرر کا موقع آتا تھا تو اراکین میں بڑی سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے مگر اس سے ان کی کارکردگی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا۔

ہر سال سرکاری اعلان، سرکاری عہدیدار اور بعض اخبارات میونسپلٹیوں اور لوکل بورڈوں کے کام پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کی برائیاں اور کمزوریاں گناتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ہندوستان میں جمہوری ادارے

نہیں چل سکتے۔ ان کی برائیاں تو مسلّم ہیں لیکن کوئی یہ بھی تو دیکھے کہ انھیں کس نظام کے اندر کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ نظام نہ جمہوری ہے اور نہ استبدادی بلکہ ایک درمیانی شکل ہے جس میں دونوں کی برائیاں موجود ہیں اور دونوں کی اچھائیاں مفقود۔ اس بات سے انکار نہیں کہ مرکزی حکومت کو نگرانی کا اختیار ہونا چاہیئے، لیکن اگر مرکزی حکومت خود جمہوری حیثیت نہ رکھتی ہو اور عوام کی ضروریات کا اسے کوئی لحاظ نہ ہو تو وہ ایسی مقامی مجلس کے ساتھ جسے عوام منتخب کرتے ہوں کیونکر نبھا سکتی ہے جہاں یہ صورت ہوتی ہے وہاں یا تو دونوں میں کش مکش رہتی ہے یا مقامی مجلس مرکزی حکومت کے سامنے بے چون وچرا سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے اور اس طرح مرکزی حکومت کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کئے بغیر اپنے اختیارات کا استعمال کرے ظاہر ہے کہ یہ صورت نہایت نامناسب ہے اور اس سے جمہوری حکومت کا منشا فوت ہو جاتا ہے میونسپل بورڈ کے اراکین کی نظر اپنے منتخب کرنے والوں کے مقابلے میں مرکزی قوت کی طرف زیادہ رہتی ہے اور پبلک بھی اکثر بورڈ کی پرواہ نہیں کرتی حقیقی سماجی مسائل پر تو بورڈ کبھی غور کرتا ہی نہیں کیونکہ یہ اس کے اختیارات سے باہر ہیں۔ بورڈ کا خاص کام تو بس ٹیکس وصول کرنا ہے اسی وجہ سے وہ زیادہ ہر دلعزیز نہیں ہو سکتا۔

مقامی مجالس کے رائے دہندوں کی تعداد بھی بہت محدود ہے۔ چنانچہ اس کی سخت ضرورت ہے کہ رائے دہی کے لئے جو معیار مقرر کیا گیا ہے اسے کم کیا جائے تاکہ رائے دہندوں کی تعداد بڑھ سکے میرا خیال ہے کہ بمبئی جیسے بڑے شہر کے کارپوریشن میں بھی رائے دہندوں کی تعداد بہت محدود ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اس کارپوریشن نے رائے دہندوں کی تعداد بڑھانے کا رزولیوشن خود نامنظور کر دیا تھا۔ غالباً کارپوریشن کے اراکین کی اکثریت اپنی موجودہ حالت پر قانع ہے۔ اس لئے انھیں کسی قسم

کی تبدیلی کرنے یا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بلدی ادارے کامیابی اور کارگذاری کی کوئی اچھی مثال پیش نہیں کرتے۔ اگرچہ اس حالت میں بھی وہ ترقی یافتہ جمہوری ممالک کی بعض میونسپلٹیوں سے کم نہیں ہیں۔ عام طور پر ان میں بد دیانتی نہیں پائی جاتی، البتہ نا اہلی ضرور ہے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کے ممبر اپنے عزیزوں اور دوستوں کی رعایت کرتے ہیں اور معاملات کی اہمیت کے صحیح تناسب سے ناواقف ہیں۔ لیکن یہ قدرتی امر ہے کیونکہ جمہوریت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کے پیچھے باخبر رائے عامہ ہو اور ہر شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہو۔ بہ خلاف اس کے ہمارے یہاں تو ہر طرف تحکم ہی تحکم نظر آتا ہے اور جمہوریت کے لوازم مفقود ہیں۔ نہ تو یہاں تعلیم عام ہے اور نہ رائے عامہ کو صحیح معلومات کی بنا پر تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ ذاتیات، فرقہ وارانہ کشاکش، یا اور چھوٹے چھوٹے قضیوں میں الجھ جاتے ہیں۔

میونسپلٹی کے معاملات میں حکومت کو صرف اتنی دلچسپی ہے کہ "سیاسیات" کا کہیں گذر نہ آنے پائے۔ اگر وہ اپنی کسی قرارداد کے ذریعہ سے قومی تحریک کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے تو فوراً حکومت کے ابرو پر بل آجاتا ہے۔ میونسپل مدارس میں ایسی کتابیں پڑھانے کی بھی ممانعت ہے جن میں قوم پرستی کا شائبہ بھی ہو۔ یہاں تک کہ قومی لیڈروں کی تصویریں لگانا بھی ممنوع ہیں۔ میونسپلٹی کو یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اس کی عمارت سے قومی جھنڈا نہ اتارا گیا تو وہ معطل کر دی جائے گی۔ ادھر کچھ عرصے سے اکثر صوبوں کی حکومتوں کو کد ہو گئی ہے کہ کارپوریشن اور میونسپلٹی کی ملازمت سے کانگریس والے

نکال باہر کیے جائیں۔ عام طور پر اس مقصد کے حصول کے لیے میونسپلٹیوں پر دباؤ ڈالنا کافی ہوتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ یہ دھمکی دی جاتی تھی کہ انھیں تعلیمی کاموں اور دوسرے مقاصد کے لیے جو سرکاری امداد ملتی ہے وہ روک دی جائے گی لیکن بعض صورتوں میں خصوصاً کلکتہ کارپوریشن کے معاملے میں یہ قانون بنا دیا گیا کہ جو شخص سول نافرمانی کے جرم میں یا حکومت کے خلاف کسی سیاسی تحریک کے سلسلے میں قید ہو چکا ہو وہ ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ طرز عمل خالص سیاسی وجوہ پر مبنی تھا، کیونکہ ان کی نا اہلی یا ناموزونی کا کوئی سوال نہ تھا۔

ان چند مثالوں سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ ہماری میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو کتنی آزادی حاصل ہے اور ان میں جمہوریت کو کتنا دخل ہے حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین پر (جو ظاہر ہے کہ سرکاری ملازمت نہیں کرنا چاہتے) میونسپلٹی اور مقامی اداروں کے دروازے بند کرنے کی جو خاص کوشش کی وہ ذرا قابل غور ہے اندازاً ۳ لاکھ افراد گذشتہ چودہ برس میں وقتاً فوقتاً جیل گئے۔ اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ ان ۳ لاکھ آدمیوں میں سیاسیات سے قطع نظر بہت سے ایسے لوگ تھے جو ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ اثر آفریں، با اصول اور خدمت و ایثار کا جذبہ رکھنے والے تھے۔ ان میں جوش اور عزم، قوت عمل اور دل و جان سے اپنے مقصد میں محو ہو جانے کی صفت تھی۔ غرض مفاد عامہ کے اداروں کو ان میں سے بہترین کارکن مل سکتے تھے۔ اس کے باوجود حکومت نے انتہائی کوشش کی بلکہ قانون تک نافذ کیے کہ یہ لوگ ان اداروں میں نہ گھسنے پائیں گویا اس طرح ان کو اور ان کے ہمدردوں کو سزا دینا منظور تھا۔ حکومت نکمے لوگوں کو پسند کرتی ہے اور آگے بڑھاتی ہے پھر شکایت کرتی ہے کہ مقامی ادارے نااہل ہیں اور لطف یہ ہے کہ اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ سیاست ان مقامی اداروں کے دائرہ عمل سے خارج ہے لیکن اگر وہ

حکومت کی حمایت میں سیاست میں حصہ لیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان کے مدرّسوں کو ملازمت سے برطرفی کی دھمکی دیکر مجبور کیا گیا کہ وہ دیہات میں جا کر حکومت کی طرف سے پروپگنڈا کریں؟

گزشتہ پندرہ سال میں کانگریس کے کارکنوں کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ انھوں نے بھاری بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالا ہے اور کم سے کم ایک طاقتور اور منظم حکومت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اس سخت ترین تربیت نے ان میں خود اعتمادی، لیاقت اور استقلال کی صفات پیدا کر دی ہیں۔ غرض ایک تحکم پسند حکومت نے ایک مدت کی نامرد بنانے والی کوششوں کے ذریعہ سے ہندوستانیوں میں جن خوبیوں کو فنا کر دیا تھا وہ اس تحریک نے پیدا کر دی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس کی تحریک میں بھی دوسری عام تحریکوں کی طرح بہت سے نالائق (بیوقوف، نااہل اور اس سے بھی بدتر لوگ) بھر گئے تھے اور اور اب بھی موجود ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک کانگریسی کارکن عموماً اپنے برابر قابلیت رکھنے والے شخص سے زیادہ کارگزار اور اثر آفریں ہوتا ہے۔

اس مسئلے کے ایک پہلو پر شاید حکومت اور اس کے مشیروں کی نظر نہیں گئی اور وہ یہ ہی کہ ملک کے انقلاب پسند حکومت کی اس کوشش کو دل سے پسند کرتے ہیں کہ وہ کانگریسی کارکنوں کو تمام ملازمتوں سے محروم کر دے اور ان پر روزگار کے تمام دروازے بند کر دے۔ عام طور پر کانگریسی اس لئے بدنام ہیں کہ وہ فطرتاً انقلاب پسند نہیں ہوتے۔ نیم انقلابی تحریکوں کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد وہ پھر بے عملی کی زندگی کی بھول بھلیوں میں پھنس جاتے ہیں اور یا کوئی اور کاروبار اور پیشہ کرنے لگتے ہیں یا مقامی سیاست کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اہم مسائل ان کے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور وہ پچھلا انقلابی جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ ان سے

چست اور مضبوط جسم پر چربی چھا جاتی ہے اور جوش و ہمت پر عافیت پسندی غالب آجاتی ہے، اوسط طبقے کے کارکنوں کے اسی لازمی رجحان کو دیکھ کر زیادہ ترقی پذیر اور انقلاب پسند کانگریسی یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو کونسلوں اور میونسپلٹیوں وغیرہ کے آئینی گورکھ دھندوں میں پھنسنے سے روکیں اور انھیں ایسی ملازمت نہ کرنے دیں جن میں انھیں اپنا سارا وقت دینا پڑے اور وہ جوش عمل سے محروم ہو جائیں۔ حکومت نے کانگریسی کارکنوں کے روزگار حاصل کرنے کے راستے میں مشکلات حائل کر کے گویا ایک طرح سے ان کی مدد کی ہے۔ اب اس کا زیادہ امکان ہے کہ ان کا انقلابی جوش و خروش قائم رہے بلکہ اور بڑھ جائے۔

میونسپلٹی میں ایک سال سے زیادہ کام کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں کوئی کارآمد خدمت انجام نہیں دے سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا تھا کہ کام ذرا عجلت سے انجام پانے لگے اور کچھ بہتر ہو جائے۔ کوئی معقول تبدیلی عمل میں لانا بالکل ناممکن تھا اس لئے میں چیرمین کے عہدے سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا لیکن تمام ممبروں نے مجھے مجبور کیا کہ میں استعفےٰ نہ دوں۔ سب لوگ میرے ساتھ بڑی مہربانی اور اخلاق سے پیش آتے تھے اس لئے میرے لئے یہ مشکل تھا کہ ان کی رائے نہ مانوں۔ آخرکار دوسرے سال کے اختتام پر میں نے استعفےٰ دے دیا۔

یہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ اسی سال موسم خزاں میں میری بیوی بہت سخت بیمار ہو گئیں اور مہینوں لکھنؤ کے اسپتال میں پڑی رہیں۔ کانگرس کا اجلاس اس سال کانپور میں ہوا تھا چونکہ میں اب بھی کانگرس کا جنرل سکریٹری تھا اس لئے ایک پریشانی کے عالم میں الہ آباد، کانپور، لکھنؤ دوڑا دوڑا پھرتا تھا۔

ڈاکٹروں نے میری بیوی کے متعلق یہ تجویز کیا کہ انھیں علاج کے لئے سوئزرلینڈ لے جاؤ۔ میں نے بھی اس خیال کو پسند کیا کیونکہ میں خود ہی ہندوستان سے باہر

جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میرے خیالات دھندلے اور الجھے ہوئے تھے اور مجھے کوئی صاف اور سیدھی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں ہندوستان سے دور ہوں تو شاید مختلف چیزوں کو صحیح نظر سے دیکھ سکوں اور اپنے دماغ کی تاریکی کو دور کر سکوں۔

غرض مارچ ۲۶ء کے شروع میں، میں اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ بمبئی سے وینس روانہ ہو گیا۔ اسی جہاز میں میری بہن اور بہنوئی رنجیت۔ ایس پنڈت بھی تھے۔ وہ ہم سے بہت پہلے یورپ کی سیر کا ارادہ کر چکے تھے۔

(۲۱)

یورپ میں

میں تیرہ چودہ برس کے بعد یورپ جا رہا تھا۔ اس عرصے میں یورپ جنگ عظیم انقلابات، اور زبردست تبدیلیوں کے دور سے گذر چکا تھا۔ گویا وہ پرانی دنیا جسے میں نے دیکھا تھا جنگ کی تباہ کاریوں اور خونریزیوں کی نذر ہو چکی تھی اور اب ایک نئی دنیا میری منتظر تھی۔ میرا ارادہ چھ سات مہینے یا زیادہ سے زیادہ آخر سال تک یورپ میں ٹھہرنے کا تھا۔ لیکن مجھے پورے پونے دو برس وہاں قیام کرنا پڑا۔

اس زمانے میں میرے دماغ اور جسم دونوں کو بڑا اسکون اور آرام نصیب ہوا ہم نے زیادہ وقت سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا اور مونتانہ کی صحت گاہ میں گذارا۔ میری چھوٹی بہن کرشنا بھی سنہ ۱۹۲۶ء کی گرمیوں کے شروع میں ہندوستان سے آگئی اور آخر تک ہمارے ساتھ یورپ میں رہی۔ میں زیادہ عرصے تک اپنی بیمار بیوی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس لئے مجھے صرف تھوڑے تھوڑے دن کے لئے دوسرے مقامات پر جانے کا موقع ملا۔ جب انھیں کچھ صحت ہو گئی تو ہم نے فرانس، انگلستان اور جرمنی کی تھوڑی سیر کی۔ پہاڑ کی چوٹی پر چو چاروں طرف سرمائی برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں ہندوستان اور یورپ، دونوں سے بالکل بے تعلق ہو گیا تھا خصوصاً ہندوستان اور وہاں کے واقعات سے تو کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ میں دنیا پر اس طرح نظر ڈالتا تھا جیسے کوئی دور سے تماشا دیکھ رہا ہو۔ کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا واقعات کا مشاہدہ کرتا تھا، یورپ کی سیاسی اور اقتصادی حالت اور آزادانہ معاشرتی

تعلقات کو غور سے دیکھتا تھا اور ان سب چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا ظاہر ہے کہ جنیوا کے قیام کے زمانے میں انجمن اقوام اور بین الاقوامی لیبر آفس کے کاموں سے مجھے خاص دلچسپی تھی۔

لیکن سردی شروع ہوتے ہی میں سرمائی کھیلوں میں محو ہو گیا کئی مہینے تک یہی میرا شغل اور یہی شوق رہا۔ برف پر پھسلنے کی مشق تو میں نے پہلے بھی کی تھی لیکن دو تین گز لمبی کھڑانویں پہن کر برف پر چلنا میرے لئے نئی چیز تھی اور مجھے بہت پسند آئی۔ شروع شروع میں تو بڑی تکلیف ہوئی لیکن بار بار گرنے کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور آخر کار اس میں لطف آنے لگا۔

بحیثیت مجموعی زندگی دلچسپ واقعات سے خالی تھی۔ دن گذرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری بیوی کو صحت اور طاقت حاصل ہوتی گئی۔ اس عرصے میں ہم بہت کم ہندوستانیوں سے ملے بلکہ اس چھوٹی سی پہاڑی بستی کے باشندوں کے سوا اور لوگوں سے ملنے کا موقع ہی بہت کم حاصل ہوا۔ پھر بھی یورپ کے اس پونے دو برس کے قیام میں چند ہندوستانی جلاوطنوں اور پرانے انقلاب پسندوں سے ملاقات ہوئی جن کے نام میں نے اکثر سنے تھے۔

ان میں سے ایک صاحب شیام جی کرشن ورما تھے جو اپنی بیمار بیوی کے ساتھ جنیوا میں ایک مکان کی سب سے بالائی منزل میں مقیم تھے یہ دونوں بڈھے بڑھیا بالکل تنہا رہتے تھے ان کے یہاں کوئی نوکر تک نہ تھا۔ ان کے کمرے بند بند اور گھٹے ہوئے تھے۔ ہر چیز پر گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی شیام جی کے پاس روپیہ بہت تھا لیکن وہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ چند پیسے بچانے کے لئے ٹریم پر جانے کے بجائے پیدل چلنا گوارا کرتے تھے۔ ہر شخص کو جو ان کے پاس آتا تھا شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے، اور جب تک اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے، یہی سمجھتے تھے کہ یا

تو یہ انگریزوں کا جاسوس ہے یا میرے روپے کی تاک میں ہے۔ ان کی جیبوں میں ان کے رسالے (انڈین سوشیالوجسٹ) کے پرانے پرچے بھرے رہتے تھے اور جہاں موقع ہوتا بڑے جوش سے انھیں نکال کر بارہ برس پہلے کا لکھا ہوا اپنا کوئی مضمون دکھاتے تھے۔ وہ اگلے وقتوں کی باتیں کیا کرتے تھے کہ ہیمپسٹیڈ کے انڈیا ہاؤس میں یہ ہوا اور یہ ہوا، برطانوی حکومت نے میرے پیچھے فلاں فلاں جاسوس لگائے، میں نے انھیں اس طرح پہچانا اور یوں چلکہ دیا۔ ان کے کمروں کی تمام دیواروں پر الماریاں لگی ہوئی تھیں جن میں پرانی کتابیں بھری تھیں لیکن سب گرد آلود اور بے ترتیب تھیں اور آنے والوں کو حسرت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ فرش پر بھی کتابیں اور کاغذات منتشر پڑے رہتے تھے اور اکثر اسی حالت میں انھیں دن اور ہفتے بلکہ مہینے گزر جاتے تھے۔ غرض ساری فضا پر اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی وہاں ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت رکھتی تھی۔ انسان اس مکان کے تاریک اور سنسان برآمدوں میں سے گذرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں موت کے فرشتے سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے اور وہاں سے باہر نکل کر اطمینان کا سانس لیتا تھا۔

شیام جی کا خیال تھا کہ اپنے روپے کا کچھ انتظام کر دیں یعنی کسی رفاہ عام کے کام کے لئے ایک وقف قائم کر دیں۔ ان کا رجحان زیادہ تر ہندوستانیوں کو غیر ممالک میں تعلیم دلانے کی طرف تھا۔ انھوں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں بھی ایک متولی بن جاؤں لیکن میں نے اس ذمہ داری کو اپنے سر لینے کے لئے کچھ زیادہ آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔ اول تو میں ان کے مالی معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ اگر میں نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا تو انھیں فوراً یہ خیال ہو جائے گا کہ میں بھی ان کے روپے کی فکر میں ہوں۔ کسی کو ان کی دولت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور سنا تھا کہ جرمن مارک کا بھاؤ گرا تو انھیں بہت نقصان ہوا تھا۔

جینوا میں اکثر بڑے بڑے ہندوستانی آتے رہتے ہیں۔ لیگ اقوام کے جلسوں کی شرکت کے لئے عموماً سرکاری قسم کے آدمی آتے تھے اس لئے شیام جی ان کے پاس تو پھٹکتے بھی نہ تھے البتہ لیبر آفس میں کبھی کبھی مشہور و معروف غیر سرکاری لوگ اور معتدل کانگریسی بھی آجاتے تھے۔ شیام جی ان سے ملنے کی ضرور کوشش کرتے اور یہ مشاہدہ نہایت ہی پر لطف ہوتا کہ ان پر شیام جی کی ملاقات کا کیا اثر ہوتا ہے عموماً وہ ان سے گھبراتے تھے، عام صحبتوں میں ان سے بچنے کی کوشش کرتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا گھر پر ملنے سے بھی عذر کر دیتے تھے۔ ان سے ملنا جلنا یا ان کی صحبت میں دیکھا جانا خطرناک سمجھا جاتا ہے۔

اس طرح شیام جی اور ان کی بیوی اپنے گوشۂ عزلت میں زندگی کے دن پورے کرتے تھے، نہ ان کے کوئی اولاد تھی، نہ عزیز و اقارب، نہ دوست احباب نہ انھیں کسی چیز سے کوئی تعلق تھا نہ کسی شخص سے کوئی واسطہ۔ گویا وہ گذرے ہوئے زمانے کی یادگار تھے اور اپنا وقت مدت کا ختم کر چکے تھے۔ جدید عہد میں وہ کسی طرح نہیں کھپتے تھے۔ دنیا انھیں نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی لیکن ان کی آنکھوں میں اب بھی پرانی آگ کے شرارے موجود تھے اور اگرچہ مجھ میں اور ان میں بہت کم چیزیں مشترک تھیں پھر بھی مجھے ان سے پوری ہمدردی تھی اور میں ان کا بہت ادب کرتا تھا۔

حال ہی میں اخباروں سے ان کے انتقال کا حال معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہی اس شریف گجراتی خاتون کی موت کی خبر ملی جس نے اس جلاوطنی کے زمانے میں تمام عمر ان کا ساتھ دیا۔ سنا گیا ہے کہ اس خاتون نے غیر ممالک میں ہندستانی عورتوں کی تعلیم کے لئے بہت کافی رقم چھوڑی ہے۔

ایک اور مشہور شخص جن کا میں اکثر نام سنا کرتا تھا مگر جن سے ملنے کا پہلے پہل

سوئزرلینڈ میں اتفاق ہوا، راجہ مہندر پرتاپ تھے۔ ان دنوں وہ بڑے دلچسپ جائیت لپسند آدمی تھے اور شاید اب بھی ہوں۔ وہ ایک خیالی دنیا میں رہتے تھے حقیقی زندگی سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا میں پہلی مرتبہ انھیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ عجیب قسم کا مخلوط لباس پہنے ہوئے تھے جو تبت کے پہاڑوں یا سائبریا کے میدانوں کے لئے تو موزوں ہوسکتا تھا لیکن مانٹریو میں گرمیوں کے زمانے میں تو بالکل بے تکا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک نیم فوجی قسم کی پوشاک اور اونچے روسی بوٹ ڈانٹے ہوئے تھے۔ ان کے کوٹ میں بہت سی بڑی بڑی جیبیں لگی تھیں اور سب میں کاغذات اور تصویریں وغیرہ بھری رہتی تھیں۔ ان میں جرمنی کے چانسلر بیتھمین ہالوگ کا ایک خط تھا، قیصر کی دستخطی تصویر تھی، تبت کے دلائی لامہ کا دیا ہوا ایک خوبصورت خریطہ تھا اور ہر قسم کے کاغذات اور فوٹو تھے۔ تعجب ہوتا تھا کہ ان جیبوں میں اتنی چیزیں کیسے سما گئیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ چین میں ان کا صندوقچہ جس میں بہت سے قیمتی کاغذات تھے کھو گیا تھا۔ اس وقت سے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا تھا کہ اپنے تمام ضروری کاغذات ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔ اسی لئے اس کثرت سے جیبیں لگوائی تھیں۔

راجہ مہندر پرتاپ اپنی چین، جاپان، تبت اور افغانستان کی سیاحی اور مہمات کی بیشمار داستانیں سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے بڑی رنگ برنگ کی زندگی گزاری تھی اس لیئے اس کا تذکرہ واقعی بہت دلچسپ تھا۔ ان کا تازہ ترین شوق "مجلس شادمانی" تھی جو خود انھوں نے قائم کی تھی اور جس کا مسلک یہ تھا کہ "ہمیشہ خوش رہو" اس انجمن کو لیتھویا میں (یا شاید لیتھونیا میں) سب سے زیادہ کامیابی ہوئی۔

جینوا میں یا دوسرے مقامات پر جو کانفرنسیں ہوتی تھیں ان کے شرکاء کے نام وقتاً فوقتاً وہ بہت سے پوسٹ کارڈ بھیجا کرتے تھے جن پر ان کا پیام چھپا ہوتا تھا اس کو وہ پروپگنڈا کہتے تھے۔ ان پیامات کے نیچے وہ اپنے ہاتھ سے دستخط کرتے

تھے لیکن جو نام لکھتے تھے وہ ایک عجیب طول طویل معجون مرکب تھا۔ انھوں نے مہندر پرتاب کے تو صرف ابتدائی حروف (م۔ پ) لے لئے تھے اور اس کے بعد ناموں کی ایک لمبی فہرست تھی، جن میں ان کے ہر محبوب ملک کا ایک ایک نام شامل تھا اس طرح وہ اپنی بین الاقوامی اور آفاقی حیثیت کا اظہار کرتے تھے۔ یہ انوکھا نام "خادم انسانیت" کے موزوں لقب پر ختم ہوتا تھا۔ بہت مشکل تھا کہ کوئی شخص مہندر پرتاب کی باتوں کو سنجیدگی سے سُن سکے۔ وہ قرون وسطیٰ کی داستان کے ہیرو معلوم ہوتے تھے، گویا ڈان کوئشوٹ راہ بھٹک کر بیسویں صدی میں آنکلے تھے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت کھرے اور پُرخلوص آدمی تھے۔

فرانس میں ہم بوڑھی مادام کاما سے ملے۔ جب وہ قریب سے انسان کے چہرے کو گھورتی تھیں اور انگلی سے اشارہ کرکے ڈپٹ کر پوچھتی تھیں کہ تم کون ہو تو اس پر ایک ہیبت سی چھا جاتی تھی۔ اس سوال کے جواب پر وہ کوئی توجہ نہیں کرتی تھیں۔ (غالباً) اس قدر بہری تھیں کہ سنتی بھی نہیں تھیں) خود ہی ایک رائے قائم کرلیتی تھیں اور پھر اس سے نہیں ہٹتی تھیں، خواہ واقعات، کی شہادت اس کے خلاف ہو۔

ہندوستانی جلاوطنوں میں ایک شخص مولوی عبید اللہ بھی تھے جن سے میں تھوڑی دیر کے لئے اٹلی میں ملا تھا۔ وہ مجھے بہت تیز آدمی معلوم ہوئے لیکن اس قسم کے جو پرانے طرز کے سیاسی جوڑ توڑ کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ جدید خیالات سے وہ باخبر نہیں تھے انھوں نے "ریاستہائے متحدہ ہند" یا "ہندوستان کی متحدہ جمہوریت" کی ایک اسکیم تیار کی تھی جس میں فرقہ وارانہ مسائل کو بڑی قابلیت سے حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے قیام استنبول کے (جو اس وقت قسطنطنیہ کے نام سے مشہور تھا) بہت سے واقعات سنائے۔ لیکن میں نے اس داستان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی اور مجھے اس کا خیال بھی نہیں رہا۔ چند مہینے بعد وہ لالہ لاجپت رائے سے

ملے اور غالباً ان کو بھی وہی قصہ سنایا۔ لالہ جی اس سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ اسی سال کونسلوں کے انتخاب کے سلسلے میں اس قصے کا بہت چرچا رہا اور اس سے طرح طرح کے بیجا اور حیرت انگیز نتائج اخذ کیے گئے کچھ دن کے بعد مولوی عبیداللہ حجاز چلے گئے اور اب برسوں سے مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملی ہے۔

برلن میں مجھے ایک اور مولوی صاحب یعنی مولوی برکت اللہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بالکل دوسری قسم کے تھے۔ یہ ایک بڑے دلچسپ، نہایت جوشیلے اور نہایت خوش خلق بزرگ تھے۔ سیدھے سادے آدمی تھے اور کچھ زیادہ قابل اور ذہین بھی نہیں تھے لیکن نئے خیالات کو جذب کرنے اور دنیا کی رفتار کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں جب ہم سوئزرلینڈ میں تھے تو ہم کو معلوم ہوا کہ سین فرانسسکو میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھے یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا۔

برلن میں بہت سے ایسے لوگ ملے جنھوں نے جنگ کے زمانے میں وہاں ایک "ہندوستانی کمیٹی" قائم کی تھی۔ لیکن یہ کمیٹی عرصہ ہوا منتشر ہو چکی تھی۔ اس کے اراکین میں آپس میں اختلاف پیدا ہوا اور طرح طرح کے جھگڑے ہوئے، کیونکہ ان میں سے ہر شخص دوسرے پر غداری کا شبہ کرتا تھا۔ سیاسی جلاوطنوں کی ہر جگہ یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ جرمنی میں جنگ کے بعد روزگار میسر آنا بہت مشکل تھا پھر بھی برلن کے ان ہندوستانیوں میں سے اکثر نے جب موقع ملا اوسط درجے کے پرسکون پیشے اختیار کر لیے اور تمام انقلابی تحریکوں سے علیحدہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ سیاست سے بھی بچنے لگے۔

جنگ کے زمانے کی اس ہندوستانی کمیٹی کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے اس کے اراکین میں زیادہ تر وہ ہندوستانی طالب علم تھے جو ۱۹۱۴ء کی ہنگامہ زا گرمیوں میں جرمنی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے تھے۔ وہ جرمنی طلبہ کے ساتھ مل کر

رہتے تھے، ان کے گیت گاتے تھے۔ ان کے کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھتے تھے اور ان کی تہذیب کو ہمدردی اور قدر کی نظر سے دیکھتے تھے جنگ سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ اس قومی جنون کے سیلاب سے نہ بچ سکے جو اس وقت جرمنی کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ اصل میں ان میں جرمنی کی دوستی کا جذبہ نہیں بلکہ برطانیہ کی دشمنی کا جذبہ کارفرما تھا اور ان کی وطن پرستی نے انھیں برطانیہ کے دشمنوں کا ہمدرد بنا دیا تھا جنگ چھڑنے کے بعد ہی اور ہندوستانی جو زیادہ کھلے ہوئے انقلابی تھے سوئزرلینڈ کے راستے جرمنی پہنچ گئے ان لوگوں نے اپنی ایک کمیٹی بنائی اور فوراً ہردیال کو طلب کیا جو اس وقت امریکہ کے مغربی ساحل پر تھے۔ ہردیال تو چند مہینے بعد پہنچے لیکن اس عرصے میں کمیٹی کو خاصی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اصل میں جرمن حکومت نے خود ہی اسے اہمیت دیدی تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ برطانیہ کی ہر مخالف تحریک سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ دوسری جانب ہندوستانی اس وقت کے بین الاقوامی معاملات کو اپنے قومی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے مگر انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ جرمنی محض اپنے مفاد کے لئے ان کو آلۂ کار بنائے۔ اگرچہ اس وقت وہ جرمن حکومت کے بس میں تھے مگر وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز ہے جسے حاصل کرنے کے لئے یہ حکومت بیچین ہے۔ اس لئے انھوں نے سودا چکانا شروع کر دیا اور اس پر اصرار کیا کہ ہندوستان کی آزادی کا قول و قرار کر لیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کے دفتر خارجہ نے ان سے کوئی باضابطہ معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر جنگ میں جرمنی کو فتح حاصل ہوئی تو وہ ہندوستان کو آزاد ملک تسلیم کر لیگا۔ اس وعدے پر اور بعض اور جزوی شرائط پر ہندوستانی کمیٹی نے جنگ میں جرمنی کی مدد کرنے کا اقرار کیا تھا۔ غرضکہ اس کمیٹی کا سرکاری طور پر ہر طرح کا اعزاز و اکرام ہوتا تھا۔ اور اس کے نمائندوں کو مختلف سلطنتوں کے سفیروں کے برابر جگہ دی جاتی تھی۔

ایک چھوٹی سی جماعت کو جو زیادہ تر ناتجربہ کار نوجوانوں پر مشتمل تھی یکایک اتنی اہمیت حاصل ہو جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں اکثر وں کے سر پھر گئے۔ وہ سمجھنے لگے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ بدل رہے ہیں اور کوئی زبردست کارنامہ اور عظیم الشان مہم سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کو عجیب عجیب حادثات پیش آئے۔ بڑے بڑے خطرات سے بال بال بچے۔ جنگ کے اختتام کے زمانے میں ان کی اہمیت بہت کم ہو گئی تھی اور حکومت جرمنی نے انھیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ ہردیال کا پتا تو بہت پہلے کٹ چکا تھا۔ کیونکہ کمیٹی سے ان کی بالکل نہ بنتی تھی۔ حکومت جرمنی اور کمیٹی دونوں انھیں ناقابل اعتماد شخص سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے بہت خاموشی سے رفتہ رفتہ انھیں کھسکا دیا۔ بہت مدت بعد جب ۱۹۲۶ء و ۱۹۲۷ء میں، میں جرمنی گیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یورپ کے اکثر قدیم باشندے ہردیال کے متعلق کتنے بُرے خیالات رکھتے تھے۔ اس وقت وہ سویڈن میں مقیم تھے۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

جنگ ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی برلن کی ہندوستانی کمیٹی بھی ختم ہو گئی تمام امیدوں کے خاک میں مل جانے کے بعد ان ہندوستانیوں کو زندگی دوبھر ہو گئی یہ لوگ بہت اونچی بازی لگا کر ہار گئے تھے اور یوں بھی جنگ کے زمانے کی سرگرمی اور اہمیت کے بعد انھیں زندگی بہت بے مزہ معلوم ہوتی ہو گی اور پھر اس بے مزہ زندگی میں بھی انھیں اطمینان نصیب نہ تھا۔ ہندوستان تو واپس جا ہی نہیں سکتے تھے اور جنگ کے بعد شکست خوردہ جرمنی میں رہنا آسان نہ تھا۔ بیچارے بڑی کشمکش میں بسر کرتے تھے بعد میں ان میں سے بعض لوگوں کو حکومت برطانیہ نے ہندوستان واپس جانے کی اجازت دیدی لیکن اکثر کو جرمنی ہی میں ٹھہرنا پڑا۔ ان کی حیثیت عجیب و غریب تھی۔ کوئی سلطنت انھیں اپنی رعیت تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان کے

پاس باضابطہ پاسپورٹ نہیں تھے اس لئے جرمنی سے باہر قدم نکالنا ناممکن تھا اور وہاں رہنے میں بھی بڑی مشکلوں کا سامنا تھا کیونکہ وہ سراسر مقامی پولیس کے رحم و کرم پر تھے۔ غرض ان کی زندگی خطرے اور مصیبت سے پر تھی۔ آئے دن کی پریشانیاں اور روزی کی فکر چین نہیں لینے دیتی تھی۔

۱۹۳۳ء کے آغاز میں نازی دور شروع ہوا۔ اس نے ان کی مصیبتوں میں اور اضافہ کر دیا۔ ان سے مفر کی یہی ایک صورت تھی کہ نازی اصولوں کو حرف بحرف تسلیم کرلیں۔ جرمنی میں اب ان غیر ملکیوں کا جو نارڈی(۱) نسل سے نہ ہوں خصوصاً ایشیا والوں کا رہنا پسند نہیں کیا جاتا ہاں اگر وہ حکومت کی مرضی پر چلیں تو ان کا وجود گوارا کرلیا جاتا ہے۔ ہٹلر علی الاعلان یہ کہہ چکا ہے کہ وہ ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا حامی ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ وہ برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے ظاہر ہے کہ جن ہندوستانیوں سے حکومت برطانیہ ناخوش ہے ان سے اسے کوئی ہمدردی نہیں۔

برلن میں ہم ایک اور جلا وطن سے ملے جو زمانہ جنگ کی ہندوستانی جماعت کے خاص رکن تھے ان کا نام چمپک رمن پلے تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتے تھے اور نوجوان ہندوستانی طلبہ نے انھیں طنز کے طور پر ایک شاندار خطاب(۲) دے رکھا تھا۔ ان کا تصور خالص قوم پرستی تک محدود تھا اور کسی مسئلے کو

---

(۱) لانبے قد گورے رنگ اور لمبوترے سر کی نسل جو نارڈے سویڈن، جرمنی اور شمالی برطانیہ میں آباد ہے۔

(۲) ہندوستانی انھیں "گبھائم راٹ" کہا کرتے تھے جو جرمنی میں "رائٹ آنریبل" کے مساوی ہے۔

سماجی یا اقتصادی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ جرمنی قوم پرستوں (یعنی فولادی خودوالوں) کے ساتھ ان کی خوب نبھتی تھی وہ جرمنی کے ان معدودے چند ہندوستانیوں میں تھے جن کی نازیوں سے میزان ہٹ گئی تھی۔ ابھی چند مہینے ہوئے ہیں نے جیل میں پڑھا کہ برلن میں ان کا انتقال ہوگیا۔

دیریندر ناتھ چٹو پادھیائے جو ہندوستان کے ایک مشہور خاندان کے فرد تھے، بالکل دوسری قسم کے شخص تھے۔ عام طور پر وہ چٹو کے نام سے مشہور تھے اور بڑے قابل اور دلچسپ آدمی تھے۔ بیچارے ہمیشہ تنگ دست رہتے تھے، پھٹے پرانے کپڑے پہن کر گذر کرتے تھے اور کبھی کبھی فاقے کی نوبت آجاتی تھی۔ مگر خوش مزاجی اور زندہ دلی نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جب میں انگلستان میں تعلیم پاتا تھا تو وہ مجھ سے چند جماعت آگے تھے یعنی جس وقت میں ہیرو میں داخل ہوا تو وہ آکسفورڈ میں پڑھتے تھے۔ اس کے بعد سے پھر انھیں ہندوستان آنا نصیب نہیں ہوا۔ کبھی کبھی انھیں وطن کی یاد ستاتی ہے اور ہندوستان واپس آنے کے لئے تڑپتے ہیں وطن سے ان کے تمام تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور یہ یقینی امر ہے کہ یہاں آکر ان کا جی گھبرائے گا اور یہاں کی زندگی میں نہیں کھپ سکیں گے لیکن اتنی مدت گذر جانے کے بعد، اس جہاں گردی کے باوجود وطن کی کشش اب بھی باقی ہے۔ یہ روگ جسے میزینی نے "روحانی دق" کہا ہے، سب جلاوطنوں میں عام ہے کوئی اس سے نہیں بچ سکتا۔ اگرچہ میں سیاسی جلاوطنوں کی قربانیوں کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مجھے ان کی مصیبتوں اور مشکلوں کا اعتراف اور ان سے ہمدردی ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ جن سے ملنے کا مجھے اتفاق ہوا ان میں بیشتر حضرات سے میں کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم نام سے جانتے ہیں۔ باقی سب لوگ

ہندوستان سے بے تعلق ہوگئے ہیں اور ان کے ہم وطن جن کی خاطر انھوں نے مصیبتیں جھیلیں، انھیں بالکل بھول گئے ہیں۔ بہر حال جن چند جلاوطنوں سے میں ملا، ان میں سے صرف چٹو پادھیا اور ایم این رائے کی قابلیت نے مجھے متاثر کیا۔ رائے سے ماسکو میں صرف آدھ گھنٹے کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ بہت مشہور اشتراکی تھے لیکن بعد میں وہ کومنٹرن کی خالص اشتراکیت سے بہت ہٹ گئے تھے۔ اب تین سال سے وہ ہندوستان میں قید ہیں۔ چٹو جہاں تک مجھے معلوم ہے باضابطہ اشتراکی نہیں تھے لیکن ان کا رجحان اشتراکیت کی طرف ضرور تھا۔ اور سیکڑوں ہندوستانی یورپ میں مارے مارے پھرتے ہیں وہ انقلابی طرز کی گفتگو کرتے ہیں انوکھی من چلے پن کی تجویزیں سمجھاتے ہیں اور عجیب و غریب سوالات کرتے ہیں ان پر برطانیہ کے جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

ہم بہت سے یورپیوں اور امریکیوں سے بھی ملے۔ جینوا سے کئی بار رومیں رولاں کی زیارت کے لئے ولے نووے بھی گئے۔ پہلی مرتبہ ہم گاندھی جی کا تعارفی خط لے گئے تھے۔ ارنسٹ ٹولر کی ملاقات بھی ایک قابل قدر یادگار ہے۔ یہ جرمن زبان کا نوجوان شاعر اور ڈراما نویس ہے لیکن اب نازیوں کے دور میں وہ جرمن نہیں رہا ہے۔ نیو یارک کی سول لبرٹیز یونین کے بانی، روجر بالڈون کی ملاقات پر بھی ہمیں فخر ہے جینوا میں مشہور مصنف دھن گوپال مکرجی سے ہماری دوستی ہوگئی تھی۔ وہ عرصے سے امریکہ میں بودوباش اختیار کر چکے ہیں۔

یورپ کی روانگی سے پہلے میں ہندوستان ہی میں آکسفورڈ کی تحریک کے علمبردار فرینک بچمین سے بھی ملا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریک کے متعلق چند کتابیں مجھے دی تھیں اور میں نے بڑے استعجاب کے ساتھ انھیں پڑھا تھا۔ یہ فوری تبدیل عقائد، اعتراف گناہ اور احیائے مذہب کی عام فضا علم و عقل کے ساتھ

پچھ کھپتی نہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض لوگ جو بظاہر سمجھدار معلوم ہوتے ہیں ان عجیب و غریب خیالات کو کیسے گوارا کر لیتے ہیں اور کیونکر ان سے اتنے متاثر ہو جاتے ہیں مجھے اس تحریک کے مطالعہ کا اشتیاق پیدا ہو گیا اور جینوا میں فرنک بچمین سے پھر ملا انھوں نے مجھے اپنی بین الاقوامی ہاؤس پارٹی میں شرکت کی دعوت دی جو شاید رومانیہ میں ہونے والی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ وہاں جا کر میں اس نئی جذباتی تحریک کو قریب سے نہ دیکھ سکا میرا اشتیاق اب بھی باقی ہے اور جتنا زیادہ مجھے اس تحریک کی ترقی کا علم ہوتا ہے اتنی ہی حیرت بڑھتی ہے۔

(۴۴)

ہندوستان میں پھوٹ

ہم ابھی سوئزرلینڈ پہنچے ہی تھے کہ انگلستان میں عام ہڑتال ہو گئی۔ یہ سن کر میں جوش سے بیتاب ہو گیا۔ فطرتاً مجھے ہڑتالیوں سے ہمدردی تھی۔ چند روز بعد جب ہڑتال ناکام ہوئی تو مجھے ذاتی طور پر صدمہ ہوا۔ کچھ مہینے بعد مجھے چند روز کے لئے انگلستان جانے کا اتفاق ہوا۔ کان کنوں کی جنگ ابھی جاری تھی اور رات کے وقت لندن میں نیم تاریکی کا عالم رہتا تھا۔ میں خود کانوں کے علاقے میں گیا۔ غالباً یہ ڈربی شائر میں واقع تھا۔ میں نے مردوں، عورتوں، بچوں کے فلاکت زدہ اور اترے ہوئے چہرے دیکھے۔ اس سے زیادہ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بہت سے ہڑتالیوں اور ان کی بیویوں پر مقامی عدالت میں مقدمے چل رہے تھے۔ کوئلے کی کانوں کے ڈائرکٹر یا منیجر خود ہی مجسٹریٹ تھے۔ وہ ان مقدموں کی سماعت کرتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے جرموں پر ہنگامی قوانین کے ماتحت کان کنوں کو سزائیں دیتے تھے۔ ایک مقدمے پر تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ تین چار عورتیں پیش ہوئیں جن کی گودوں میں ننھے ننھے بچے تھے۔ ان غریبوں کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے ہڑتال میں شریک نہ ہونے والوں پر لعن طعن کی تھی۔ یہ نوجوان مائیں اور ان کے بچے دونوں مصیبت اور فاقوں کے مارے معلوم ہوتے تھے۔ اس طویل جنگ نے ان کا چلبلاپن نکال دیا تھا، اور ان کے دلوں میں ان لوگوں کی طرف سے جو ہڑتال میں شریک نہیں ہوئے تھے اور ان سے ان کی روزی چھین رہے

تھے۔ نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں انصاف ایک طبقے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تو اس کی مثالیں عام ہیں۔ لیکن کم سے کم انگلستان میں مجھے یہ توقع نہ تھی کہ اس کی ایسی کھلی ہوئی مثال نظر آئے گی۔ اسی وجہ سے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ ایک اور چیز سے بھی مجھے بڑی حیرت ہوئی یعنی وہاں کے ہڑتالی بالکل سہمے ہوئے تھے۔ پولیس اور حکام نے انھیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اس ذلت آمیز سلوک کو بڑی مسکینیت سے برداشت کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس طویل جنگ نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ ان کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں اور دوسری مزدور انجمنوں کے لوگ انھیں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ پھر بھی ان میں اور ہندوستان کے غریب مزدوروں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ برطانوی کان کنوں کی اب بھی ایک طاقتور انجمن موجود تھی۔ ساری قوم بلکہ ساری دنیا کی مزدور انجمنوں کی ہمدردی انھیں حاصل تھی اور نشر و اشاعت کے ذرائع اور دوسرے قسم کے طرح طرح کے وسائل میسر تھے ہندوستانی مزدوروں کو یہ چیزیں بھلا کہاں نصیب! لیکن پھر بھی دونوں کے سہمے ہوئے چہروں میں بہت مشابہت تھی۔

ہندوستان میں اس سال اسمبلی اور کونسلوں کے سہ سالہ انتخابات ہونے والے تھے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس سلسلے میں جو ہنگامہ خیز بحثیں چھڑیں ان کی بھنک سوئٹزرلینڈ میں میرے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے نے سوراج پارٹی کی مخالفت میں ایک نئی پارٹی بنائی ہے، جس کا نام نیشلسٹ پارٹی ہے۔ نہ اس وقت میری سمجھ میں آیا اور نہ اب تک میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ آخر کن اصولوں کی بنا پر یہ نئی پارٹی پرانی پارٹی سے علیحدہ ترتیب دی گئی۔ سچ پوچھیے تو آجکل ہندوستان

کی اکثر پارٹیوں میں محض نام کا فرق ہے۔ کوئی اصولی اختلاف نہیں، اس میں شک نہیں کہ سوراج پارٹی نے پہلے پہل کونسلوں میں ایک نئے اور جارحانہ طرزِ عمل کا نمونہ پیش کیا اور ایک انتہاپسندانہ پالیسی اختیار کی لیکن اس میں اور دوسری پارٹیوں میں فرق صرف درجے کا تھا، ورنہ تھیں سب ایک ہی قسم کی۔

یہ نیشنلسٹ پارٹی نسبتاً اعتدال پسندانہ خیالات رکھتی تھی اور سوراج پارٹی کی بہ نسبت اس کا رجحان حکومت کی طرف زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ خالص ہندو پارٹی تھی اور مہاسبھا کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی۔ مالویہ جی کا اس کی رہبری کرنا قدرتی بات تھی کیونکہ خود ان کا پبلک معاملات میں قریب یہی رویہ تھا۔ پرانے تعلقات کی وجہ سے وہ کانگریس کے ممبر تو رہے، لیکن خیالات کے اعتبار سے ان میں اور لبرلوں یا اعتدال پسندوں میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ وہ ترکِ موالات یا کانگریس کی عملی جدوجہد کے نئے طریقے کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور کانگریس کی پالیسی کے طے کرنے میں ان کو کوئی دخل نہ رہتا۔ اگرچہ کانگریس والے اب بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ لیکن سچ پوچھئے تو جدید کانگریس میں ان کی کھپت نہیں ہو سکتی تھی وہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نہیں تھے اور انھوں نے کانگریس کے احکام کی خصوصاً آئین ساز مجالس کے معاملے میں تعمیل نہیں کی تھی۔ ہندو مہاسبھا میں وہ سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھے اور فرقہ وارانہ معاملات میں ان کی پالیسی کانگریس سے بالکل مختلف تھی۔ کانگریس سے انھیں وہ جذباتی تعلق تھا جو کسی شخص کو اس ادارے سے ہوا کرتا ہے جس سے شروع سے اس کا تعلق رہا ہو اور پھر یہ بھی تھا کہ جنگِ آزادی کی کشش انھیں اپنی طرف کھینچتی تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ملک میں کانگریس ہی

ایک ایسی جماعت ہے جو اس معاملے میں کوئی مؤثر کام کر رہی ہے۔ گویا ان کا دل تو اکثر کانگریس کے ساتھ ہوتا تھا۔ خصوصاً جب جنگ چھڑی ہوئی ہو۔ لیکن ان کا دماغ دوسروں کی طرف ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کے نفس میں ہمیشہ ایک کش مکش رہا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی وہ ایک وقت میں دو مخالف راستوں پر چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قومی معاملات میں ایک خلفشار پیدا ہو جاتا تھا۔ لیکن قوم پرستی خود ایک معجون مرکب ہے اور مالویہ جی خالص قوم پرست تھے۔ سماجی یا اقتصادی تبدیلیوں سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تمدنی۔ سماجی۔ اقتصادی ہر حیثیت سے قدیم دقیانوسی نظام کے حامی رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے والیان ریاست تعلقہ دار اور بڑے بڑے زمیندار انھیں بجا طور پر اپنا محسن اور مربی تصور کرتے ہیں۔ وہ صرف اتنی تبدیلی چاہتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ غیر ملکی قبضہ ہندوستان سے اٹھ جائے۔ ان کی نوجوانی کی سیاسی تربیت اور مطالعہ اب بھی ان کے دماغ پر حاوی ہے اور وہ بیسویں صدی کی دنیا کو جو جنگ عظیم کے بعد حرکت پسند اور انقلاب پذیر بن گئی، انیسویں صدی کے سکون پسند خیالات، ٹ۔ ہ گرین، جان اسٹوارٹ مل، گلیڈ اسٹون اور مارلے کی عینک سے تین چار ہزار سال پرانے ہندو تہذیب و تمدن کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ یہ ایک عجیب مخلوط اور متضاد نقطۂ نظر ہے لیکن مالوی جی کو اپنے اوپر پورا بھروسا ہے کہ وہ ہر قسم کے متضاد خیالات میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ مسلسل قومی خدمات جو ابتدائے عمر سے اب تک مختلف میدانوں میں انجام دیتے رہے ہیں، وہ غیر معمولی کامیابی جو انھیں ہندو یونیورسٹی جیسا زبردست قومی ادارہ قائم کرنے میں حاصل ہوئی، ان کا جوش اور خلوص،

ان کا کمال خطابت، ان کی نرمی اور بُردباری، ان کی دلکش شخصیت، ان تمام چیزوں نے مل کر ان کو ہندوستانی قوم خصوصاً ہندوؤں میں بہت محبوب اور مقبول بنا دیا ہے۔ ممکن ہے کہ بہت سے لوگ سیاسیات میں ان سے متفق نہ ہوں اور ان کی پیروی نہ کریں مگر سب ان کو محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ قومی کاموں کے طویل تجربے اور سن و سال کی بزرگی کے لحاظ سے وہ ہندوستانی سیاست کے پیر دانشمند سمجھے جاتے ہیں مگر خیالات کے لحاظ سے ذرا پُرانے ہو گئے ہیں اور جدید دنیا سے انھیں کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ان کی آواز اب بھی سب کو متوجہ کرتی ہے مگر ان کی باتیں بہت سے لوگ نہ سمجھتے ہیں نہ سنتے ہیں۔

غرض ایک قدرتی بات تھی کہ مالوی جی سوراج پارٹی میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ سیاسی معاملات میں وہ ان سے بہت آگے بڑھی ہوئی تھی اور اس میں کانگریس کی باضابطہ پیروی کی شرط تھی۔ وہ ایک ایسی پارٹی چاہتے تھے جو زیادہ اعتدال پسند ہو۔ اور سیاسی فرقہ وارانہ مسائل میں اتنی پابندیاں عائد نہ کرے۔ یہ سب صفات ان کی نئی پارٹی میں موجود تھیں جس کے وہ خود بانی اور رہبر تھے۔

البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لالہ لاجپت رائے اس نئی پارٹی میں کیوں شامل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بھی کسی حد تک اعتدال پسندی اور فرقہ پرستی کی طرف مائل تھے لیکن اسی سال گرمیوں میں، میں جنیوا میں ان سے ملا تھا۔ اور اس وقت ان کی گفتگو سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ سوراج پارٹی کے خلاف جہاد کرنے والے ہیں۔ مجھے اب بھی نہیں معلوم کہ یہ صورت کیسے پیدا ہوئی۔ لیکن انتخاب کے دوران میں انھوں نے چند مبہم الزامات کا ذکر کیا

جس سے یہ پتہ چلا کہ وہ کن خیالات کے چکر میں تھے۔ انھوں نے کانگریس کے لیڈروں پر یہ الزام لگایا کہ وہ بیرون ہند کے لوگوں سے ساز باز رکھتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ کابل میں کانگریس کی شاخ قائم کرنے کا مقصد یہی تھا۔ باوجودیکہ ان سے بارہا اصرار کیا گیا لیکن انھوں نے نہ کبھی اس الزام کی تفصیلات بتائیں اور نہ کوئی ثبوت پیش کیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب ہندوستان کے اخبارات میرے پاس سوئزرلینڈ پہنچے اور مجھے لالہ جی کے ان الزامات کا علم ہوا تو میں حیرت میں رہ گیا۔ سکریٹری کی حیثیت سے میں کانگریس کے تمام معاملات سے اچھی طرح واقف تھا۔ بلکہ کابل کی کمیٹی کا الحاق میں نے خود کرایا تھا (یہ تحریک اصل میں دیش بندھو داس کی تھی) بہرحال مجھے ان الزامات کی تفصیل نہ اس وقت معلوم تھی اور نہ اب معلوم ہے لیکن ان کی عام نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ محض بے بنیاد تھے معلوم نہیں لالہ جی کو کیونکر غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ممکن ہے انھوں نے مختلف افواہوں پر اعتبار کر لیا ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مولوی عبید اللہ کی گفتگو سے متاثر ہوئے حالانکہ میرے نزدیک اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن کونسلوں کا انتخاب عجیب و غریب ہے۔ اس میں انسان کے مزاج کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اس کا اخلاقی معیار بدل جاتا ہے۔ جوں جوں مجھے انتخابات کا تجربہ ہوتا جاتا ہے میری حیرت بڑھتی جاتی ہے اور مجھے ان سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہو گئی ہے جو جمہوریت کے منافی ہے۔

لیکن شخصیتوں سے قطع نظر، ملک میں فرقہ وارانہ حالات کی رفتار ایسی تھی کہ یوں بھی نیشنلسٹ پارٹی یا اسی قسم کی کسی دوسری پارٹی کا نمودار ہونا لازمی

تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے خوف تھا۔ دوسری طرف ہندو اس پر
مشتعل تھے کہ مسلمان ہم پر دھونس جماتے ہیں، ان میں سے بہتوں کو یہ شکایت تھی کہ
مسلمان ہم پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں اور دشمن سے مل جانے کی دھمکی دیکر
خاص مراعات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہندو مہاسبھا کو اسی وجہ سے اہمیت حاصل
ہوگئی کہ وہ ہندو قوم پرستی کی یعنی مسلم فرقہ پرستی کے مقابلے میں ہندو فرقہ پرستی
کی علمبردار تھی۔ مہاسبھا کی مخالفانہ کارروائیوں نے مسلم فرقہ پرستی میں اور شدت پیدا
کردی۔ اس طرح عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بندھ گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں
فرقہ پرستی کا دور دورہ ہوگیا۔ اصولاً یہ اکثریت اور ایک بڑی اقلیت کا مسئلہ
تھا۔ مگر عملی طور پر بعض صوبوں میں صورت حال بالکل برعکس تھی۔ مثلاً پنجاب اور
سندھ میں سکھ اور ہندو اقلیت میں تھے اور مسلمان اکثریت میں۔ لہذا مسلم
اقلیت کو بحیثیت مجموعی سارے ملک میں اکثریت سے جو خوف تھا وہی ان صوبوں
کی اقلیتوں کو ان سے تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہر فرقے کے اوسط طبقے
کے لوگوں کو جو نوکریوں کے بھوکے ہیں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں دوسرے فرقہ والے
انھیں نکال باہر نہ کردیں۔ اس کے علاوہ جو مستقل حقوق کے مالک ہیں انھیں،
کسی حد تک یہ خوف تھا کہ کوئی ایسا بنیادی تغیر نہ ہو جائے جس سے ان کے
ذاتی مفاد خطرے میں پڑ جائیں۔

سوراج پارٹی کو فرقہ پرستی کے اس فروغ سے بہت نقصان پہنچا۔ اسکے
بعض مسلم اراکین علیحدہ ہوگئے اور فرقہ وارانہ جماعتوں سے جا ملے۔ اسی طرح بعض
ہندو اراکین نیشنلسٹ پارٹی میں شریک ہوگئے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا
مالویہ جی اور لالہ جی کا اتحاد نہایت با اثر اور طاقتور ہوگیا تھا۔ لالہ جی کا پنجاب میں خاص
اثر تھا اور اس صوبے میں فرقہ پرستی کا سب سے زیادہ زور تھا۔ سوراج پارٹی یا

کانگریس کی طرف سے الکشن لڑانے کا سارا بوجھ والد پر آپڑا کیونکہ سی۔ آر۔ داس اب ان کا ہاتھ بٹانے کو موجود نہ تھے۔ والد کو لڑائی میں لطف آتا تھا یا کم سے کم اس سے گھبراتے نہیں تھے۔ بہرحال مخالفوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر انھوں نے بھی اپنا پورا زور لگا دیا۔ دونوں طرف سے خوب خوب چوٹیں چلیں۔ ایک نے دوسرے کے ساتھ کسی قسم کی رعایت اور مروت سے کام نہیں لیا۔ انتخاب کے بعد بھی اس کی تلخیاں ایک عرصے تک لوگوں کے دلوں سے نہیں گئیں۔

نیشلسٹ پارٹی کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی لیکن اس کامیابی نے اسمبلی کو سیاسی حیثیت سے بہت گرا دیا۔ اس کا پلہ اعتدال پسندی کی طرف جھک گیا۔ خود سوراج پارٹی کانگریس میں اعتدال پسند جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ پھر اپنی قوت بڑھانے کے خیال سے اس نے بہت سے مشتبہ لوگوں کو بھی داخل کر لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سیاسی وقار کو بہت صدمہ پہنچا۔ نیشلسٹ پارٹی نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا بلکہ اس سے بھی گرا ہوا چنانچہ اس نے خطاب یافتوں، بڑے بڑے زمینداروں، کارخانوں کے مالکوں اور دوسرے لوگوں کو جنھیں سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا اکٹھا کر کے اپنے آپ کو ایک عجیب معجون مرکب کر لیا۔

۱۹۲۶ء کے آخر میں ایک بڑا اندوہناک حادثہ پیش آیا جس نے سارے ہندوستان میں ہل چل ڈال دی۔ اس سے روشن ہو گیا کہ فرقہ پرستی کے جوش میں ہم کتنی ذلیل سے ذلیل حرکت کر سکتے ہیں۔ سوامی شردھانند بستر علالت پر پڑے تھے۔ اور ایسی حالت میں ایک مذہبی دیوانے نے انھیں قتل کر دیا۔ اس شخص کو جو گورکھوں کے رجمنٹ کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا، اور گولیوں کی بوچھار میں بڑھتا چلا گیا تھا۔ یہی موت نصیب ہونی تھی!

ابھی آٹھ سال پہلے آریہ سماجیوں کے اسی لیڈر نے جامع مسجد دہلی کے

منبر پر کھڑے ہو کر ہندو مسلمانوں کے زبردست مجمع کو اتحاد اور آزادی وطن کا پیغام سنایا تھا اور پورے مجمع نے "ہندو مسلمان کی جے" کے فلک شگاف نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور باہر سڑکوں پر ایک دوسرے کے دوش بدوش اپنا خون بہا کر اس نعرے پر مہر توثیق لگا دی تھی۔ آج وہ خود اپنے ہم وطن کے ہاتھوں مارا گیا جو یقیناً یہ سمجھتا ہوگا کہ یہ ثواب کا کام ہے اور وہ اس کی بدولت جنت میں جائے گا۔

میں ہمیشہ سے جسمانی دلیری کا معترف ہوں، اس دلیری کا جس کی بدولت انسان ایک اعلیٰ مقصد کے لئے مرتے دم تک جسمانی مصیبتیں برداشت کرتا ہے میرے خیال میں اور لوگ بھی اس کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں۔ سوامی شردھانند میں یہ دلیری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ان کا لانبا قد، گیروے کپڑوں میں لپٹا ہوا شاندار جسم، بڑھاپے کے باوجود تن کر چلنا آنکھوں سے شرارے نکلنا، دوسروں کی کمزوری کو دیکھ کر تیوری پر بل آجانا، یہ تصویر میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اور دل پر نقش ہے۔

(۳۴)

مظلوموں کا جلسہ برسلز میں

میں ۱۹۲۶ء کے آخر میں برلن آیا ہوا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظلوم قوموں کی ایک کانگریس برسلز میں ہونے والی ہے۔ یہ بات میرے دل کو لگی اور میں نے ہندوستان لکھ بھیجا کہ اگر ہماری کانگریس برسلز کی کانگریس میں باضابطہ طور پہ شرکت کرے تو اچھا ہے۔ میری تجویز پسند کی گئی اور میں اس کام کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کا نمائندہ مقرر کر دیا گیا۔

برسلز کی کانگریس شروع فروری ۱۹۲۷ء میں ہوئی معلوم نہیں کہ یہ خیال سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا تھا۔ برلن میں ان دنوں دوسرے ملکوں کے جلا وطن اور انتہا پسند جمع ہو گئے تھے اور یہ شہر اس معاملے میں پیرس کی برابری کر رہا تھا۔ اشتمالی (کمیونسٹ) بھی وہاں کثرت سے تھے۔ یہ خیال عام تھا کہ مظلوم قوموں میں آپس میں اتحاد عمل ہونا چاہیے اور انھیں مزدوروں کی انتہا پسند جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ یہ احساس روز بروز بڑھ رہا تھا کہ سب قوموں کا وہی ایک دشمن ہے جسے شہنشاہی کہتے ہیں اور سب کو جنگ آزادی میں اسی سے مقابلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ سلطنتیں جو نو آبادیوں پہ قابض ہیں یعنی انگلستان، فرانس، اطالیہ وغیرہ اس قسم کی کوششوں کی مخالف تھیں مگر جرمنی جنگ عظیم کے بعد سے نو آبادیوں سے محروم ہو گیا تھا اور وہاں کی حکومت دوسری سلطنتوں کی نو آبادیوں اور ماتحت ملکوں کی تحریک آزادی کو روا داری بلکہ ہمدردی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ یہ بھی ایک

وجہ تھی کہ برلن دوسرے ملکوں کے ترقی پسندوں اور حکومت کے مخالفوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں اور سرگرم چین کے لوگ تھے جو کومن ٹانگ کی انتہا پسند پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس پارٹی کا چین میں بڑا زور تھا اور قدیم جاگیرداری نظام کے حامی اس کے سیلاب میں بہے جا رہے تھے۔ اس نئی قوت سے شہنشاہی پسند سلطنتیں بھی دبتی تھیں اور انھیں زیادتیاں کرنے اور دھمکیاں دینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چین کے اتحاد اور آزادی کا مسئلہ کوئی دن میں حل ہوا چاہتا ہے۔ کومن ٹانگ کامیابی کے نشے میں مگن تھی مگر اسے معلوم تھا کہ ابھی اس کی راہ میں بہت سی مشکلیں حائل ہیں اس لئے وہ دوسری قوموں میں اپنے خیالات کا پرچار کرکے اپنی قوت بڑھانا چاہتی تھی۔ غالباً اس پرچار پر زور دینے والی اس جماعت کی انتہا پسند پارٹی تھی جو باہر کے اشتمالیوں کے ساتھ مل کر چینی قوم کا اثر دوسرے ملکوں میں اور اپنا اثر اپنے ملک اور اپنی جماعت میں بڑھانا چاہتی تھی ابھی یہ جماعت موجودہ زمانے کی طرح کئی فریقوں میں جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں تقسیم نہیں ہوئی تھی، اور بظاہر متحد نظر آتی تھی۔

اس لئے کومن ٹانگ کے نمائندوں نے جو یورپ میں موجود تھے مظلوم قوموں کی کانگرس کی تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ شاید انھیں نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ مل کر یہ تحریک اٹھائی تھی بعض اشخاص جو اشتمالی پارٹی کے تھے یا اس سے ملتے جلتے خیالات رکھتے تھے شروع سے اس تجویز کے مؤید تھے کہ مجموعی طور پر اشتمالی اس میں نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ امریکا کی لاطینی سلطنتوں (میکسیکو وغیرہ) نے بھی عملی مدد دی کیونکہ وہ ان دنوں ریاستہائے متحدہ امریکا کی معاشی شہنشاہی سے تنگ آ گئی تھیں۔ میکسیکو جس کا صدر ایک انتہا پسند شخص تھا، ریاستہائے متحدہ امریکا کے خلاف لاطینی امریکی قوموں کا جتھا بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے برسیلز کی کانفرنس سے

بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ باضابطہ طور پہ حکومت اس میں شریک نہیں کر سکتی تھی مگر اس نے اپنے ایک ممتاز ماہر سفارت کو بھیجا کہ وہ ایک ہمدرد تماشائی کی حیثیت سے کانگرس میں شریک ہو۔

اس کے علاوہ جاوا چینی ہند، فلسطین، شام مصر، عرب شمالی افریقہ اور افریقی حبشیوں کی قومی انجمنوں کے نمائندے بھی آئے تھے۔ مزدور جماعتوں کی انتہا پسند پارٹیوں نے بھی اپنے آدمی بھیجے تھے اور کئی مشہور و معروف اشخاص جو سالہا سال سے یورپ کے مزدوروں کی جدوجہد میں پیش پیش تھے، وہاں موجود تھے۔ بعض اشتمالی بھی کانگرس کی کارروائیوں میں اہم حصہ لے رہے تھے مگر وہ اشتمالیوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ مزدوروں کی انجمنوں کے نمائندے بن کر آئے تھے۔

جارج لینسبری کانگرس کے صدر منتخب ہوئے اور انھوں نے بڑی زور شور کی تقریر کی۔ یہ بجائے خود اس بات کا ثبوت تھا کہ کانگرس کوئی سرپھروں کا مجمع یا اشتمالیوں کی جماعت کا دُم چھلا نہیں ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جلسے کا برتاؤ اشتمالیوں کے ساتھ دوستانہ تھا اور بہت سے اختلافات کے باوجود بعض چیزوں میں ان کے ساتھ اتحاد عمل کی گنجائش نظر آتی تھی۔

مسٹر لینسبری نے اس مستقل ادارے کا صدر ہونا بھی منظور کر لیا جو انجمن مخالف شہنشاہی کے نام سے قائم کیا گیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ اپنی اس نا عاقبت اندیشی پہ پچھتائے یا شاید ان کے ساتھیوں یعنی برطانوی مزدور پارٹی والوں کے لیڈروں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ مزدور پارٹی ان دنوں پارلیمنٹ میں باضابطہ مخالف حکومت پارٹی تھی اور بہت جلد وزارت کے منصب پہ فائز ہونے والی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو جو آگے چل کر وزیر ہونے والے ہیں خطرناک انقلابی سیاست میں پھنسنا نہیں چاہیے۔ مسٹر لینسبری مصروفیت کا عذر کر کے انجمن کی صدارت

سے الگ ہو گئے بلکہ انھوں نے اس کی ممبری سے بھی استعفاد یدیا۔ اس شخص کو جس کی تقریر نے دو تین مہینے پہلے میرے دل کو لبھا لیا تھا، یکایک رنگ بدلتے دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔

پھر بھی "انجمن مخالف شہنشاہی" کے بڑے بڑے سرپرست موجود تھے جن میں آئن اشٹائن، امیڈم سن باٹ سین اور شامدروہیں رولان بھی تھے چند مہینے کے بعد آئن اشٹائن نے استعفا دیدیا اس لئے کہ وہ انجمن کی اس پالیسی کے مخالف تھے کہ وہ فلسطین کے عربوں اور یہودیوں کے جھگڑے میں عربوں کی حمایت کرتی ہے۔

بروسیلز کی کانگرس اور انجمن کی کمیٹیوں سے جو وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پہ ہوتی رہیں، مجھے نوآبادیوں اور ماتحت ملکوں کے بعض مسائل سمجھنے میں مدد ملی اور مغرب کے مزدوروں کے آپس کے جھگڑوں سے بھی پوری واقفیت ہو گئی۔ اخباروں اور کتابوں کے ذریعے مجھے ان کا تھوڑا سا حال پہلے سے معلوم تھا مگر یہ معلومات اوپری تھی اس لئے کہ لوگوں سے ذاتی تعلقات نہیں تھے۔ اب تعلقات پیدا ہو گئے اور کبھی کبھی ایسے مسئلوں سے سابقہ پڑنے لگا جن میں ان اندرونی جھگڑوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ دوسری اور تیسری بین الاقوامی انجمنوں میں مجھے تیسری کے ساتھ ہمدردی تھی۔ دوسری انجمن کی ساری کارروائیاں جو اس نے جنگ عظیم کے بعد کیں مجھے سخت مکروہ معلوم ہوتی تھیں۔ اور اس کی پشت پناہ، برطانوی مزدور پارٹی کی حرکتوں کا ہم ہندستانیوں کو اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ مجھے لازمی طور پہ اشتمالیت سے انس پیدا ہو گیا، اس لئے کہ اس میں چاہے جتنی خرابیاں ہوں مگر کم سے کم وہ ریاکاری سے اور شہنشاہی کی حمایت سے بری ہے۔ میں اصولی طور پہ اشتمالیت کا پیرو نہیں ہوا تھا۔ ابھی میں اس کی باریکیوں سے واقف نہیں تھا۔ صرف موٹی موٹی باتیں جانتا تھا اور یہ سب مجھے پسند آئیں۔ ان کے علاوہ روس میں جو زبردست

تغیرات ہو رہے تھے انھوں نے بھی مجھے اس طرف متوجہ کیا۔ البتہ اشتمالیوں کی ان حرکتوں سے مجھے اکثر کوفت ہوتی تھی۔ وہ اپنی بات زبردستی منوانا چاہتے ہیں۔ لڑنے پر اور بدتمیزی کی حرکتوں پر تلے رہتے ہیں اور جو ان کی رائے سے اختلاف کرے اس پر فوراً کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ غالباً مجھے یہ احساس بہ قول ان لوگوں کے اپنی "بورژوا" تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہوتا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ انجمن مخالف شہنشاہی کے جلسوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بحث میں، میں عموماً انگریز اور امریکی ممبروں کی طرف ہوتا تھا میری اور ان کی رائے کم سے کم طریق کار کے معاملے میں بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ ہم سب لمبی چوڑی خطیبانہ تحریکوں کو جو رزولیوشن نہیں بلکہ اعلان معلوم ہوتی تھیں ناپسند کرتے تھے ہم چاہتے تھے کہ تحریک سیدھے سادے مختصر الفاظ میں پیش کی جائے مگر یورپ کی روایات اس کے خلاف تھیں۔ اکثر اشتمالی اور غیر اشتمالی ممبروں میں اختلاف رائے ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہم کوئی سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ تھوڑے دن کے بعد ہم میں سے بعض لوگ اپنے اپنے وطن چلے آئے اور کمیٹی کے اور جلسوں میں شرکت نہیں کر سکے۔

بروسیلز کی کانگرس سے شہنشاہی پسند سلطنتوں کی نو آبادیات اور امور خارجہ کی وزارتیں ذرا گھبرائیں۔ "ابنگر" نے جو برطانوی وزارت خارجہ کا مشہور مصنف ہے اپنی ایک کتاب میں اس کا ذکر ہیجان خیز طریقے سے کیا ہے اور کہیں کہیں اس کی ہنسی بھی اڑائی ہے۔ غالباً خود کانگرس میں مختلف قوموں کے جاسوس موجود تھے یہاں تک کہ بعض نمائندے بھی خفیہ پولیس سے تعلق رکھتے تھے اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ میرے ایک امریکی دوست پیرس گئے ہوئے تھے۔ ان سے ایک فرانسیسی ملنے آیا جو وہاں کی خفیہ پولیس میں ملازم تھا۔ یہ محض دوستانہ ملاقات

تھی اور ان سے بعض معاملات کے متعلق کچھ پوچھنے کو آیا تھا جب وہ یہ باتیں دریافت کر چکا تو اس نے پوچھا کہ آپ نے مجھے پہچانا ہیں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں اور بہت دیر تک اسے بہت غور سے دیکھتا رہا مگر بالکل نہ پہچان سکا خفیہ پولیس والے نے کہا کہ آپ سے برسلز کی کانگرس میں ملاقات ہوئی تھی جہاں میں حبشیوں کے نمائندے کی حیثیت سے چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر سیاہ روغن مل کر گیا تھا۔

انجمن مخالف شہنشاہی کا ایک جلاس کولون میں ہوا جس میں میں بھی شریک تھا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد ہم سیکو اور ونیر سیٹی کی حمایت کے ایک جلسے میں شریک ہونے کے لئے ڈوسل ڈورف گئے جو کولون سے بہت قریب ہے۔ ہم اس جلسے سے واپس آرہے تھے کہ رستے میں پولیس نے ٹوکا اور کہا کہ اپنے پاسپورٹ دکھاؤ اکثر لوگوں کے پاس پاسپورٹ موجود تھے مگر میں اپنا پاسپورٹ کولون کے ہوٹل میں چھوڑ آیا تھا اس لئے کہ ڈوسل ڈورف صرف چند ہی گھنٹے قیام کا قصد تھا۔ میں حراست میں پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اس مصیبت میں ایک انگریز اور اس کی بیوی بھی میرے ساتھ تھے ہمیں کوئی ایک گھنٹہ وہاں ٹھہرنا پڑا۔ اس اثنا میں غالباً ٹیلیفون سے پوچھ گچھ کی گئی جس کے بعد پولیس کے افسر نے ہمیں از راہ عنایت جانے کی اجازت دی۔

آگے چل کر انجمن مخالف شہنشاہی کا رجحان اشتمالیت کی طرف اور بڑھ گیا مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نے اپنا علیحدہ رنگ قائم رکھا۔ میرا تعلق اس سے صرف خط و کتابت کے ذریعے باقی تھا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں اس عارضی صلح میں شرکت کی وجہ سے جو حکومت ہند اور کانگرس کے درمیان ہوئی تھی یہ انجمن مجھ سے بہت خفا ہو گئی اور اس نے مجھے ایک دم سے ذات باہر کر دیا یعنی ایک رزولیوشن کے ذریعے میرا نام اپنے ممبروں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ

اس کے لئے اشتعال کی بہت بڑی وجہ تھی مگر اس نے مجھے صفائی کا موقع تو دیا ہوتا۔

۱۹۲۷ء کی گرمیوں میں میرے والد یورپ تشریف لائے میں ان سے وینس میں ملا اور اس کے بعد کئی مہینے تک میں ان کا اکثر ساتھ رہا ہم سب یعنی والد، بیوی، بہن اور میں مل کر چند روز کے لئے ماسکو نومبر میں گئے تاکہ سوویٹ کی دسویں سالگرہ کے جشن میں شریک ہوں۔ یہ سفر بہت تھوڑے دن کا تھا اور بہت تنگ وقت میں طے ہوا تھا مگر ہم سب کو وہاں جاکر خوشی ہوئی اس لئے کہ یہ ذراسی جھلک بھی فائدے سے خالی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنے سے وقت میں ہمیں جدید روس کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکی مگر اتنا ضرور ہوا کہ ہم اس کے متعلق جو کچھ پڑھتے تھے اسے سمجھنے لگے میرے والد کے لئے یہ اجتماعی اصول بالکل انوکھے تھے۔ ان کی ساری ذہنی تربیت قانون اور آئین کی فضا میں ہوئی تھی اور ان کے لئے اس فضا سے نکلنا سہل نہ تھا مگر انھوں نے جو کچھ ماسکو میں دیکھا اس کا ان پر یقیناً اثر ہوا۔

ہم ماسکو میں تھے کہ سائمن کمیشن کے تقرر کا پہلی بار اعلان کیا گیا ہم نے یہ خبر ماسکو کے ایک جریدے میں پڑھی۔ چند روز کے بعد والد پریوی کونسل کے ایک مقدمے میں پیروی کر رہے تھے اور سر جان سائمن ان کے رفیق تھے۔ یہ ایک پرانا زمینداری کا مقدمہ تھا جس میں ابتدائی منزلوں میں میں خود بھی پیروی کر چکا تھا۔ مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر سر جان سائمن کی خواہش سے میں بھی ایک بار ان کے دفتر میں والد کے ساتھ گیا اور مشورے میں شریک ہوا۔

۱۹۲۷ء ختم ہونے پر تھا اور ہمارا یورپ کا قیام بہت طول کھینچ چکا تھا

غالباً اگر والد یورپ نہ آئے ہوتے تو ہم پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو جاتے ہمارا قصد تھا کہ واپسی میں کچھ دن جنوبی مشرقی یورپ، ترکی اور مصر میں رہیں مگر اب اس کا وقت نہیں رہا تھا۔ اس لیے کہ میری بڑی خواہش تھی کہ کانگرس کے اجلاس میں جو کرسمس کے زمانے میں مدراس میں ہونے والا تھا شرکت کروں شروع دسمبر میں میں اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کے ساتھ مارسیلز سے کولمبو روانہ ہو گیا۔ میرے والد نے یورپ میں تین مہینے اور قیام کیا۔

(۲۴)

ہندوستان کی واپسی اور سیاست کی منجدھار میں دوبارہ کودنا

میں یورپ سے جسمانی اور دماغی حیثیت سے تازہ دم ہو کر لوٹا تھا میری بیوی کو پوری صحت تو نہیں ہوئی تھی مگر پہلے سے بہت اچھی تھیں اس لئے میں ان کی طرف سے بھی مطمئن تھا میری رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا اور اندرونی کشمکش اور ناکامی کا احساس جو پہلے رہا کرتا تھا اس وقت بالکل نہیں تھا میری نظر اب زیادہ وسیع ہو چکی تھی اور محض قومیت کا عقیدہ مجھے محدود اور ناکافی معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سیاسی آزادی بے شک بہت ضروری چیز ہے مگر یہ راہ راست کا صرف پہلا ہی قدم ہے۔ بغیر سماجی آزادی اور حکومت اور معاشرت کی تنظیم کے فرد کچھ زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب عالمگیر مسائل اور معاملات کو پہلے سے بہتر سمجھتا ہوں اور اس زمانے کی دنیا کو جو نت نئے رنگ بدلتی ہے نظر جما کر دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے اس عرصے میں نہ صرف موجودہ سیاسی معاملات بلکہ ان علمی اور تمدنی مسائل کے متعلق بھی جن سے مجھے دلچسپی تھی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ مجھے ان عظیم الشان سیاسی، معاشی اور تمدنی تغیرات کے مطالعے میں بہت لطف آتا تھا جو یورپ اور امریکا میں واقع ہو رہے تھے۔ سوویٹ روس بعض ناگوار پہلوؤں کے باوجود مجھے پسند تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے لئے امید کا پیام لایا ہے۔ یورپ اس زمانے میں ایک حد تک امن و امان سے بسر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ زبردست کساد بازاری جو آج

کُل چھائی ہوئی ہے اس وقت تک رونما نہیں ہوئی تھی مگر میں یہ خیال دل میں لے کر آیا تھا کہ یہ امن و سکون محض عارضی ہے اور بہت جلد یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں زبردست تغیرات اور حادثات ہونے والے ہیں۔

میں سمجھتا تھا کہ اس وقت سب سے ضروری کام یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کو ان عالمگیر واقعات کی خبر دیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کے لئے تیار رہیں۔ یہ تیاری زیادہ تر ذہنی حیثیت سے ہونی چاہیئے۔ سب سے پہلے تو اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں رہنا چاہیئے کہ ہماری منزل مقصود کامل سیاسی آزادی ہے، یہ قطعی طور پر طے ہو جائے کہ کامل آزادی ہمارا واحد مقصد ہے، اور اس میں اور "درجۂ نو آبادیات" کے مبہم اور الجھے ہوئے فقرے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی کے ساتھ سماجی مقصد کا تعین ہونا بھی ضروری تھا میرا خیال تھا کہ ابھی کانگرس سے اس معاملے میں زیادہ دور تک قدم بڑھانے کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ کانگرس ایک خالص سیاسی قومی جماعت ہے اور قومیت کے خیال کے سوا کسی اور طرز خیال سے آشنا نہیں ہے۔ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ اس بحث کی ابتدا کر دی جائے۔ ہاں کانگرس کے باہر مزدوروں کے حلقوں میں اور نوجوانوں میں البتہ یہ چیز آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اسی لئے میں چاہتا تھا کہ کانگرس میں عہدہ قبول نہ کروں اور ایک دھندلا سا خیال یہ بھی تھا کہ چند مہینے شہروں سے دور دیہات میں جا کر رہوں اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کروں مگر یہ ان ہونی بات تھی اور واقعات کی کشش مجھے پھر کانگریسی سیاست کی منجدھار میں کھینچ کر لانے والی تھی۔

مدراس پہنچتے ہی میں اس بھنور میں پڑ گیا۔ میں نے ورکنگ کمیٹی میں کئی تحریکیں پیش کیں جن میں کامل آزادی، خطرۂ جنگ، انجمن مخالف شہنشاہی سے اتحاد عمل کے ریزولیوشن بھی تھے۔ یہ سب ریزولیوشن منظور ہو گئے اور ورکنگ کمیٹی کی باضابطہ تحریکوں میں شامل کر لئے گئے۔ میں نے انھیں کانگرس کے کھلے اجلاس میں پیش

کیا اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ سب کے سب بہ اتفاق رائے پاس ہو گئے۔ کامل آزادی کے رزولیوشن کی تائید مسز بیسنٹ تک نے کر ڈالی۔ ہر طرف سے مدد ملنا بڑی خوشی کی بات تھی۔ مگر میرے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ یا تو لوگوں نے ان رزولیوشنوں کو اچھی طرح سمجھا نہیں یا انھیں توڑ مروڑ کر کچھ اور معنی پہنا لئے۔ کانگرس کے اجلاس کے تھوڑے ہی دن بعد یہ حقیقت کھل گئی اور کامل آزادی کے رزولیوشن کی تاویلیں کی جانے لگیں۔

میری یہ تحریکیں کانگرس کی معمولی تحریکوں سے مختلف تھیں۔ ان سے ایک نئے طرز خیال کا اظہار ہوتا تھا۔ بہت سے کانگریسی انھیں یقیناً پسند کرتے تھے بعض کچھ مخالف بھی تھے مگر اس حد تک نہیں کہ مخالفت کا اظہار کریں غالباً ان حضرات کا خیال تھا کہ محض نظری تحریکیں ہیں جن سے نہ کوئی فائدہ ہے نہ نقصان اور ان سے پیچھا چھڑانے کی سب سے اچھی ترکیب یہی ہے کہ انھیں پاس کر کے آگے بڑھیں اور ان معاملات پر غور کریں جو واقعی اہمیت رکھتے ہیں۔ غرض کامل آزادی کا رزولیوشن اس وقت تک محض ایک عام جذبے کا اظہار تھا جو روز بروز بڑھ رہا تھا۔ البتہ دو ایک سال بعد اس نے کانگرس کے اہم اور پر زور مطالبے کی حیثیت اختیار کر لی۔

گاندھی جی مدراس میں موجود تھے اور کانگرس کے کھلے اجلاس میں شریک ہوئے مگر انھوں نے پالیسی کی تشکیل میں حصہ نہیں لیا۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہونے کے باوجود وہ اس کے جلسوں میں نہیں آئے۔ جب سے سوراج پارٹی کا زور ہوا انھوں نے کانگریس میں یہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا مگر ان سے اکثر مشورہ لیا جاتا تھا اور کوئی اہم کارروائی بغیر ان سے کیے ہوئے نہیں کی جاتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ جو تحریکیں میں نے کانگرس میں پیش کیں وہ انھیں کہاں تک پسند آئیں۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے ان کو ناپسند کیا ہوگا۔ ان کے مضمون کی وجہ سے نہیں بلکہ اس طرز خیال کی وجہ سے

جو ان سے ظاہر ہوتا تھا۔ مگر انھوں نے کبھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ میرے والد تو جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یورپ گئے ہوئے تھے۔

کامل آزادی کے رزولیوشن کا بے اثر ہونا کانگریس کے اسی اجلاس میں ظاہر ہو گیا جب کہ ایک اور ریزولیوشن کے ذریعے سائمن کمیشن کی مخالفت اور بائیکاٹ کا اعلان اور اسی کے ساتھ یہ تجویز کی گئی کہ ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جائے جو ہندوستان کے لئے ایک دستور اساسی مرتب کرے۔

یہ ظاہر تھا کہ اعتدال پسند جماعت جس سے تعاون کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، کامل آزادی کا تصور ہی نہ کر سکتی تھی۔ ان کی پہنچ زیادہ سے زیادہ درجہ نو آبادیات تک تھی۔

میں دوبارہ کانگریس کا سکریٹری بن گیا اس میں کچھ تو شخصی اثر تھا یعنی میرے پرانے اور عزیز دوست ڈاکٹر انصاری صدر کانگریس کا اصرار، اور کچھ یہ خیال تھا کہ میرے پیش کئے ہوئے متعدد رزولیوشن منظور ہو گئے ہیں اس لئے مجھے خود ہی انہیں عمل میں لانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کے رزولیوشن نے میری تحریکوں کے اثر کو کسی حد تک زائل کر دیا تھا مگر پھر بھی بہت کچھ باقی تھا۔ لیکن میرے عہدہ قبول کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کانگریس آل پارٹیز کے ذریعے یا کسی اور اثر سے اعتدال اور سمجھوتے کی پالسی نہ اختیار کرلے ان دنوں وہ کچھ ڈگمگا رہی تھی۔ کبھی اس سرے پر جھک جاتی تھی کبھی اس سرے، میں چاہتا تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے اسے اعتدال پسندی کی طرف نہ لوٹنے دوں اور کامل آزادی کے مقصد کو برقرار رکھوں۔

نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ہمیشہ کچھ ضمنی جلسے بھی ہوا کرتے ہیں چنانچہ مدراس میں ان دنوں جمہوریت پسندوں کی کانفرنس کا پہلا اور آخری اجلاس



ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ہوا اور مجھ سے اس کی صدارت کی فرمائش کی گئی۔ میں بھی اپنے آپ کو جمہوریت پسند سمجھتا تھا اور مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ مگر صدارت قبول کرنے میں مجھے تامل تھا اس لئے کہ یہ نہیں معلوم تھا، اس نئی تحریک کے چلانے والے کون ہیں اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا تعلق کسی ایسی چیز سے ہو جو برساتی مینڈک کی طرح چند روز میں ختم ہو جائے۔ میں نے صدارت تو کرلی مگر بعد میں پچھتانا پڑا۔ اس لئے اور بہت سی انجمنوں کی طرح یہ کانفرنس بھی پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ کئی مہینے تک میں کوشش کرتا رہا کہ اس میں جو رزولیوشن پاس ہوئے تھے ان کا پورا مضمون معلوم ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں میں کچھ عجیب بات ہے کہ نئے نئے کام شروع کرتے ہیں اور پھر انھیں چھوڑ چھاڑ الگ ہو جاتے ہیں۔ ہم پر جو بے استقلالی کا اعتراض کیا جاتا ہے اس میں بہت کچھ اصلیت ہے۔

ابھی کانگرس کا اجلاس ختم نہیں ہوا تھا کہ دہلی سے حکیم اجمل خاں صاحب کے انتقال کی خبر آئی۔ وہ کانگرس کے سابق صدر تھے اور اس کے بوڑھے مدبروں میں شمار کئے جاتے تھے مگر ان میں ایک اور بات بھی تھی جس کی وجہ سے وہ کانگرس کے تمام لیڈروں میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ انھوں نے بالکل قدیم طرز کی تعلیم و تربیت پائی تھی جس میں جدید رنگ کو ذرا بھی دخل نہ تھا اور وہ سر سے پیر تک دلی کی شاہی زمانے کی تہذیب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے شستہ اور پاکیزہ اخلاق کو دیکھ کر انھیں ٹھہر ٹھہر کر دھیمی آواز سے گفتگو کرتے ہوئے اور سوکھے منہ سے مذاق کے جملے کہتے ہوئے سن کر دل خوش ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے اخلاق و آداب کے لحاظ سے پرانے طرز کے رئیس تھے۔ ان کی وضع قطع اور طرز و روش میں شاہانہ وقار کی شان تھی اور ان کا چہرہ بھی مغل بادشاہوں کی تصویر سے بہت مشابہ تھا۔ ایسے لوگ عموماً سیاست کی چپقلش میں نہیں پڑا کرتے۔ اور ہندوستان میں انگریز جب

نئی نسل کے شورش پسندوں سے، پریشان ہوتے ہیں تو ان بزرگوں کو یاد کیا کرتے
ہیں حکیم صاحب کو بھی ابتدا میں سیاست سے سروکار نہ تھا۔ وہ حکیموں کے ایک مشہور
خاندان کے سردار تھے اور انھیں اپنے عظیم الشان مطب سے فرصت نہیں ملتی تھی
مگر آخر عمر میں جنگ عظیم کے حادثات نے اور ان کے پرانے دوست اور رفیق کار ڈاکٹر
مختار احمد انصاری کے اثر نے انھیں کانگرس کی طرف مائل کر دیا۔ اس کے بعد کے
واقعات خصوصاً پنجاب کے مارشل لا اور تحریک خلافت نے ان کے دل پر بہت گہرا
اثر ڈالا اور انھیں گاندھی جی کا نیا طریق کار یعنی ترک موالات پسند آگیا۔ انھوں نے اپنی
قابل قدر صفات اور نایاب جوہر سے کانگرس کو مالا مال کر دیا اور ان کی ذات پرانی
اور نئی روشنی کے لوگوں کے درمیان رابطے کا کام دینے لگی۔ ان کے اثر سے قدیم
رنگ کے بزرگ بھی قومی تحریک کے حامی بن گئے اور ان کی بدولت قدیم اور
جدید عناصر گھل مل گئے اور قومیت کے ہر اولوں میں ضبط اور متانت کی شان
پیدا ہو گئی۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا۔
کیونکہ دونوں ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی مثال سے متاثر تھے۔ گاندھی جی
انھیں اپنا سچا دوست جانتے تھے، ان پر دل سے اعتماد کرتے تھے اور ہندو مسلمانوں
کے تعلقات کے بارے میں ان کی رائے کو قول فیصل سمجھتے تھے۔ میرے والد اور
حکیم صاحب کو ایک دوسرے سے فطری طور پر انس تھا۔

پچھلے سال ہندو مہاسبھا کے بعض لیڈروں نے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ میں
ہندوؤں کے جذبات سے ناواقف ہوں، اس لئے کہ میری تعلیم بہت ناقص ہے
اور "فارسی" تہذیب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے
کہ مجھ میں کوئی تہذیب بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کونسی تہذیب ہے۔ فارسی
زبان سے تو بدقسمتی سے میں بالکل ناواقف ہوں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ میرے والد

نے ہندی ایرانی تہذیب کی فضا میں پرورش پائی تھی جو دلی کے قدیم دربار کی یادگار ہے اور جس کے مرکز اس گئے گذرے زمانے میں بھی دلی اور لکھنؤ سمجھے جاتے ہیں۔ کشمیری برہمنوں کو زمانے کا رنگ اختیار کرنے میں خاص ملکہ ہے۔ جب وہ ہندوستان کے میدانوں میں آئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہاں ہندی ایرانی تہذیب کا دور دورہ ہے تو وہ اسی طرف ڈھل گئے اور ان میں کثرت سے فارسی اور اردو کے اچھے اچھے ادیب پیدا ہوئے۔ آگے چل کر جب انگریزی سیکھنے اور مغربی تہذیب کی ابتدائی چیزیں اختیار کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ اتنی ہی تیزی سے اس نئے سانچے میں ڈھل گئے۔ مگر اب بھی ہندوستان کے کشمیریوں میں بڑے بڑے فارسی داں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر میں سر تیج بہادر سپرو اور راجہ نریندر ناتھ کا نام پیش کرتا ہوں۔

غرض حکیم صاحب اور میرے والد میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ بلکہ انھوں نے برادری کے پرانے رشتے بھی ڈھونڈھ نکالے تھے۔ ان میں بڑی دوستی ہوگئی اور ایک دوسرے کو بھائی صاحب کہنے لگے۔ منجملہ بہت سے رابطوں کے دونوں میں ایک چھوٹا سا رابطہ سیاسی خیالات کا بھی تھا۔ حکیم صاحب کی خانگی زندگی بالکل قدیم طرز کی تھی۔ وہ خود یا ان کے خاندان والے پرانے ڈھرّے کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جتنا سخت پردہ ان کے یہاں تھا میں نے کسی کے یہاں نہیں دیکھا حالانکہ حکیم صاحب کو دل سے یقین تھا کہ عورتوں کی آزادی کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ ایکبار انھوں نے مجھ سے اس مسئلے پر گفتگو کی اور فرمایا کہ ترکی عورتوں نے آزادی کی جنگ میں جو کام کیا اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ مصطفےٰ کمال پاشا کو جو کامیابی ہوئی وہ زیادہ تر ترکی عورتوں ہی کی بدولت ہوئی۔

حکیم صاحب کے انتقال سے کانگریس کو بہت سخت صدمہ پہنچا اور اُن کا

ایک بڑا زبردست حامی اُٹھ گیا۔ اس کے بعد سے ہم سب جب دلی جاتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شہر میں وہ بات نہیں رہی۔ اس لئے کہ دلی کے نام کے ساتھ ہمارے ذہن میں حکیم صاحب اور ان کے بلی ماروں والے مکان کی تصویر بسی ہوئی ہے۔

سنہ ۱۹۲۸ء سیاسی اعتبار سے بڑی مصروفیت کا سال تھا اور سارے ملک میں ایک ہل چل سی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے دل میں ایک نئی امنگ ہے جو انہیں آگے بڑھائے لئے جاتی ہے ایک نئی لہر ہے جو ایک سرے سے تمام مختلف جماعتوں میں دوڑی ہوئی ہے۔ غالباً اس طویل مدت میں جب میں باہر گیا ہوا تھا۔ یہ تبدیلی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ میں نے واپس آکر دیکھا تو مجھے بہت بڑا فرق معلوم ہوا۔ سنہ ۱۹۲۶ء کے شروع تک ہندوستان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غالباً ملک اس کشمکش سے جو سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک رہی اچھی طرح سنبھلنے نہیں پایا تھا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں وہ تازہ دم، مستعد اور دبے جوش سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہر جگہ اس کے آثار نظر آتے تھے: مزدوروں میں، کاشتکاروں میں، اوسط طبقے کے نوجوانوں میں اور عموماً تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں۔

ٹریڈ یونین کی تحریک بہت ترقی کر گئی تھی اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کو جسے قائم ہوئے صرف سات آٹھ سال ہوئے تھے، اتنے ہی دن میں بہت قوت حاصل ہو گئی تھی اور وہ ہر قسم کے مزدوروں کی نمائندگی کرنے والی جماعت بن گئی تھی۔ ممبروں کی تعداد یا تنظیم کے لحاظ سے تو اس نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی تھی مگر اس کے خیالات میں انتہا پسندی اور جنگجوئی آ گئی تھی۔ ہڑتالیں اکثر ہوتی تھیں اور مزدوروں میں اپنے طبقے کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ سب سے اچھی تنظیم کپڑے کی صنعت اور ریلوے کے مزدوروں کی تھی۔ ان میں سب سے قوی اور ترقی یافتہ انجمنیں بمبئی کی گرنی کامگار یونین اور جی آئی پی ریلوے یونین تھیں۔ مزدوروں کی تنظیم کی نشو و نما

کے ساتھ مغرب سے اندرونی جھگڑوں اور آپس کی تفریق کا بیج یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ ابھی ہندوستان کی ٹریڈ یونین کی تحریک اچھی طرح قدم بھی نہیں جمانے پائی تھی کہ یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ وہ ٹوٹ کر الگ الگ جتھوں میں تقسیم ہوجائے گی۔ بعض لوگ دوسری بین الاقوامی انجمن کے پیرو تھے، بعض تیسری کے، بعض اصلاح اور اعتدال کو پسند کرتے تھے اور بعض کھلم کھلا انقلاب کے حامی تھے اور ایک سرے سے ہر چیز کو بدلنا چاہتے تھے۔ ان کے بین بین خیالات کے بہت سے درجے تھے اور بدقسمتی سے جیسا کہ عام تحریکوں میں ہوا کرتا ہے بہت سے ابن الوقت بھی موجود ہیں۔

کسانوں میں بھی حرکت نظر آتی تھی اور صوبجات متحدہ خصوصاً اودھ میں زیادہ نمایاں تھی۔ یہاں جا بجا کسانوں کے احتجاج کے جلسے آئے دن ہوا کرتے تھے۔ لوگوں کو یہ محسوس ہوگیا تھا کہ نئے قانون لگان سے، جس میں کسانوں کو حین حیاتی لگان داری کا حق دیا گیا تھا اور ان سے بہت کچھ وعدے کئے گئے تھے، ان کی حالت زار میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ گجرات میں جہاں رعیت واری طریقہ جاری ہے اور حکومت کو براہ راست کاشتکاروں سے سابقہ پڑتا ہے، مال گذاری بڑھانے کی وجہ سے حکومت اور کسانوں میں بہت بڑے پیمانے پر لڑائی چھڑی ہوئی تھی یہ بردولی کی ستیاگرہ کی تحریک تھی جو سردار ولبھ بھائی پٹیل کی سرکردگی میں اٹھائی گئی تھی۔ جس آن بان سے یہ تحریک چلائی گئی اس کی تعریفوں سے سارا ملک گونج رہا تھا۔ بردولی کے کسانوں کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی مگر ان کی اصلی کامیابی یہ تھی کہ ان کے اس معرکے کا اثر سارے ہندوستان کے کسانوں پر پڑا۔ بردولی کا نام ہندوستانی کسانوں کے لئے امید اور تقویت کا نشان اور فتح کا شگون بن گیا۔

سنہ ۱۹۲۸ء کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس سال نوجوانوں کی

تحریک نے نشو و نما پائی۔ ہر جگہ نوجوان سبھائیں قائم کی جا رہی تھیں اور نوجوانوں کی کانفرنسیں ہو رہی تھیں۔ یہ جماعتیں مختلف قسم کی تھیں اور ان میں نیم مذہبی انجمنوں سے لے کر اشتراکی انجمنیں تک شامل تھیں جن میں انقلابی خیالات اور طریقوں پر بحث کی جاتی تھی۔ مگر ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد چاہے جو کچھ بھی ہوں جب نوجوان ان میں جمع ہوتے تھے تو خود بخود زمانے کے اہم سماجی اور معاشی مسائل کی گفتگو چھڑ جاتی تھی جس کا رجحان عموماً یہی ہوتا تھا کہ سارا نظام ایک سرے سے بدل دیا جائے۔

خالص سیاسی نقطۂ نظر سے اس سال کی اہمیت سائمن کمیشن کے بائیکاٹ اور آل پارٹیز کانفرنس کی وجہ سے تھی جسے لوگ بائیکاٹ کا تعمیری پہلو کہتے تھے۔ اس میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ جہاں کہیں کمیشن جاتا تھا مخالفوں کا مجمع "سائمن گو بیک" کے نعرے لگاتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے کروڑوں باشندے سر جان سائمن کے نام سے اور انگریزی زبان کے دو الفاظ سے جن کے سوا وہ اور کوئی لفظ نہیں جانتے ہیں واقف ہو گئے۔ کمیشن کے ممبروں کو یہ الفاظ بھوت بن کر ستاتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک بار یہ لوگ نئی دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ رات کے اندھیرے میں یہ آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ انھیں بہت برا معلوم ہوا کہ لوگ رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔ مگر اصل میں یہ آواز جس نے ان کے آرام میں خلل ڈالا گیدڑوں کی آواز تھی جن سے شہنشاہی دارالسلطنت کے لق و دق میدان بھرے رہتے تھے۔

آل پارٹیز کانفرنس کو دستور اساسی کے اہم اصول طے کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ایک عمومی پارلیمنٹری حکومت کا نظام بنانا تھا جو ہر شخص بنا سکتا تھا مشکل اصل میں ایک ہی تھی یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ یا اقلیتوں کا مسئلہ اور چونکہ کانفرنس میں تمام کٹر فرقہ پرست انجمنوں کے نمائندے موجود تھے اس لئے اس مسئلے کا حل

کرنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا جو ناکام اتحاد کانفرنسوں میں پیش آچکا تھا۔ میرے والد نے جو موسم بہار میں انگلستان سے واپس آگئے تھے اس کانفرنس میں بہت بڑا حصہ لیا۔ جب اور کوئی تدبیر نہ چلی تو آخر میں ایک چھوٹی سی کمیٹی والد کی صدارت میں بنادی گئی کہ دستور اساسی مرتب کرے اور فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق مفصل رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی کو لوگ نہرو کمیٹی کہنے لگے اور وہ رپورٹ جو اس نے آگے چل کر پیش کی نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ سر تیج بہادر سپرو بھی اس کمیٹی کے رکن تھے اور رپورٹ کا ایک حصہ انھوں نے لکھا تھا۔

میں اس کمیٹی کا ممبر نہیں تھا مگر کانگریس کے سکرٹری کی حیثیت سے مجھے اس سے بہت کچھ تعلق تھا۔ میرے لئے بڑی مشکل تھی اس لئے کہ میرے نزدیک اصل مسئلہ قوت حاصل کرنے کا تھا اور دستور اساسی کے مفصل مسودوں سے کاغذ کے صفحے سیاہ کرنا محض بیکار تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ تیج میل کمیٹی ہمارے مقصد کو محدود کرنے پر تلی ہوئی تھی، اس نے جو مقصد قرار دیا تھا وہ نوآبادیات کا درجہ کہلاتا تھا مگر اصل میں اس سے بھی کم تھا۔ میرے خیال میں کمیٹی کی حقیقی اہمیت یہ تھی کہ اس کے ذریعے سے فرقہ وارانہ گتھی کے سلجھنے کا امکان تھا۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ یہ مسئلہ کسی معاہدے یا سمجھوتے کے ذریعے قطعی طور پر حل ہو جائے گا کیونکہ قطعی حل کی صورت تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کی توجہ سماجی اور معاشی مسئلوں کی طرف پھیر دی جائے مگر اس کا امکان تھا کہ کوئی عارضی معاہدہ ہی ہو جائے اور ایسے لوگوں کی ایک معقول تعداد مان لے تو کسی قدر سکون کی حالت ہو جائے گی اور لوگوں کی توجہ دوسرے مسئلوں کی طرف ہو سکے گی۔ اس لئے میں نے کمیٹی کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی بلکہ جہاں تک ہو سکا، اس کی مدد کی۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کوشش میں کامیابی ہوا ہی چاہتی ہے۔ صرف

دو تین باتیں طے ہونے کو باقی تھیں اور ان میں واقعی اہمیت، صرف پنجاب کا مسئلہ رکھتا تھا جہاں ہندو مسلمان سکھ کی سہ رُخی لڑائی ہو رہی تھی۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں پنجاب کے مسئلے پر ایک نئے پہلو سے نظر ڈالی اور اپنی سفارشوں کی تائید میں آبادی کی تقسیم کے اعداد و شمار پیش کئے۔ مگر یہ ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں ہر فریق کے دل میں ڈر اور شبہ بیٹھا ہوا تھا اور ایک قدم جو منزل مقصود تک پہنچنے میں باقی تھا کسی سے نہیں اٹھاتے بنا۔

آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کی غرض سے لکھنؤ میں منعقد ہوا ہم چند آدمی پھر دوہری مشکل میں پڑ گئے ہم یہ چاہتے تھے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ ہوتا ہو تو اس میں روڑے اٹکائیں، لیکن کامل آزادی کے مقصد کو چھوڑنا ہمیں کسی طرح گوارا نہ تھا ہم نے یہ التجا کی کہ کانفرنس اس مسئلے کو یوں ہی رہنے دے تاکہ ہر جماعت اس خاص معاملے میں جو روش چاہے اختیار کرے۔ کانگرس کامل آزادی پہ جمی رہے اور اعتدال پسند جماعتیں "نوآبادیات کے درجے" پر مگر میرے والد رپورٹ کو منوانے پر تلے ہوئے تھے اور اپنی جگہ سے ایک قدم ہٹنا نہیں چاہتے تھے اور نہ ان حالات میں ہٹ سکتے تھے چنانچہ کامل آزادی کے حامیوں نے جو وہاں بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، مجھ سے فرمائش کی کہ ان کی طرف سے کانفرنس میں اعلان کر دوں کہ ہم لوگ کسی ایسی چیز سے واسطہ نہیں رکھنا چاہتے جس سے کامل آزادی کے مقصد میں بٹہ لگتا ہو مگر اسی کے ساتھ ہم نے اس بات کو صاف کر دیا کہ ہم کانفرنس کی راہ میں روڑے اٹکانا نہیں چاہتے تاکہ فرقہ وارانہ تصفیئے میں دقت نہ ہو۔

اتنے بڑے معاملے میں یہ طرزِ عمل کچھ موثر نہ تھا اور زیادہ سے زیادہ نفی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں اثبات کا رنگ پیدا کرنے کے لئے ہم نے اسی دن

"انجمن آزادی ہند" کی بنا ڈال دی۔

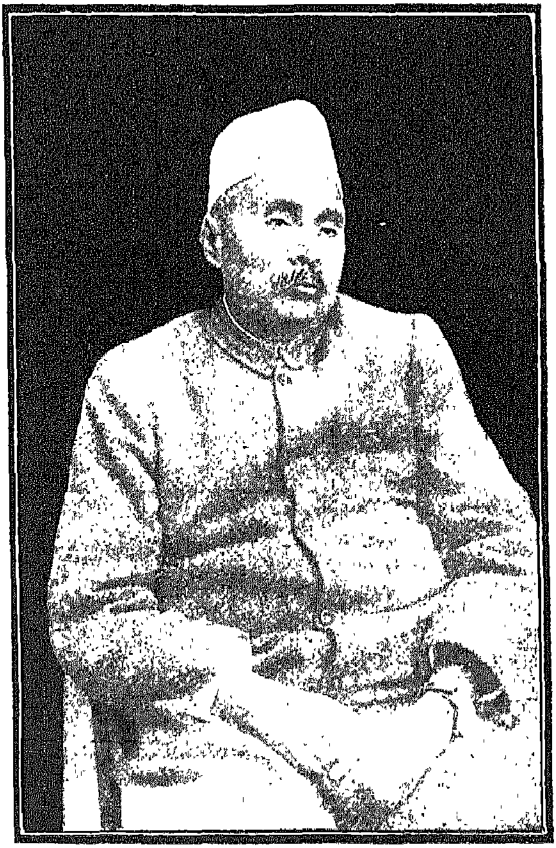
آل پارٹیز کانفرنس کی کارروائی سے مجھے اس سے بھی زیادہ سخت دھچکا اس وجہ سے پہنچا کہ اس نے مجوزہ دستور اساسی کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں اودھ کے تعلقہ داروں کی خاطر، ایک دفعہ یہ بھی بڑھادی کہ ان کے حقوق اپنے اپنے تعلقے میں محفوظ رہیں گے۔ یوں تو سارا دستور ہی ذاتی ملکیت کے اصول پر مبنی تھا مگر یہ غضب دیکھئے کہ بڑی بڑی نیم جاگیرداری ریاستوں کے حقوق دستور کی اٹل بنیادوں میں داخل کئے جارہے تھے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ کانگریس کے لیڈر اور ان سے زیادہ غیر کانگرسی لوگ اپنی جماعت کے ترقی پسند لوگوں کو چھوڑ کر بڑے بڑے زمینداروں کا ساتھ دینے پر تیار ہیں۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ ہمارے اور ہمارے بہت سے لیڈروں کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل ہے اور مجھے یہ بات مہمل معلوم ہوتی تھی کہ ایسی صورت میں کانگرس کا جنرل سکرٹری رہوں، چنانچہ میں نے اس بنا پر استعفا پیش کر دیا کہ میں "انجمن آزادی ہند" کے بانیوں میں سے ہوں مگر ورکنگ کمیٹی نے اسے منظور نہیں کیا اور مجھ سے اور سبھاش بوس سے (جنھوں نے اسی بنا پر استعفا دیا تھا) کہا گیا کہ تم اس انجمن کا کام کرتے رہو۔ اس کے کانگرس کی پالسی سے ٹکرانے کی کوئی وجہ نہیں اس لئے کہ کانگرس پہلے کامل آزادی کی حمایت کا اعلان کر چکی ہے۔ میں پھر بھی راضی ہو گیا۔ مجھے استعفا واپس لینے پر آمادہ کر لینا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کئی موقعوں پر میں نے اپنا استعفا واپس لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے الگ ہونا نہیں چاہتا تھا، اور ذرا سا بہانہ ملتے ہی جھگڑا رفع ہو جاتا تھا۔

گاندھی جی نہ آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہوئے اور نہ کمیٹی کے جلسوں میں یہاں تک کہ لکھنؤ کے اجلاس میں بھی نہیں آئے۔

اس اثنا میں سائمن کمیشن دورہ کر رہا تھا اور جہاں جاتا تھا مخالفوں کا مجمع کالے جھنڈے لئے "گو بیک" کے نعرے لگاتا پیچھے ہو لیتا تھا کبھی کبھی پولیس میں اور عوام کے مجمع میں معمولی سا جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ لاہور میں بات بڑھ گئی اور سارا ملک غصے سے لرز گیا۔ وہاں سائمن کمیشن کی مخالفت کا مظاہرہ لالہ لاجپت رائے کی سرکردگی میں ہو رہا تھا۔ اور دو سڑک کے کنارے ہزاروں مظاہرہ کرنے والوں کے آگے کھڑے تھے کہ پولیس کے ایک نوجوان انگریز افسر نے جھپٹ کر ان کے سینہ پر ڈنڈے مارنا شروع کر دئے۔ لالہ جی کا تو ذکر ہی کیا ہے سارے مجمع میں کسی شخص نے بھی مطلق تشدد سے کام نہیں لیا تھا بلکہ سب پُر امن طریقے سے کھڑے تھے۔ اس پر بھی پولیس نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بری طرح مارا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص سڑکوں پر مظاہرے میں شریک ہو وہ پولیس سے جھگڑا ہو جانے کی جوکھم اٹھاتا ہے اور لالہ جی جان بوجھ کر اس خطرے میں پڑے ہوں گے مگر پھر بھی جس طریقے پر حملہ کیا گیا اور بلا وجہ جس بے دردی سے کام لیا گیا اس سے بے شمار ہندوستانیوں کو سخت دھچکا لگا۔ ان دنوں ہم لوگ پولیس کے لاٹھی چارج کے عادی نہیں تھے۔ ہمارا احساس اس وقت تک متواتر وحشیانہ حرکتوں سے کند نہیں ہوا تھا۔

ہمارے اتنے بڑے لیڈر اور پنجاب کے سب سے ممتاز اور ہر دلعزیز بزرگ کے ساتھ یہ برتاؤ نہایت شرمناک معلوم ہوا اور دبے ہوئے غصے کی ایک لہر سارے ہندوستان میں خصوصاً شمالی ہند میں دوڑ گئی۔ ہماری بے بسی اور ذلت کا کیا ٹھکانا تھا کہ ہم اپنے چنے ہوئے لیڈروں کی عزت کو بھی نہیں بچا سکتے تھے۔

لالہ جی کو جو جسمانی ضرر پہنچا وہ کچھ کم نہ تھا اس لئے کہ انھیں عرصے سے دل کی بیماری تھی اور ضرب ان کے سینے پر لگائی گئی تھی یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس چوٹ کا اثر ان کی موت پر جو چند ہفتے کے بعد واقع ہوئی کس حد تک



لالہ لاجپت رائے

پڑا۔ ان کے معالج ڈاکٹروں کی تو یہ رائے تھی کہ اسی کی وجہ سے وہ اتنی جلدی ختم ہو گئے مگر میرے خیال میں اس میں شبہے کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ جسمانی ضرب کے ساتھ جو دماغی صدمہ پہنچا اس نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ ان کا دل غم و غصہ سے معمور تھا اپنی ذاتی ذلت سے زیادہ انھیں قومی ذلت کا خیال تھا جو اس حملے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

اس قومی ذلت کا احساس ہندوستان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور تھوڑے ہی دن بعد جب لالہ جی نے وفات پائی تو لوگوں نے اس کی وجہ اسی حملہ کو قرار دیا اور ان کے دلوں میں طیش کا جذبہ اس شدت سے اٹھا کہ رنج پر بھی غالب آ گیا اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کیونکہ اس کی مدد سے ہم بعد کے واقعات کو سمجھ سکتے ہیں یعنی بھگت سنگھ کا نمودار ہونا اور یکایک سارے شمالی ہند میں اس قدر ہر دلعزیز ہو جانا اشخاص کو اور ان کے کاموں کو بغیر اس پر غور کئے ہوئے کہ ان کے محرکات اور اسباب کیا تھے، قابل ملامت قرار دے دینا بہت سہل ہے مگر محض بے وقوفی ہے۔ بھگت سنگھ پہلے سے مشہور نہیں تھا، اس کی ہر دلعزیزی کا سبب محض ایک تشدد اور تخویف کا فعل نہیں تھا۔ تخویف پسند ہندوستان میں تیس سال سے وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے ہیں اور انھیں سوائے بنگال ایجی ٹیشن کے ابتدائی زمانے کے کبھی اس ہر دلعزیزی کا پاسنگ بھی نصیب نہیں ہوا جو بھگت سنگھ کو حاصل ہو گئی۔ یہ ایک صریحی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ تخویف پسندی کی بجھی ہوئی راکھ میں سے کبھی کبھی بی ہوئی چنگاریاں نکل آتی ہیں۔ مگر اب یہ چیز ہندوستان کے نوجوانوں میں مقبول نہیں ہے۔ پندرہ برس کی عدم تشدد کی تلقین نے ہندوستان کے طرز خیال کو بدل یا ہے اور عوام تخویف کو سیاسی طریق کار کی حیثیت سے قابل توجہ نہیں سمجھتے، بلکہ ں کے مخالف ہیں۔ نیچے متوسط طبقے اور تعلیم یافتہ طبقے پر بھی جس میں تخویف پسند

عموماً پیدا ہوتے ہیں، اس پرچار کا بہت قوی اثر ہو چکا ہے جو کانگریس تشدد کے طریقوں کے خلاف کرتی رہی ہے۔ ان میں جو زیادہ تیز اور جلد باز ہیں اور انقلابی طریقوں کے حامی ہیں وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ انقلاب تخویف کے ذریعے سے نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ ایک فرسودہ اور بیکار طریقہ ہے جو انقلابی عمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ تخویف ہندوستان میں اور دوسرے ملکوں میں ختم ہوتی جاتی ہے اس کی وجہ حکومت کا جبر نہیں، اس لئے کہ اس سے تو مادہ ابھرنے کے بجائے دب جاتا ہے اور اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے، بلکہ اس کے گہرے اور بنیادی اسباب ہیں جو عالمگیر واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کسی ملک میں تخویف کا زور ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انقلابی جذبہ بالکل ابتدائی حالت میں ہے کچھ دن کے بعد یہ دور گذر جاتا ہے اور اس کے ساتھ تخویف کی تحریک بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مقامی واقعے یا شخصی ظلم کی وجہ سے کبھی کبھی یہ آگ بھڑک اٹھے۔ ہندوستان یقینی طور پر اس دور سے گزر چکا ہے اور اکا دکا وارداتیں جو کبھی کبھی ہو جاتی ہیں یہ بھی رفتہ رفتہ بند ہو جائیں گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام ہندوستان کے لوگ تشدد کے طریقوں کے قائل نہیں رہے۔ انفرادی تشدد اور تخویف کا خیال عام طور پر ترک کر دیا گیا ہے مگر غالباً بہت سے لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب آزادی حاصل کرنے کے لئے منظم تشدد کے طریقوں کی ضرورت ہو گی جس طرح دوسرے ملکوں میں اکثر ہوتی رہی ہے۔ یہ آج کل ایک نظری مسئلہ ہے جس کا فیصلہ وقت آنے پر موقوف ہے، اسے تخویفی طریقوں سے کوئی تعلق نہیں۔

بھگت سنگھ کو جو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی وہ اس کے تخویفی فعل کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس وجہ سے کہ اس وقت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس نے لالہ لاجپت رائے کی اور سارے ہندوستان کی لاج رکھ لی۔ اس کی ذات

قومی حمیت کی نشانی بن گئی۔ فعل کو تو لوگ بھول گئے اور یہ نشانی باقی رہ گئی چند مہینے میں پنجاب کا ہر شہر اور ہر گاؤں اور ایک حد تک سارا شمالی ہند اس کے نام سے گونج اٹھا۔ اس کی شان میں بے شمار گیت گائے جانے لگے۔ اور اسے حیرت انگیز ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں چوٹ کھانے کے بعد لالہ لاجپت رائے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک جلسے میں شریک ہونے کے لئے دہلی آئے ان کے جسم پر چوٹ کے نشان باقی تھے اور اس کی تکلیف بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ یہ جلسہ لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس کے بعد ہوا تھا اور اس میں کامل آزادی کا مسئلہ بھی کسی صورت سے چھڑ گیا تھا۔ مجھے وہ بات تو ٹھیک طور پر یاد نہیں جس پر بحث ہو رہی تھی مگر یہ یاد ہے کہ میں نے کسی قدر تفصیل سے تقریر کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب کانگریس کو دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرنا ہے یا تو انقلابی طرز خیال، جو ہمارے سیاسی اور سماجی نظام میں کایا پلٹ چاہتا ہے یا اصلاحی مقصد اور طریقہ۔ یہ تقریر کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور میں اسے بھول گیا ہوتا مگر اس وجہ سے یاد رہ گئی کہ لالہ جی نے کمیٹی میں اس کا جواب دیا اور اس کے بعض حصوں پر تنقید کی۔ علاوہ اور باتوں کے انھوں نے یہ بات بھی جتائی، کہ ہمیں برطانوی مزدور پارٹی سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ مجھے اس تنبیہہ کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ میں خود برطانوی مزدوروں کے باضابطہ لیڈروں کا قائل نہیں تھا بلکہ مجھے سخت تعجب ہوتا اگر یہ لوگ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مدد دیتے یا ایسا کوئی کام بھی کرتے جس سے موثر طور پر شہنشاہی کی مخالفت، یا اشتراکیت کی حمایت ثابت ہوتی۔

لاہور واپس جا کر لالہ جی نے پھر میری اس تقریر کے موضوع کی طرف

توجہ کی اور اپنے ہفتہ وار اخبار "پیپل" میں اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا۔ ابھی پہلا ہی مضمون نکلا تھا اور دوسرے کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ وہ دنیا سے گذر گئے۔ ان کا وہ پہلا ناتمام مضمون جو غالباً ان کی آخری شائع شدہ تحریر ہے میرے لئے ایک خاص حسرتناک دلچسپی رکھتا ہے۔

(۳۵)

لاٹھی چارج کا تجربہ

لالہ لاجپت رائے کے زخمی ہونے اور وفات پانے کے بعد سائمن کمیشن جہاں کہیں گیا اس کے خلاف اور بھی زیادہ زور شور سے مظاہرے کئے گئے۔ اب وہ لکھنؤ آنے والا تھا اور وہاں کی کانگریس کمیٹی نے بہت بڑے پیمانے پر اس کے "استقبال" کا انتظام کیا تھا۔ کئی دن پہلے سے بڑے بڑے جلوس نکالے جا رہے تھے اور جلسے اور مظاہرے کئے جا رہے تھے تاکہ پروپگنڈا بھی ہو جائے اور اصل موقع پر کام کرنے کی مشق بھی ہو جائے۔ میں لکھنؤ گیا اور ان میں سے بعض چیزوں میں شریک ہوا۔ یہ ابتدائی مظاہرے بہت امن اور ضبط کے ساتھ کئے گئے اور ان کی کامیابی حکومت کے دل میں کھٹکنے لگی۔ اس نے ان کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کئے اور یہ احکام جاری کئے کہ فلاں فلاں مقام پر جلوس نہ نکالا جائے۔ اسی سلسلے میں مجھے ایک نیا تجربہ ہوا اور میرے جسم نے پولیس کے ڈنڈوں اور لاٹھیوں کا مزہ چکھا۔

جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور اس کی وجہ یہ ظاہر کی گئی تھی کہ سڑک کی آمد و رفت میں حرج ہوتا ہے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ جلوس اس طرح نکالیں جس میں کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہم نے سولہ سولہ آدمیوں کے جتھے بنا کر الگ الگ سونی سڑکوں سے بھیجے کہ جلسے کے مقام پر پہنچ کر مل جائیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کے الفاظ کے لحاظ سے یہ حکم کے خلاف ورزی تھی۔ کیونکہ سولہ آدمیوں کا جھنڈا لے کر چلنا جلوس کی تعریف میں داخل ہے۔ ایک جتھے کے آگے آگے میں

تھا اور میرے پیچھے کچھ فاصلے سے دوسرا جتھا آرہا تھا جس کے رہنما میرے رفیق کار گووند بلبھ پنتھ تھے۔ میرا جتھا سونی سڑک پر کوئی دو سو گز گیا ہوگا کہ پیچھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو تین درجن پولیس کے سوار ہم پر چڑھے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ آن پہنچے اور گھوڑوں کے دھکے سے ہمارا چھوٹا سا جتھا منتشر ہو گیا۔ پولیس کے سواروں نے ہمارے والنٹیروں کو بڑے بڑے ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا اور انھیں بھاگ کر گلیوں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں میں پناہ لینی پڑی۔ سواروں نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا۔ انھیں خوب پیٹا۔ میں نے بھی جب یہ دیکھا کہ گھوڑے چڑھے چلے آتے ہیں تو گھبرایا اور جی میں آیا کہ بھاگ کر جان بچاؤں۔ مگر میرے دل نے یہ قبول نہ کیا اور میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پہلے پہلے میں تو میں بچ گیا اس لئے کہ اس کی ٹکر ان والنٹیروں نے جو میرے پیچھے تھے روک لی مگر تھوڑی دیر میں دیکھا کہ میں سڑک کے بیچ میں اکیلا کھڑا ہوں اور مجھ سے چند گز کے فاصلے پر پولیس والے ہر طرف ہمارے والنٹیروں کو پیٹ رہے ہیں۔ میرے قدم خود بخود سڑک کے کنارے کی طرف ہٹنے لگے تاکہ مجھ پر نظر نہ پڑے۔ مگر میں پھر ٹھہر گیا اور اپنے دل کو سمجھایا کہ مجھے یہاں سے ہٹنا زیبا نہیں۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہو گیا مگر مجھے اب تک یاد ہے کہ میرے ذہن میں اس وقت کیسی کشمکش تھی اور میں نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرے غرور نے یہ گوارا نہ کیا کہ کوئی نامردی کی حرکت کروں مگر اس وقت مردی اور نامردی میں بس ایک ہی قدم کا فاصلہ تھا اور کوئی تعجب نہ تھا کہ میں یہ قدم اٹھا لیتا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سوار اپنی نئی لاٹھی ہلاتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہٹ جاؤ اور خود منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا یہ حرکت مجھ سے بے اختیار سرزد ہوئی تاکہ سر میں اور منہ پر چوٹ نہ آئے اس نے میری پیٹھ پر کس کر دو لاٹھیاں جمائیں۔ مجھے چکر آگیا اور سارے بدن سے کانپنے لگا۔

مگر یہ دیکھ کر مجھے تعجب اور خوشی ہوئی کہ میں نے اپنی جگہ سے قدم نہیں ہٹایا تھا تھوڑی دیر کے بعد پولیس چلی گئی اور اس نے آگے جا کر ہمارا راستہ روک دیا۔ ہمارے والنٹیر پھر اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے بہتوں کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ پنتھ اور ان کے ساتھی بھی آ گئے۔ ان کی بھی بڑی درگت ہوئی تھی۔ ہم سب کے سب پولیس کے مقابل سڑک پر بیٹھ گئے۔ اسی طرح ایک گھنٹہ گذر گیا اور شام ہو گئی۔ ایک طرف بڑے بڑے حکام جمع ہو گئے اور دوسری طرف لوگوں کا مجمع یہ خبر پا کر اکٹھا ہونے لگا آخر حکام اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہم جس راستہ سے جانا چاہتے تھے اسی سے جائیں۔ جب ہم روانہ ہوئے تو وہی سوار جنھوں نے ہمیں زدوکوب کیا تھا محافظ دستے کے طور پر ہمارے ساتھ تھے۔

میں نے اس چھوٹے سے واقعے کو کسی قدر تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے کہ اس کا مجھ پر ایک خاص اثر ہوا تھا۔ مجھے جو چوٹ آئی تھی اسے میں اس خوشی میں بھول گیا کہ میں لاٹھی کھانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ ایک اور بات جس سے مجھے تعجب ہوا یہ تھی کہ عین اس وقت جب مجھ پر لاٹھیاں پڑ رہی تھیں میرے خیالات بالکل واضح تھے اور میں اچھی طرح جان بوجھ کر اپنے جذبات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس مشق سے مجھے فائدہ پہنچا اس لئے کہ دوسرے دن اس سے بھی زیادہ سخت آزمائش ہونے والی تھی۔ دوسرے دن صبح کو سائمن کمیشن کے آنے کا وقت تھا اور ہمارا بڑا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

میرے والد اس وقت الہ آباد میں تھے اور مجھے خوف تھا کہ مجھ پر جو حملہ ہوا تھا اس کی خبر اخبار میں پڑھ کر وہ اور گھر میں سب لوگ پریشان ہوں گے۔ اس لئے میں نے شام کو انھیں ٹیلیفون کر دیا کہ میں خیریت سے ہوں آپ بالکل نہ گھبرائیں مگر وہ اس پر بھی گھبرا گئے۔ انھیں رات کو نیند نہیں آئی اور آدھی رات کے قریب انھوں نے فیصلہ کیا کہ خود لکھنؤ آئیں۔ آخری گاڑی چھوٹ چکی تھی، اس لئے وہ موٹر کار سے روانہ ہوئے

رستے میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور وہ صبح پانچ بجے کے قریب ایک سو چھیالیس میل کا سفر طے کرکے تھکے ہارے لکھنؤ پہنچے۔

اسی وقت ہم لوگ اسٹیشن جانے کے لئے جلوس کی تیاری کر رہے تھے۔ گذشتہ شام کے واقعات کی وجہ سے لکھنؤ میں اتنا جوش پیدا ہوگیا تھا جو ہماری کوششوں سے کبھی نہ ہوتا، اور ہزاروں آدمی اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ شہر کے مختلف حصوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس اُمڈے چلے آتے تھے۔ کانگریس کے دفتر سے بڑا جلوس روانہ ہوا جس میں کئی ہزار آدمی چار چار کی ٹولیوں میں چل رہے تھے ہم لوگ اس بڑے جلوس میں تھے جب اسٹیشن کے قریب پہنچے تو پولیس نے روکا۔ اسٹیشن کے سامنے آدھ میل مربع کا ایک کھلا میدان تھا۔ (جس پہ اب نیا اسٹیشن بنایا گیا ہے) ہم لوگوں کو اس سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا۔ اور ہم اس کے ایک طرف صفیں باندھ کر کھڑے ہوگئے ہمارا جلوس چپ چاپ کھڑا رہا اور اس نے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر طرف پیدل اور سوار پولیس اور فوج کا ہجوم تھا۔ ہمدرد تماشائیوں کا مجمع بڑھتا گیا۔ اور ان میں سے بہت سے دو دو تین تین کرکے میدان میں پھیل گئے۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ دور سے ایک جماعت چلی آتی ہے۔ یہ فوج کے رسالے اور سوار پولیس کی دو تین لمبی صفیں تھیں جو ہماری طرف بڑھ رہی تھیں اور ان لوگوں کو جو میدان میں کھڑے تھے مارتی کچلتی چلی آتی تھیں۔ ان سواروں کا ہلّہ بجائے خود ایک شاندار منظر تھا مگر اس وقت تو یہ منظر بہت دردناک تھا اس لئے کہ بچارے بے قصور تماشائی حیران پریشان گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے کچلے جا رہے تھے۔ سواروں کی بڑھتی ہوئی صفوں کے پیچھے یہ لوگ زمین پر پڑے تھے۔ ان میں سے بعض اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے اور بعض درد سے تڑپ رہے تھے۔ میدان جنگ کا پورا نقشہ نظر کے سامنے تھا۔ مگر ہمیں اس منظر کو دیکھنے یا اس پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ سوار تھوڑی

دیر میں ہمارے قریب آن پہنچے اور ان کی پہلی صف پوری رفتار سے ہمارے جلوس سے ٹکرائی ہم اپنی جگہ پر جمے رہے۔ یہ دیکھ کر سواروں نے آخری لمحے میں گھوڑوں کی باگ کھینچ لی۔ گھوڑے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور ان کے اگلے پیر ہمارے سروں کے بالکل قریب تھر تھرا رہے تھے۔ اب سواروں اور پیادوں نے ہم پر لاٹھیاں اور ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ یہ بڑا سخت حملہ تھا اور خیالات کی وہ وضاحت جو میں گذشتہ شام کو رکھتا تھا، اس وقت رخصت ہو گئی۔ مجھے صرف اتنا احساس باقی تھا کہ جہاں کھڑا ہوں وہاں سے سرکنا نہیں چاہیئے۔ میں لاٹھیوں کی بوچھار سے اندھا سا ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی غصے سے بیتاب ہو جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ میں بھی ہاتھ چلاؤں۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ یہ کس قدر آسان ہے کہ میں اپنے سامنے والے پولیس کے افسر کو کھینچ کر گرادوں اور اس کی جگہ خود سوار ہو جاؤں۔ مگر ایک مدت کی تربیت اور انضباط کام آیا اور میں نے ہاتھ اٹھایا تو مارنے کے لئے نہیں بلکہ صرف وار روکنے کے لئے۔ اس کے علاوہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے ذراسی بھی زیادتی ہوئی تو نہایت ہی ہولناک مصیبت پیش آئے گی اور ہم میں سے ہزاروں آدمی گولیوں سے ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

معلوم ہوتا تھا کہ بہت دیر میں مگر اصل میں چند منٹ کے بعد ہماری صف بغیر ٹوٹے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اب میں اکیلا رہ گیا اور دونوں طرف سے حملے کا اندیشہ ہو گیا۔ مجھ پر کئی لاٹھیاں اور پڑیں اس کے بعد کسی نے یکایک مجھے پیچھے سے پکڑ کر اٹھا لیا جس پر میں بہت ہی جھنجھلایا۔ معلوم ہوا کہ میرے بعض نوجوان ساتھیوں نے یہ سمجھ کر کہ میری جان لینے کی فکر کی جارہی ہے، مجھے بچانے کے لئے یہ زبردستی کا طریقہ استعمال کیا تھا۔

ہم سب جلوس والے کوئی سو فٹ سرک کر پھر جم گئے۔ پولیس بھی پیچھے ہٹ گئی

اور ہم سے پچاس فٹ کے فاصلے پر پرا باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس عرصے میں فساد کی جڑ یعنی سائمن کمیشن سٹیشن سے جو ہم سے آدھ میل کے فاصلے پر تھا، چپکے سے روانہ ہو گیا مگر اس پر بھی وہ کالے جھنڈوں اور مظاہرہ کرنے والوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم پورے جلوس کے ساتھ کانگرس کے دفتر واپس آئے اور وہاں پہنچ کر منتشر ہو گئے میں سیدھا والد کے پاس گیا جو بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

وقتی ہیجان کے گذرنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے سارے بدن میں درد ہو رہا ہے اور میں تھک کر شل ہو گیا ہوں۔ رگ رگ میں درد ہو رہا تھا۔ سارے بدن پر زخم اور لاٹھیوں کے نشان تھے مگر خوش قسمتی سے کسی ایسے حصے میں چوٹ نہیں آئی تھی جس میں جان کا خطرہ ہو۔ میرے بعض ساتھی بہت بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ گووند ولبھ پنتھ اس ہنگامے میں میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ ان کا قد چھ فٹ سے اوپر ہے اس وجہ سے وہ خاص طور پر لاٹھیوں کا نشانہ بنے۔ اس دن کی چوٹوں کی وجہ سے انھیں بڑی تکلیف دہ بیماری لاحق ہو گئی اور وہ ایک عرصے تک اپنی پیٹھ سیدھی کرنے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئے۔ مجھے اس دن سے اپنی جسمانی طاقت اور برداشت کی قوت پر اور زیادہ گھمنڈ ہو گیا مگر میری آنکھوں میں جو تصویر پھر رہی ہے وہ لاٹھی کے حملوں کی نہیں بلکہ ان پولیس والوں کے چہروں کی ہے جو ہم پر حملہ کر رہے تھے۔ زیادہ بیدردی سے یورپی سارجنٹوں نے مارا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے کسی قدر نرمی سے کام لیا تھا۔ کس قدر خوفناک تھے وہ چہرے جن میں نفرت اور خونخواری جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی اور ہمدردی اور انسانیت کا نام تک نہ تھا! غالباً ہم لوگوں کے چہرے بھی ایسے ہی بھیانک ہوں گے۔ عدم تشدد نے نہ تو ہمارے دلوں میں حریفوں کی محبت کا جوش، پیدا کیا تھا اور نہ ہمارے چہروں کے حسن میں اضافہ کیا تھا۔ اس پر بھی ہمیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہ تھی۔ ہمارے دل ذاتی عداوت اور کینے سے پاک تھے۔

اس وقت ہمارے اندر عجیب و غریب زبردست قوتیں کارفرما تھیں اور ہمیں جدھر چاہتی تھیں موڑ رہی تھیں۔ وہ ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں، ہمارے جذبات و خواہشات پر حاوی تھیں اور ہمیں کٹھ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر چلاتی تھیں۔ ہم اندھا دھند لڑ رہے تھے اور ہمیں یہ خبر نہ تھی کہ ہم کاہے کے لئے لڑ رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ عمل کا جوش اور ہیجان ہم پر طاری تھا، مگر اس جوش کا ٹھنڈا ہونا تھا کہ ہمارے دلوں میں یہ سوال اٹھا "آخر اس سارے ہنگامے کا مقصد کیا ہے؟"

(۲۶)

ٹریڈ یونین کانگریس

اس سال ملک کی سیاست پر سائمن کمیشن کا بائیکاٹ اور آل پارٹیز کانفرنس حاوی تھی۔ مگر میری دلچسپی اور سرگرمی کا رُخ دوسرا تھا۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے میں اس کی تنظیم کو قوت پہنچانے میں مصروف تھا اور خاص طور پر مجھے اس کام سے دلچسپی تھی کہ عام لوگوں کی توجہ کو سماجی اور معاشی تغیرات کی طرف پھیریں۔ مدراس کی کانگریس میں کامل آزادی کی جو تحریک اٹھائی گئی تھی اسے مستحکم کرنے کی ضرورت تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ آل پارٹیز کانفرنس میں اس مقصد سے پیچھے ہٹنا چاہتی تھی۔ اس غرض سے میں نے دور دور کا سفر کیا اور بہت سے اہم جلسوں میں تقریریں کیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ۱۹۲۸ء میں چار صوبوں یعنی پنجاب، مالابار دہلی اور صوبہ متحدہ کی کانفرنسوں میں اور بنگال اور بمبئی کے نوجوان اور طالبعلموں کی انجمنوں میں صدارت کے فرائض انجام دئے۔ وقتاً فوقتاً میں صوبہ متحدہ کے دیہات میں جاتا رہا اور مزدوروں کے مجمعوں میں بھی تقریریں کرتا رہا۔ میری تقریروں کی تان ہمیشہ ایک ہی چیز پر ٹوٹتی تھی، البتہ ان کا طرز مقامی حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا تھا۔ جس قسم کا مجمع دیکھتا اسی قسم کی باتوں پر زور دیتا۔ میری تقریر کا موضوع سب کہیں سیاسی آزادی اور سماجی آزادی ہوتی تھی اور میں سماجی آزادی کو سیاسی آزادی کا ذریعہ ثابت کرتا تھا۔ میں اشتراکیت کے خیالات کو خاص طور پر کانگریس کے کارکنوں اور تعلیم یافتہ طبقے میں پھیلانا چاہتا تھا کیونکہ یہ لوگ جو قومی تحریک کے پشت پناہ تھے

بہت ہی محدود قومیت کے قائل تھے۔ ان کی تقریروں میں زیادہ تر ان چیزوں پر زور دیا جاتا تھا۔ ماضی کی شاندار روایات، بدیسی حکومت کے مادی اور روحانی نقصانات، قوم کی حالت زار، غلامی کی ذلت، قومی عزت کا تقاضا کہ ہم آزادی حاصل کریں، مادر وطن کی خاطر قربانی کی ضرورت۔ یہ وہ جانے بوجھے موضوع تھے جو ہر ہندوستانی کے دل کو متاثر کرتے تھے۔ میں بھی ایک حد تک قوم پرست تھا اس لئے مجھ پر بھی ان کا اثر ہوتا تھا (اگرچہ میں ان لوگوں میں سے نہ تھا جو ہندوستان یا کسی اور ملک کے ماضی کی اندھادھند تعریف کرتے ہیں) یہ باتیں اپنی جگہ پر صحیح تھیں لیکن کثرت استعمال سے فرسودہ ہو چکی تھیں اور انھیں بار بار دُہرانے کی وجہ سے لوگ دوسرے مسئلوں اور ہماری جدوجہد کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف متوجہ نہیں ہونے پاتے تھے۔ ان سے جذبات بھڑک اٹھتے تھے مگر غور و فکر کی تحریک نہیں ہوتی تھی۔

میں ہندوستان میں اشتراکیت کا ہراول نہیں تھا بلکہ سچ پوچھئے تو میں اس میدان میں بہت پیچھے تھا اور بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا۔ بہت سے لوگ مجھ سے آگے نکل چکے تھے اور میں ان کے روش نقش قدم پر چل رہا تھا۔ مزدوروں کی اشتراکیت کی تحریک اور نوجوانوں کی اکثر انجمنیں اصولاً صریحی طور پر اشتراکیت کی حامی تھیں دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب میں یورپ سے واپس آیا، ہندوستان میں اشتراکیت کی ایک دھندلی سی فضا چھائی ہوئی تھی اور بعض افراد اس سے بھی پہلے اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ زیادہ تر یہ لوگ خیالی دنیا میں رہتے تھے مگر مارکس کے نظریہ کا اثر روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور چند اشخاص اپنے آپ کو مارکس کا پورا پیرو سمجھتے تھے۔ یورپ اور امریکا کی طرح ہندوستان میں بھی اس رجحان کو سوویٹ یونین کی نشوونما خصوصاً اس کے پنج سالہ منصوبے سے تقویت پہنچی تھی۔

مجھے اشتراکی کارکن کی حیثیت سے جو کچھ اہمیت حاصل تھی وہ اس وجہ سے

تھی کہ میں ایک سرمایہ آوردہ کانگرسی تھا اور کانگرس میں ایک بڑا عہدہ رکھتا تھا۔ بعض اور مشہور کانگرسیوں پر بھی ان خیالات کا اثر ہو چلا تھا۔ یہ چیز سب سے زیادہ صوبہ متحدہ کی کانگرس کمیٹی میں نمایاں تھی اور ہم نے ۱۹۲۶ء ہی میں اس کمیٹی میں ایک ہلکا سا اشتراکی پروگرام بنانے کی کوشش کی تھی۔ ہمارا صوبہ زمینداروں اور تعلقہ داروں کا صوبہ تھا اس لئے ہمیں سب سے پہلے زمین کا مسئلہ حل کرنا تھا۔ ہم نے یہ اعلان کیا کہ موجودہ نظام آراضی کو منسوخ کر دیا جائے اور سلطنت اور کاشتکاروں کے بیچ میں درمیانی اشخاص نہ رہیں۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام کرنے کی ضرورت تھی اس لئے کہ جس فضا میں ہم رہتے تھے وہ اس قسم کے خیالات کی عادی نہیں تھی۔

۱۹۲۹ء میں صوبہ متحدہ کی کانگرس کمیٹی ایک قدم اور آگے بڑھی اور اس نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سامنے ایک تجویز پیش کی جو صریحی طور پر اشتراکی خیالات پر مبنی تھی۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنے اجلاس میں جو ۱۹۲۹ء میں گرمی کے موسم میں بمبئی میں منعقد ہوا، صوبہ متحدہ کی تجویز کے ابتدائی حصہ کو منظور کر لیا یعنی اشتراکیت کے اصول کو جس پر یہ تجویز مبنی تھی، قبول کر لیا، اس تجویز میں جو مفصل پروگرام پیش کیا گیا تھا اس پر غور کرنا آئندہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اکثر لوگ اس تجویز کو بھول گئے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کا مسئلہ ابھی سال بھر سے یکایک کانگرس میں چھڑ گیا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اس تجویز کو بغیر کسی خاص غور کے پاس کر دیا تھا اور اکثر ممبر یہ نہیں سمجھے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

انجمن آزادی ہند کی صوبہ متحدہ کی شاخ (جس کے سب ممبر اس صوبے کے ممتاز کانگرسی کارکن تھے) بالکل اشتراکی خیالات رکھتی تھی۔ اس لئے وہ کانگرس کمیٹی سے جس میں مختلف خیالات کے لوگ تھے، کچھ آگے بڑھ گئی۔ اصل میں سماجی آزادی انجمن آزادی ہند کے مقاصد میں داخل تھی ہمیں یہ امید تھی کہ ہم اس انجمن کی شاخیں سامنے

ہندوستان میں پھیلاویں گے اور ان سے آزادی اور اشتراکیت کے پروپگنڈا کا کام لیں گے
مگر بد قسمتی سے اس انجمن کو صرف صوبہ متحدہ میں کسی قدر کامیابی ہوئی اور کہیں اس کا
کام نہیں چلا جس سے میں بہت مایوس ہوا۔ اس ناکامیابی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ملک میں
اس انجمن کے حامیوں کی کمی تھی بلکہ اس کے اکثر کارکن کانگریس کے کارکن بھی تھے
اور کانگریس نے کم سے کم اصولاً کامل آزادی کے مقصد کو اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے
وہ سمجھتے تھے کہ ہم خود کانگریس ہی کے ذریعے سے اپنا کام کر سکتے ہیں۔ دوسری وجہ
یہ تھی کہ انجمن کے بانیوں میں سے بعض نے اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا اور
اسے ترقی دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ اس سے صرف اتنا کام لینا چاہتے تھے
کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی پر زور ڈالیں اور اس میں اپنے نمائندوں کو منتخب کرائیں
غرض یہ انجمن کچھ زیادہ پنپنے نہیں پائی جب کانگریس نے زیادہ زوردار پالیسی اختیار
کی تو وہ لوگ جو انجمن کی روح رواں تھے کانگریس کی طرف کھنچ آئے اور انجمن اور
بھی کمزور ہو گئی سنہ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے شروع ہوتے ہی انجمن کانگریس میں
ضم ہو گئی اور اس کا خاتمہ ہو گیا۔

سنہ ۱۹۲۸ء کے نصف آخر اور سنہ ۱۹۲۹ء میں میری گرفتاری کی خبر گرم تھی یہ معلوم
اخبار کی خبروں میں اور ان نجی کی اطلاعوں میں جو مجھے واقف کار دوستوں سے ملتی
تھیں کہاں تک اصلیت تھی۔ مگر مجھے ان کی وجہ سے ایک بے اطمینانی سی رہنے لگی
میں ہر وقت یہ سمجھتا تھا کہ بس اب گرفتار ہوا ہی چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی کچھ زیادہ
پرواہ نہیں تھی اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ میری آئندہ زندگی، اور چاہے جیسی بھی ہو
مگر اطمینان کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہی اچھا تھا کہ میں بے اطمینانی اور فوری
تغیرات اور جیل جانے کا عادی ہو جاؤں۔ میرے خیال میں مجھے ایک حد تک اور میرے
خاندان کو اس کی عادت پڑ گئی۔ اور جب کبھی میری گرفتاری ہوتی تھی تو میں اسے

ایک معمولی چیز سمجھتا تھا۔ غرض گرفتاری کی افواہیں فائدے سے خالی نہ تھیں۔ ان کی وجہ سے میری روزمرہ کی زندگی میں ایک طرح کی بے چینی اور خلش کا لطف پیدا ہو گیا جو دن آزادی میں گذرتا تھا وہ بہت غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ بر خلاف توقع ۱۹۲۸ء میں مجھے بڑی لمبی مہلت ملی اور کہیں اپریل ۱۹۳۰ء میں جا کر میری گرفتاری عمل میں آئی۔ اس وقت سے مجھے جو تھوڑا بہت موقع جیل سے باہر رہنے کا ملتا ہے وہ ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے اور میں اپنے گھر میں اس طرح رہتا ہوں جیسے کوئی مہمان تھوڑے دن کے لئے آیا ہے میری زندگی کچھ بے ٹھکل سی رہتی ہے کیونکہ یہ خبر نہیں رہتی کہ کل کیا ہوگا۔ ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ جیل سے بلاوا آیا ہی چاہتا ہے۔

۱۹۲۸ء ختم ہونے کو آیا اور کلکتہ کانگریس کا اجلاس قریب آ گیا۔ میرے والد اس کی صدارت کرنے والے تھے۔ وہ ہر وقت آل پارٹیز کانفرنس اور اپنی رپورٹ کی فکر میں رہتے تھے اور اس کو کانگریس میں منظور کرانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں اس کا مخالف ہوں کیونکہ میں آزادی کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھا اور انھیں یہ بات ناگوار تھی ہم اس معاملے میں کچھ زیادہ بحث نہیں کرتے تھے مگر آپس میں ذہنی نزاع اور مخالفت ضرور تھی، خیالات کا اختلاف ہم میں پہلے بھی رہ چکا تھا اور اس قدر اہم تھا کہ دونوں کی سیاسی راہیں الگ الگ ہو گئی تھیں۔ مگر میرے خیال میں اتنی کشیدگی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی ہم دونوں کو اس کا رنج تھا۔ کلکتے میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ میرے والد نے صاف کہہ دیا، اگر انھیں کانگریس میں ناکامیابی ہوئی، یعنی ان کی آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ کثرت رائے سے منظور نہ ہوئی تو وہ کانگریس کی صدارت نہیں کریں گے۔ آئینی حیثیت سے یہ بالکل معقول بات تھی مگر ان لوگوں کے لئے جو ان کی رائے کے مخالف تھے بڑی مشکل پڑ گئی اس لئے کہ وہ مخالفت کو اس حد تک بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ کانگریس میں اور شاید دوسری

جماعتوں میں بھی یہ رجحان عام ہے کہ لوگ نکتہ چینی اور مخالفت کرتے ہیں مگر ذمہ داری قبول کرنے سے گھبراتے ہیں انھیں ہمیشہ یہ امید رہتی ہے کہ ان کی نکتہ چینی سے دوسری پارٹی اپنا رُخ بدل دے گی اور کشتی کے چلانے کا بوجھ خود ان پر نہیں پڑے گا۔ جہاں ہم لوگ ذمہ داری سے محروم ہیں اور اختیارات غیر ذمہ دار حکام کے ہاتھ میں ہیں، جو معزول نہیں کئے جا سکتے، مثلاً ہندوستان کی موجودہ حکومت میں وہاں ہم نکتہ چینی (یا عملی مخالفت) کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے اور اس صورت میں نکتہ چینی لازمی طور پر محض تخریبی ہوتی ہے لیکن یہاں بھی یہ تخریبی نکتہ چینی اسی وقت موثر ہو سکتی ہے جب ہم اس کے لئے تیار ہوں کہ اگر موقع ملا تو ہم حکومت کی پوری ذمہ داری قبول کر لیں گے اور ملکی اور فوجی، داخلی اور خارجی تمام محکموں کو چلائیں گے۔ محض جزوی اختیارات کا مطالبہ کرنا جیسا کہ لبرل جماعت فوج کے معاملے میں کرتی ہے، گویا اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ ہم حکومت کے چلانے کی قابلیت نہیں رکھتے اور پھر ساری نکتہ چینی میں کچھ زور باقی نہیں رہتا۔

گاندھی جی پر نکتہ چینی کرنے والے اکثر یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اعتراض اور مخالفت کرنے کو تو موجود ہیں مگر اس کے قدرتی نتائج سے گھبراتے ہیں۔ کانگرس میں بہت سے لوگ ہیں جو ان کی اکثر کارروائیوں کو ناپسند کرتے ہیں اور ان پر بہت سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں مگر اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انہیں کانگرس سے الگ کر دیں یہ طریقہ سمجھ میں تو آتا ہے مگر یہ دونوں فریقوں کے ساتھ ناانصافی پر مبنی ہے۔

اسی قسم کی مشکلیں کلکتہ کانگرس میں پیش آئیں۔ دونوں فریقوں میں گفت و شنید ہوتی رہی اور سمجھوتے کی راہ نکالی گئی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے بڑی الجھن اور ابتری پیدا ہوئی۔ کانگرس میں جو رزولیوشن پاس ہوا اس میں آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ منظور کر لی گئی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر حکومت برطانیہ نے

ایک سال کے اندر مجوزہ دستور اساسی کو قبول نہ کیا تو کانگریس دوبارہ کامل آزادی کو اپنا مقصد قرار دے گی۔ یہ رزولیوشن یقیناً کامل آزادی کے نصب العین سے بہت پست تھا اس لئے کہ آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ میں پہلے تو آبادیات کے درجے کا بھی مطالبہ نہیں کیا گیا تھا مگر غالباً یہ تجویز ایک لحاظ سے دانشمندی پر مبنی تھی اس لئے کہ اس کی وجہ سے آپس کی تفریق جس کے لئے کوئی تیار نہیں تھا، رک گئی اور کانگریس متحدہ طور پر ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر سکی۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ حکومت برطانیہ آل پارٹیز کانفرنس کے دستور اساسی کو سال بھر کے اندر منظور نہیں کرے گی۔ لڑائی کا ہونا یقینی تھا اور ملک کی حالت کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی کی رہنمائی کے بغیر لڑائی میں کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔

میں نے کسی قدر بے دلی سے کانگریس کے کھلے اجلاس میں اس رزولیوشن کی مخالفت کی مگر پھر بھی میں جنرل سکریٹری منتخب ہو گیا۔ چاہے جو کچھ بھی ہو میں سکریٹری کے عہدے کو نہیں چھوڑتا تھا اور کانگریس میں میری مثال برے کے مشہور پادری کی سی تھی۔ کانگریس کا صدر کوئی بھی ہو، سکریٹری میں ہی رہتا تھا۔

کلکتہ کانگریس سے چند روز پہلے جھریا میں جو کوئلے کی کانوں کے علاقے کا مرکز ہے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا اجلاس ہوا۔ میں نے صرف اس کے پہلے دو دن کے جلسوں میں شرکت کی کیونکہ اس کے بعد مجھے کلکتہ جانا تھا۔ مجھے ٹریڈ یونین کانگریس میں شرکت کا یہ پہلا موقع تھا اور میں ایک حد تک باہر کا آدمی سمجھا گیا۔ حالانکہ کسانوں میں اور کچھ دن مزدوروں میں کام کرنے کی وجہ سے مجھے عوام میں خاصی ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی تھی۔ یہاں بھی مجھے اصلاح پسندوں اور انقلاب پسندوں کا وہی پرانا جھگڑا نظر آیا۔ دو اہم مسئلے زیر بحث تھے ایک تو یہ کہ دونوں بین الاقوامی انجمنوں میں سے کسی ایک سے اور انجمن مخالف شہنشاہی اور پین پیسیفک

یونین سے الحاق کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ جینوا کی بین الاقوامی مزدوروں کی کانفرنس میں نمائندے بھیجے جائیں یا نہ بھیجے جائیں۔ مگر ان مسئلوں سے کہیں زیادہ اہم وہ شدید اختلاف تھا جو کانگریس کے دونوں فریقوں میں پایا جاتا تھا۔ ایک تو پرانا ٹریڈ یونین کا فریق تھا جو معتدل سیاسی خیالات رکھتا تھا بلکہ صنعتی معاملات میں سیاست کی مداخلت کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ صرف صنعتی جدوجہد چاہتا تھا اور وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کی حالت رفتہ رفتہ بہتر بنائی جائے۔ اس فریق کے لیڈر ن۔ م۔ جوشی تھے جنھوں نے کئی بار جینوا میں ہندستانی مزدوروں کی نمائندگی کی تھی۔ دوسرا فریق زیادہ جنگ جو تھا۔ وہ سیاسی جدوجہد کا قائل تھا۔ اور کھلم کھلا انقلابی خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ اس پر کسی قدر اثر ان لوگوں کا تھا جو اشتمالی یا قریب قریب اشتمالی اصول رکھتے تھے۔ یہ فریق بمبئی کے پارچہ بافی کے مزدوروں پر حاوی ہو گیا تھا اور اس کی رہنمائی میں بمبئی کے کپڑے کے کارخانوں میں ایک بہت بڑی ہڑتال ہو چکی تھی جس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔ بمبئی میں پارچہ بافی کے مزدوروں کی ایک نئی طاقت ور انجمن "گرنی کامگار یونین" کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کا وہاں کے مزدوروں میں بہت بڑا اثر تھا۔ ایک اور طاقتور انجمن یعنی جی۔ آئی۔ پی ریلوے یونین بھی انتہا پسند فریق کے اثر میں تھی۔

جب سے ٹریڈ یونین کانگریس قائم ہوئی اس کا انتظام اور اس کا دفتر ن۔ م۔ جوشی اور ان کے رفیقوں کے ہاتھ میں تھا اور جوشی ہی نے اس تحریک کو نشو و نما دی تھی۔ انتہا پسند فریق کا اثر عام ممبروں میں تو بہت تھا مگر کانگریس کے ارباب اقتدار کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی تھی اور اس کی پالیسی میں انھیں ذرا بھی دخل نہ تھا۔ یہ صورت بہت ناقابل اطمینان تھی اور اصل حالات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ لوگوں میں ناراضی پھیلی ہوئی تھی، آپس میں جھگڑے ہو رہے تھے

اور انتہا پسند فریق ٹریڈ یونین کانگرس میں اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس کے باوجود لوگ معاملے کو زیادہ طول دینے سے گھبراتے تھے کہ کہیں کانگرس میں تفریق نہ ہو جائے۔ ابھی ٹریڈ یونین کی تحریک ہندوستان میں بالکل بچپن کی حالت میں تھی اس کی قوت بہت کم تھی اور اس کے چلانے والے خود مزدور نہیں بلکہ باہر کے لوگ تھے۔ ان کے حالات میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ باہر والے مزدوروں کے ذریعے سے خود فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ٹریڈ یونین کانگرس اور مزدوروں کی دوسری انجمنوں میں یہ بات صاف نظر آرہی تھی۔ البتہ ان۔ ایم جوشی نے برسوں کی جد و جہد سے یہ ثابت کر دیا تھا، کہ وہ ٹریڈ یونین کے سچے اور پکے حامی ہیں اور جو لوگ انھیں سیاسی حیثیت سے رجعت پسند یا اعتدال پسند سمجھتے تھے وہ بھی اس کے معترف تھے کہ انھوں نے ہندوستان کے مزدوروں کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

میں جھریا کی کانگرس میں انتہا پسند فریق سے ہمدردی رکھتا تھا مگر چونکہ میں نیا آدمی تھا اور کانگرس کے خانگی جھگڑوں کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا تھا اس لئے میں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا۔ میرے جانے کے بعد ٹریڈ یونین کانگرس کے سالانہ انتخابات ہوئے اور مجھے کلکتہ میں معلوم ہوا کہ میں آئندہ سال کے اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا ہوں۔ میرا نام اعتدال پسند فریق نے پیش کیا تھا، شاید اس وجہ سے کہ اس کے نزدیک انتہا پسند فریق کے امیدوار کے مقابلے میں (جو ریلوے کا ایک مزدور تھا) میری کامیابی کا سب سے زیادہ امکان تھا۔ اگر میں انتخاب کے دن جھریا میں موجود ہوتا تو یقیناً مزدور امیدوار کے حق میں دست بردار ہو جاتا۔ مجھے یہ بات بہت نامناسب معلوم ہوئی کہ ایک نیا آدمی، جو خود مزدور نہیں تھا، ایک دم سے صدر بنا دیا جائے۔ یہ بھی ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کے بچپن اور اس کی کمزوری کی ایک علامت تھی۔

۱۹۲۸ء میں مزدوروں کے جھگڑوں اور ہڑتالوں کا بڑا زور رہا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ بمبئی کے پارچہ بافی کے خستہ حال اور جنگ جو مزدور اس میں پیش پیش تھے۔ بنگال جوٹ مل میں بہت بڑی عام ہڑتال ہوئی۔ جمشید پور کے لوہے کے کارخانے میں، (اور شاید ریلوے میں بھی) ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ جمشید پور کے ٹین کی چادروں کے کارخانے میں بڑا سخت مقابلہ ہوا اور غریب مزدور کئی مہینے تک لڑتے رہے، مگر باوجود اس کے کہ پبلک نے ان سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا، اس طاقتور کمپنی نے جو اس کارخانے کی مالک تھی (اور برما آئل کمپنی سے وابستہ تھی) انھیں کچل کر رکھ دیا۔

غرض ان دو سال کے عرصے میں صنعتی حلقوں میں سخت بے چینی رہی، اور مزدوروں کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ہندستان میں صنعت کی گرم بازاری کا زمانہ تھا۔ اور کارخانے کے مالکوں نے اس عرصے میں بے اندازہ نفع کمایا تھا۔ پانچ چھ سال تک جوٹ اور روئی کے کارخانوں کا سالانہ نفع سو فی صدی رہا اور کبھی کبھی ڈیڑھ سو فی صدی تک بھی پہنچ گیا۔ یہ تمام منافع مالکوں اور حصہ داروں کی جیب میں گیا اور مزدوروں کی حالت جیسی پہلے تھی ویسی ہی رہی۔ کبھی ان کی مزدوری میں خفیف سا اضافہ بھی ہوا تو اسی نسبت سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ اس زمانے میں جب کہ کروڑوں روپے کی آمدنی ہو رہی تھی مزدور بدستور بدتر سے بدتر کوٹھریوں میں رہتے تھے اور ان کی عورتوں کو پہننے کو کپڑا بھی میسّر نہ تھا۔ بمبئی کے مزدوروں کی حالت تو خراب تھی ہی مگر کلکتے کے محلوں سے گھنٹہ بھر کے راستہ پر جوٹ کے مزدور ان سے بھی بڑھ کر مصیبت میں گرفتار تھے۔ نیم برہنہ میلی کچیلی عورتیں چند پیسوں کے بدلے صبح سے شام تک کام کرتی تھیں تاکہ گلاسگو اور ڈنڈی میں اور بعض ہندوستانیوں کے گھروں میں دولت کی ندیاں بہتی رہیں۔

جب تک گرم بازاری کا دور رہا کارخانوں کے مالک مزے کرتے رہے مزدوروں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور ان کی زندگی اسی طرح گزرتی رہی۔ مگر جب یہ دور ختم ہو گیا اور لمبے چوڑے منافع بند ہو گئے تو ظاہر ہے کہ اس کا سارا بوجھ غریب مزدوروں پر پڑا۔ پچھلے نفع کو لوگ بھول گئے تھے اور کمائی کے گھاٹے لگا چکے تھے۔ اب یہ کہا جاتا تھا کہ جب تک کافی نفع نہ ہو کارخانے کیسے چل سکتے ہیں؟ اسی کا نتیجہ تھا کہ صنعتی حلقوں میں بے چینی اور شورش پھیل گئی اور بمبئی میں اتنی زبردست ہڑتالیں ہوئیں جنہیں دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے اور کارخانوں کے مالک اور ارباب حکومت دونوں ڈر گئے۔ مزدوروں کی تحریک خیالات اور تنظیم دونوں کے لحاظ سے متحد، جنگ جو اور خطرناک ہوتی جاتی تھی۔ سیاسی تحریک بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اگرچہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہ تھا مگر پھر بھی یہ ایک حد تک ساتھ ساتھ چل رہی تھیں ایسی صورت میں حکومت مستقبل کی طرف سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں حکومت نے یکایک مزدوروں کی تنظیم پر وار کیا اور انتہا پسند فریق کے چند سربرآوردہ کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ بمبئی کی گرنی کامگار یونین کے لیڈر اور بنگال، صوبہ متحدہ اور پنجاب کے مزدوروں کے لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ ان میں سے بعض اشتمالی تھے، بعض قریب قریب اشتمالی خیالات رکھتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جو صرف ٹریڈ یونین کے حامی تھے۔ اس طرح میرٹھ کا مشہور مقدمہ شروع ہوا جو ساڑھے چار برس تک چلتا رہا۔

میرٹھ کے ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے صدر میرے والد تھے اور جس کے ممبروں میں ڈاکٹر انصاری اور دوسرے حضرات کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔ ہمارے سامنے بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے لئے روپیہ جمع کرنا سہل نہ تھا۔ روپے والوں کو اشتمالیوں، اشتراکیوں اور مزدوروں

نے حمایت میں شورش کرنے والوں سے کچھ زیادہ ہمدردی نہیں معلوم ہوتی تھی اور وکیل صاحبان شائلاک کی طرح اپنی خدمات صرف اسی شرط پر پیش کرنے کو تیار تھے کہ انہیں پورے آدھ سیر گوشت کا ٹکڑا کسی نہ کسی کے جسم سے کاٹ کر دیا جائے۔ ہماری کمیٹی میں میرے والد اور بعض اور ممتاز وکیل شامل تھے اور وہ مشورہ دینے کے لئے اور عام نگرانی کرنے کے لئے ہر وقت تیار تھے۔ ان لوگوں کو کوئی معاوضہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ مگر وہ مہینوں جم کر میرٹھ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ دوسرے وکیل جن سے ہم نے مدد کی درخواست کی اس مقدمے کو زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

میرٹھ کے مقدمے کے علاوہ میرا تعلق بعض اور کمیٹیوں سے رہا ہے جو ہم نے راے اور دوسرے سیاسی ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے قائم ہوئی تھیں۔ ہر موقع پر اپنے ہم پیشہ حضرات کی حرص کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ سب سے پہلا بڑا دھکا مجھے ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے مارشل لا کے مقدمے کے دوران میں پہنچا تھا جبکہ ایک چوٹی کے وکیل کو اس پر اصرار تھا کہ وہ غریب جو مارشل لا کا شکار ہوئے تھے اور جن میں ایک ان کے ہم پیشہ وکیل بھی شامل تھے، ان کی بھاری فیس پوری پوری ادا کریں۔ ان میں سے بہتوں کو ان کی فیس ادا کرنے کے لئے قرض لینا پڑا یا اپنی جائداد بیچنی پڑی۔ ہم غریب سے غریب مزدوروں سے پیسہ پیسہ جمع کرتے تھے اور وکیلوں کو بڑے بڑے چیک لکھ کر دیتے تھے اس سے مجھے روحانی تکلیف ہوتی تھی کیونکہ سیاسی ملزموں اور مزدوروں کے مقدموں میں خواہ پیروی کی جائے یا نہ کی جائے نتیجہ ایک ہی نظر آتا تھا۔ بہرحال میرٹھ کے مقدمے میں کئی لحاظ سے پیروی ضروری معلوم ہوتی تھی۔

میرٹھ کے ملزموں کی طرف سے پیروی کرنے والی کمیٹی کو خود ان ملزموں

کی وجہ سے بڑی دقتیں پیش آتی تھیں۔ ان میں طرح طرح کے لوگ تھے جن کی طرف سے مختلف قسم کی صفائی پیش کرنی تھی اور اکثر ان میں آپس میں اختلاف رہا کرتا تھا۔ چند مہینے کے بعد ہم نے باضابطہ کمیٹی توڑ دی مگر انفرادی حیثیت سے ان لوگوں کی مدد کرتے رہے۔ سیاسی واقعات کی رفتار روز بروز ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتی گئی اور سنہ ۱۹۳۰ء میں ہم سب کے سب جیل میں پہنچ گئے۔



پنڈت جواہر لال نہرو سنہ ۳۰ میں

(۳۷)

بادلوں کی گرج

سنہ ۱۹۲۹ء کی کانگرس لاہور میں ہونے والی تھی۔ دس سال کے بعد کانگرس پھر پنجاب آ رہی تھی۔ لوگوں کے ذہن سنہ ۱۹۱۹ء کے واقعات سے تازہ ہو گئے:

جلیانوالا باغ کا حادثہ، مارشل لا اور اس کی ذلتیں، امرتسر کانگرس کا اجلاس اور ترک موالات کی تحریک کا شروع ہونا اس دس سال کے عرصہ میں بہت کچھ ہو چکا تھا ہندوستان کا نقشہ بدل گیا تھا مگر سنہ ۱۹۱۹ء کے واقعات کی مثالیں اب بھی موجود تھیں سیاسی کشمکش بڑھتی جاتی تھی اور لڑائی کی فضا تیزی سے چھا رہی تھی آنے والی لڑائی کے آثار سارے ملک میں نظر آ رہے تھے۔

اسمبلی اور صوبوں کی کونسلوں سے ایک مدت سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی سوائے ان چند حضرات کے جو ان مقدس حلقوں میں زندگی بسر کرتے تھے وہ اپنا کام لشتم پشتم چلا رہے تھے اور اس کی کوشش کر رہے تھے کہ حکومت کی تحکم پسندی اور استبداد پر ایک پھٹا پرانا پردہ ڈالے رہیں تاکہ ہندوستان کی "پارلیمنٹ" کا نام باقی رہے اور اس کے ممبروں کو الاؤنس ملتا رہے۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی آخری کامیاب کوشش جو اسمبلی نے کی وہ اس کا سنہ ۱۹۲۸ء کا رزولیوشن تھا جس میں سائمن کمیشن سے اتحاد عمل کرنے سے انکار کیا گیا تھا۔

اس کے بعد کچھ دن تک اسمبلی کے صدر اور حکومت کے درمیان کشمکش ہوتی رہی۔ اسمبلی کے سوراجی صدر وٹھل بھائی پٹیل اپنی آزادی رائے کی وجہ

سے حکومت کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے اور ان کے پر کترنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس قسم کے واقعات لوگوں کو اسمبلی کی طرف متوجہ کر لیتے تھے مگر مجموعی طور پر ایسا کی توجہ کا مرکز بنا۔ ایسے واقعات تھے جس سے وہ اسمبلی و کونسل کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اس وقت کونسلوں سے کوئی کام نہیں نکل سکتا وہ خود اس چکر سے نکلنے کا موقع ڈھونڈھتے رہتے تھے۔ اگرچہ وہ آئینی دماغ رکھتے تھے اور قانونی طریقوں کے عادی تھے لیکن واقعات سے انھیں یہ افسوسناک تجربہ ہوا کہ نام نہاد آئینی طریقے ہندوستان میں بالکل بیکار رہیں۔ وہ اپنی قانونی ذہنیت کی تسکین کے لئے اس کی یہ تاویل کرتے تھے کہ ہندوستان میں نہ تو کوئی آئین ہے اور نہ قانون کی حکومت ہے اس لئے کہ یہاں محض ایک شخص یا چند اشخاص کی مرضی سے آرڈیننس وغیرہ کی شکل میں یکایک قانون نافذ ہو جاتے ہیں جیسے بازی گر کی ٹوپی سے خرگوش نکل پڑتا ہے۔ وہ اپنی طبیعت اور عادت کے لحاظ سے ہرگز انقلاب پسند نہ تھے اور اگر اوسط طبقے کی کوئی جمہوری حکومت ہوتی تو وہ یقیناً اس کے پشت پناہ ہوتے مگر موجودہ حالات میں انھیں ہندوستان کی آئینی شورش اور دکھاوے کی پارلیمنٹ کے نام سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔

گاندھی جی ابھی تک سیاسیات سے الگ تھے ہر چند اس کا اصولی لینے کلکتے کی کانگریس میں حصہ لیا تھا۔ پھر بھی وہ واقعات کی رفتار سے پوری طرح باخبر تھے اور کانگریس کے لیڈر اکثر ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ چند سال سے ان کا وقت زیادہ تر کھادی کو رواج دینے میں صرف ہوتا تھا اور انھوں نے اس غرض سے ہندوستان میں لمبے لمبے دورے کئے تھے۔ انھوں نے باری باری سے ہر صوبے کا دورہ کیا اور ہر ضلعے، ہر بڑے قصبے یہاں تک کہ دور افتادہ دیہات میں بھی پہنچے۔ ہر جگہ ان کی وجہ سے لوگوں کا بے شمار مجمع ہوتا تھا اور ان کے پروگرام

کو پورا کرنے کے لیئے ان کے اسٹاف کو پہلے سے بہت کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ اس طریقے سے انھوں نے کئی بار ہندوستان کا دورہ کیا ہے اور شمال سے لے کر جنوب کے سرے تک اور مشرقی پہاڑوں سے لے کر مغربی سمندر تک اس وسیع ملک کا چپہ چپہ چھان ڈالا ہے۔ میرے خیال میں کسی انسان نے ہندوستان کا اتنا سفر نہیں کیا جتنا انھوں نے کیا ہے۔

اگلے زمانے میں بڑے بڑے سیلانی گذرے ہیں جو ہمیشہ چلتے ہی رہتے تھے چلتی یاتری تھے جن پر ہمیشہ سفر کی دھن سوار رہتی تھی۔ مگر ان کے زمانے میں آمدورفت کے ذریعے بہت سست تھے اور ان کی عمر بھر کی سیاحت ریل یا موٹر کے ایک سال کے سفر کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ گاندھی جی نے ریل اور موٹر سے سفر کیا مگر اس کے پابند نہیں رہے بلکہ پیدل بھی پھرے۔ اس طرح انھیں ہندوستان اور اس کے باشندوں کے متعلق وہ معلومات حاصل ہو گئیں جو کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور کروڑوں آدمیوں کو انھیں دیکھنے کا اور ان سے ملنے کا موقع ملا۔

۱۹۲۹ء میں وہ اپنے کھادی کے دورے کے سلسلے میں صوبہ متحدہ میں آئے اور سخت گرمی کے موسم میں کئی ہفتے اس صوبہ کا دورہ کرتے رہے۔ کبھی کبھی میں بھی چند روز کے لیئے ان کے ساتھ چلا جاتا تھا اور پچھلے تجربے کے باوجود مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی تھی کہ ان کی کشش سے لوگوں کا کتنا زبردست مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے یہ بات سب سے زیادہ مشرقی اضلاع، مثلاً گورکھپور میں نمایاں تھی جہاں لوگوں کے ہجوم پر ٹڈی دل کا گمان ہوتا تھا۔ جب ان کا موٹر دیہات سے گزرتا تھا تو ہر چند میل کے فاصلے پر دس ہزار سے لے کر پچیس ہزار تک کا مجمع ہو جاتا تھا۔ اور اس بڑے جلسے میں جو روزانہ کہیں نہ کہیں ہوتا تھا لوگوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ سوائے چند بڑے شہروں کے اور کہیں ریڈیو کا انتظام نہیں تھا

اس لیئے ظاہر ہے کہ اتنا بڑا مجمع ان کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ غالباً ان لوگوں کو سننے کی توقع بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی سے خوش ہو جاتے تھے کہ انھیں مہاتما کا درشن نصیب ہو گیا۔ گاندھی جی عموماً ان موقعوں پر بہت مختصر تقریر کرتے تھے تا کہ انھیں حد سے زیادہ تکان نہ ہو۔ اس کے بغیر اس سلسلے کو ہر روز بلکہ ہر گھنٹے جاری رکھنا قطعاً ناممکن تھا۔

میں صوبہ متحدہ کے پورے دورے میں ان کے ساتھ نہیں رہا کیونکہ میں ان کے لئے کچھ زیادہ کار آمد نہیں تھا اور خواہ مخواہ دورہ کرنے والوں کی تعداد بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گو مجھے بڑے مجمعوں سے وحشت نہیں ہوتی لیکن بغیر کسی معقول وجہ کے بھیڑ دھکے کھانے اور پیر کچلوانے کی تکلیف جو عموماً گاندھی جی کے ساتھیوں کے حصے میں آتی ہے، کیوں اٹھاتا۔ مجھے اور بہت سا کام کرنا تھا اور میں اپنی جدوجہد کو کھادی کے پرچار تک محدود نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لئے کہ موجودہ سیاسی حالات کے مقابلے میں مجھے یہ ایک چھوٹی سی چیز معلوم ہوتی تھی۔ گاندھی جی کی غیر سیاسی مصروفیتیں مجھے ایک حد تک ناگوار تھیں اور ان کے خیالات کی جڑ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان دنوں وہ کھادی کے کام کے لئے چندہ کر رہے تھے اور اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ مجھے (دریدر نرائن) یعنی غریبوں کے خدا کے لئے روپیہ چاہیئے۔ غالباً اس سے ان کا یہ منشا تھا کہ وہ گھریلو صنعتوں کے ذریعے سے غریبوں کے لئے کام مہیا کرنا چاہتے ہیں مگر ان الفاظ کی تہ میں مفلسی کی عظمت کا خیال پوشیدہ تھا۔ گویا ان کے نزدیک خدا خاص طور پر غریبوں کا خدا ہے اور وہ اس کے برگزیدہ بندے ہیں۔ شاید مذہبی لوگوں کا سب کہیں یہی خیال ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی اس لئے کہ مجھے مفلسی قابل نفرت چیز معلوم ہوتی ہے جس کی ہرگز تعریف نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کا مقابلہ کرکے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ اس کا

لازمی نتیجہ تھا کہ میں اس نظام پر حملہ کروں جو لوگوں کے مفلس ہونے کو گوارا کرتا ہے بلکہ خود مفلسی پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ اس سے ہچکچاتے ہیں انھیں کسی نہ کسی طرح مفلسی کے وجود کی حمایت کرنی پڑتی ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال بسا ہوا ہے کہ دنیا میں دولت کی کمی ہے اور وہ کسی طرح دنیا کی اس حالت کا تصور نہیں کر سکتے جس میں سب کے لئے ضروریاتِ زندگی افراط سے مہیّا ہوں۔ غالباً ان کا یہ خیال ہے کہ غریب اور امیر کا فرق ہمیشہ باقی رہے گا۔

جب کبھی مجھے گاندھی جی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ امیر اپنی دولت کو عام لوگوں کی امانت سمجھیں۔ یہ بہت قدیم خیال ہے جو یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں بہت عام تھا اور ہندوستان میں اب تک پایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ انسان کس طرح اس کی توقع کر سکتا ہے یا اسے سماجی مسئلے کا حل سمجھ سکتا ہے۔

اسمبلی، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ایک اونگھتی سوتی جماعت ہوتی جاتی تھی اور اس کی روکھی پھیکی کارروائیوں میں بہت کم لوگ دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دن بھگت سنگھ اور بی۔ کے۔ دت نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ انھوں نے مہمانوں کی گیلری سے نیچے کی منزل میں دو بم پھینکے کسی کے زیادہ چوٹ نہیں آئی اور غالباً جیسا کہ ان ملزموں نے آگے چل کر بیان کیا، ان کا مقصد بھی کسی کو نقصان پہنچانا نہ تھا بلکہ محض ایک ہل چل پیدا کر دینا تھا۔

چنانچہ واقعی اسمبلی میں اور سارے ملک میں ایک ہل چل مچ گئی تخویف پسندوں کی دوسری کارروائیاں اس قدر بے ضرر نہ تھیں۔ ایک نوجوان انگریز افسر، جس کی نسبت یہ خیال تھا کہ اس نے لالہ لاجپت رائے کو مارا تھا، لاہور میں گولی سے ہلاک کر دیا گیا بنگال وغیرہ میں بھی پھر تخویف پسندوں کا زور ہو گیا تھا۔ حکومت

کی طرف سے کئی سازش کے مقدمے چلائے جا رہے تھے۔ نظر بندوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

لاہور کی سازش کے مقدمے میں پولیس نے عدالت میں عجیب عجیب حرکتیں کیں جس کی وجہ سے پبلک اس مقدمے کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوگئی۔ اکثر قیدیوں نے اس برتاؤ کے خلاف جو ان سے عدالت اور جیل خانوں میں ہوتا تھا بھوک ہڑتال شروع کردی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ یہ ہڑتال کس وجہ سے شروع ہوئی تھی مگر آگے چل کر اس کے مقاصد میں اس برتاؤ کا مسئلہ بھی شامل ہوگیا جو قیدیوں خصوصاً سیاسی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ بھوک ہڑتال ہفتوں چلتی رہی اور اس کی وجہ سے ملک میں ایک ہل چل مچ گئی۔ ملزم اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ انھیں عدالت میں لیجانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کارروائی بار بار ملتوی کرنی پڑتی تھی۔ اس پر حکومت ہند نے ایک نئے قانون کی رو سے عدالت کو یہ اجازت دے دی کہ ملزموں یا ان کے وکیلوں کی غیر موجودگی میں بھی مقدمے کی کارروائی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اس کی تحقیقات بھی کہ قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے انھیں کے سپرد کردی گئی۔

جس وقت بھوک ہڑتال کو شروع ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا میں لاہور میں موجود تھا۔ مجھے جیل خانے میں بعض قیدیوں سے ملنے کی اجازت دی گئی اور میں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے بھگت سنگھ کو عمر بھر میں پہلی بار دیکھا اور جتیندر ناتھ داس اور دوسرے قیدیوں سے بھی ملا۔ یہ سب کے سب بہت کمزور اور صاحب فراش تھے اور ان سے زیادہ بات چیت کرنے کا موقع نہ تھا۔ بھگت سنگھ کا چہرہ دلکش تھا اس سے ذہانت ٹپکتی تھی اور کچھ عجیب سکون و اطمینان کی کیفیت پائی جاتی تھی غصے کا اس میں نام تک نہ تھا۔ اس کی بات چیت اور سارے انداز میں ایک خاص نرمی تھی مگر شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک مہینے کے فاقے کے بعد ہر شخص

میں روحانیت اور نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ جتندر ناتھ داس اور بھی زیادہ حلیم معلوم ہوتا تھا اور اس کی لڑکیوں کی سی نرم اور بھولی صورت تھی۔ جس وقت میں نے اسے دیکھا وہ سخت تکلیف کی حالت میں تھا۔ آگے چل کر اکسٹھ دن کے فاقے کے بعد وہ دنیا سے گذر گیا۔

بھگت سنگھ کو سب سے زیادہ اس کی فکر تھی کہ وہ اپنے چچا سردار جیت سنگھ سے جو سنہ ۱۹۰۷ء میں لالہ لاجپت رائے کے ساتھ جلاوطن کئے گئے تھے ملے، یا کم از کم ان کی خیر خبر معلوم کرے۔ مدتوں سے وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک افواہ یہ سننے میں آئی تھی کہ انھوں نے جنوبی افریقہ میں سکونت اختیار کر لی ہے مگر کوئی یقینی بات نہیں معلوم ہو سکی۔ خدا جانے وہ اب زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

جتندر ناتھ داس کی موت سے سارے ملک میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ سیاسی قیدیوں سے بدسلوکی کا مسئلہ زور شور سے چھڑ گیا۔ حکومت نے اس کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس تحقیقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے قواعد بنائے گئے جن کی رو سے قیدیوں کے تین درجے قرار دئے گئے۔ سیاسی قیدیوں کا کوئی خاص درجہ نہیں رکھا گیا۔ ان قواعد سے کچھ اصلاح کی امید معلوم ہوتی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سے کوئی فرق نہیں پڑا اور قیدیوں کی حالت اب تک نہایت ناقابل اطمینان ہے۔

گرمی اور برسات گذر گئی اور خزاں کا موسم آ گیا۔ صوبوں کی کانگریس کمیٹیاں لاہور کانگریس کے صدر کے انتخاب میں مصروف تھیں۔ انتخاب کا عمل بہت طول طویل تھا اور اگست میں شروع ہو کر اکتوبر میں ختم ہوا کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں سب لوگ اس پر متفق تھے کہ گاندھی جی صدر بنائے جائیں۔ دوبارہ صدر منتخب ہونے سے کانگریس میں ان کا درجہ بڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ کئی سال سے مہا صدر مانے جاتے تھے مگر سب کا یہ خیال تھا کہ ملک میں لڑائی چھڑنے والی ہے جس کے سردار

واقعتاً وہی ہوں گے۔ اس لئے اگر قانوناً کانگریس کے سردار بھی وہی بنا دئے جائیں تو اچھا ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت میں کوئی اور ایسا تھا بھی نہیں جس پر سب کی نظریں پڑتیں۔

چنانچہ صوبوں کی کمیٹیوں نے گاندھی جی کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا مگر انھوں نے اسے منظور نہیں کیا۔ ان کا انکار بالکل صاف تھا لیکن اس میں مزید بحث کی گنجائش معلوم ہوتی تھی اور لوگوں کو امید تھی کہ وہ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کریں گے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ اس مسئلے کا آخری فیصلہ کرنے کے لئے لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اور آخر تک ہم سب کا یہ خیال تھا کہ وہ راضی ہو جائیں گے مگر وہ کسی طرح نہ مانے اور بالکل آخری لمحے میں انھوں نے میرا نام پیش کیا۔ ان کے آخری انکار سے کمیٹی گھبرا گئی اور اس کے ممبروں کو یہ بات کسی قدر ناگوار ہوئی کہ گاندھی جی نے انھیں بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ اس وقت اور کوئی صدر نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے انھوں نے چار ناچار مجھی کو منتخب کیا۔

مجھے کبھی اتنی تکلیف اور ذلت کا احساس نہیں ہوا تھا جتنا اس انتخاب کے موقع پر ہوا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بہت بڑی عزت ہے اور اگر میرا انتخاب معمولی طریقے سے ہوتا تو مجھے بے حد خوشی ہوتی مگر میں صدر دروازے سے تو کیا پہلو کے دروازے سے بھی داخل نہیں ہوا تھا بلکہ یکایک چور دروازے سے نکل پڑا تھا۔ لوگ حیران رہ گئے اور انھیں میری صدارت قبول کرنی پڑی۔ انھوں نے بگڑی بات بنا لی اور مجھے کڑوی دوا سمجھ کر پی گئے۔ میری خودداری کو ٹھیس لگی اور جی چاہا کہ اس اعزاز کو واپس کر دوں، مگر خوش قسمتی سے میں نے ضبط سے کام لیا ورنہ تماشا بن جاتا۔ میں بہت ملال اور افسردگی کی حالت میں چپکے سے اٹھ کر چلا گیا۔

غالباً اس فیصلے سے سب سے زیادہ خوشی میرے والد کو ہوئی۔ انھیں میرے

سیاسی خیالات پسند نہ تھے مگر مجھے چاہتے تھے اور میری ہر کامیابی سے بہت خوش ہوتے تھے وہ خود اکثر مجھ پر نکتہ چینی کرتے تھے اور مجھے جھڑک دیتے تھے مگر کسی اور کی مجال نہ تھی کہ مجھے ان کے سامنے برا کہے۔

میرا انتخاب میرے لئے بہت بڑی عزت اور بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ یہ پہلی مثال تھی کہ باپ کے بعد ہی بیٹا صدارت کی کرسی پر بٹھایا گیا۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ میں کانگریس کا سب سے کم عمر صدر ہوں (اس وقت میری عمر چالیس برس کی تھی)، لیکن یہ صحیح نہیں ہے میرے خیال میں گوکھلے جب کانگریس کے صدر ہوئے تو ان کی بھی قریب قریب یہی عمر تھی اور مولانا ابو الکلام آزاد نے (اگرچہ وہ مجھ سے کچھ بڑے ہیں) اس سے بھی کم عمر میں صدارت کی۔ مگر گوکھلے ۳۷۔۸ برس کی عمر میں پختہ کار مدبروں میں شمار ہوتے تھے اور مولانا ابو الکلام آزاد نے خاص اہتمام سے قابل احترام بوڑھوں کی سی شکل بنالی تھی جو ان کے علم و فضل کے شایان شان تھی مگر مجھے نہ تو لوگ مدبر سمجھتے تھے اور نہ کبھی مجھ پر علم و فضل کا الزام لگایا گیا اس لئے میں اب تک بڑھاپے کے شبہ سے بچا ہوا ہوں۔ حالانکہ میرے بال سفید ہو گئے ہیں اور میرا چہرہ میری عمر کے راز کو فاش کر رہا ہے۔

لاہور کانگریس کا وقت قریب آرہا تھا۔ اس اثنا میں واقعات کی رفتار آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود ان کے اندر قوت کام کر رہی ہے جو انھیں آگے بڑھائے لئے جاتی ہے۔ افراد خواہ اپنی کتنی ہی اہمیت سمجھتے ہوں مگر اصل میں انھیں اس تحریک میں بہت کم دخل تھا۔ انسان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی زبردست مشین کا ایک پرزہ ہے جو پوری قوت سے چل رہی ہے۔

غالباً تقدیر کے اس ریلے کو روکنے کی توقع میں حکومت نے ایک قدم آگے بڑھایا اور وائسرائے ہند لارڈ ارون نے یہ اعلان کیا کہ ایک "گول میز کانفرنس"

منعقد کی جائے گی۔ اس اعلان میں بڑی ہوشیاری سے ایسے الفاظ رکھے گئے تھے جن کے معنی ممکن تھا کہ بہت کچھ ہوں اور یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ نہ ہوں ہم میں سے اکثر لوگ دوسری صورت کو زیادہ قرین قیاس سمجھتے تھے۔ بہرحال اگر اس اعلان کے کچھ معنی تھے بھی تب بھی جو کچھ ہم چاہتے تھے اس سے بہت کم تھے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی بڑی بے صبری کے ساتھ لیڈروں کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد کی گئی۔ گاندھی جی، ہیر والد، اور وٹھل بھائی پٹیل (جو اب تک اسمبلی کے صدر تھے) اور اعتدال پسند لیڈروں میں سر تیج بہادر سپرو اور دوسرے حضرات وہاں موجود تھے۔ ان سب نے مل کر ایک متفقہ رزولیوشن یا اعلان تیار کیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ہم وائسرائے کا اعلان بعض اہم شرطوں کے ساتھ، جن کا پورا ہونا نہایت ضروری ہے قبول کرتے ہیں۔ اگر حکومت ان شرطوں کو منظور کرلے تو ہم اس کے ساتھ اتحاد عمل کر سکتے ہیں یہ واقعی اچھی خاصی اہم شرطیں تھیں (۱)۔

اس رزولیوشن کو سب جماعتوں کے نمائندوں سے جن میں اعتدال پسند بھی تھے اور انتہا پسند بھی منوالینا واقعی بڑی کامیابی تھی۔ کانگریس کے نصب العین سے یہ

---

(۱) وہ شرطیں یہ تھیں:۔

۱۔ مجوزہ کانفرنس میں جتنی بحثیں ہوں وہ اس بنیاد پر ہوں کہ ہندوستان کو نوآبادیات کا درجہ دیا جائے۔

۲۔ کانفرنس میں کانگریس کے نمائندوں کی تعداد غالب ہو۔

۳۔ سیاسی قیدیوں کو عام معافی دی جائے۔

۴۔ ہندوستان کی حکومت اسی وقت سے جہاں تک موجودہ حالات میں ممکن ہو نوآبادیات کی حکومت کے اصول پر چلائی جائے۔

بہت پست تھا۔ البتہ ایک متفقہ تجویز کے لحاظ سے خاصا بلند تھا۔ مگر اس میں ایک بڑا دھوکا تھا۔ ان شرطوں کے متعلق کم سے کم دو فریق مختلف نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ کانگریس والے تو انھیں واقعی ناگزیر چیز سمجھتے تھے جس کے بغیر اتحادِ عمل ممکن نہ تھا۔ ان کی طرف سے یہ کم سے کم مطالبہ تھا۔ یہ بات کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جو اس کے بعد منعقد ہوا بالکل صاف کر دی گئی اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ ان شرطوں کی میعاد کانگریس کے آئندہ اجلاس تک ہے مگر اعتدال پسندوں کے نزدیک یہ زیادہ سے زیادہ مطالبہ تھا اور اس پر اس حد تک زور دینے کی ضرورت نہ تھی کہ اتحادِ عمل سے انکار کر دیا جائے۔ رزولیوشن میں تو ان شرطوں کو اہم قرار دیا گیا تھا مگر وہ لوگ انھیں سرے سے شرطیں ہی نہیں سمجھتے تھے۔

چنانچہ باوجود اس کے کہ ان میں سے کوئی شرط پوری نہیں کی گئی اور ہم میں سے اکثر اور ہمارے ساتھ اور ہزاروں آدمی قید کر دیئے گئے مگر ہمارے اعتدال پسند اور مصالحت پسند دوستوں نے جو اس اعلان پر دستخط کرنے میں ہمارے شریک تھے، ہمیں قید کرنے والوں کے ساتھ پورا پورا اتحادِ عمل کیا۔

ہم میں سے اکثر کو شبہ تھا کہ ایسا ہی کچھ ہوگا۔ (اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ حضرات اس حد تک اتحادِ عمل کرنے پر تیار ہو جائیں گے) پھر بھی اس وقت تھوڑی بہت امید تھی کہ اس متحدہ فیصلے کی وجہ سے جس میں کانگریس والوں نے کسی قدر ضبط سے کام لیا تھا، اعتدال پسند اور دوسرے فریق بھی جنھیں بے سمجھے بوجھے حکومت سے اتحادِ عمل کرنے کی عادت ہے، اپنی اس خواہش کو ضبط کریں گے۔ ہم لوگوں کو جنھیں یہ سمجھوتا سخت ناپسند تھا سب سے زیادہ خیال اس کا تھا کہ ہم کانگریس کی جماعت میں پورا پورا اتحاد قائم رکھیں۔ ایک بہت بڑی لڑائی شروع ہونے والی تھی اس لیے ہم یہ ہرگز نہیں کر سکتے تھے کہ آپس میں تفریق ہونے دیں۔ یہ معلوم تھا کہ حکومت

ان شرطوں کو منظور نہیں کرے گی۔ اس لئے ہماری پوزیشن اور مضبوط ہوجائے گی اور ہم کانگریس کے نرم فریق کو بھی اپنی طرف کھینچ لیں گے چنانچہ ہی ہفتہ کی بات تھی دسمبر کا مہینہ اور لاہور کانگریس کچھ دور نہ تھی۔

پھر بھی ہمارے لئے یہ مشترکہ اعلان بہت ہی ناگوار چیز تھی۔ کامل آزادی کے مطالبے کو چھوڑنا خواہ وہ فرضی طور پر اور تھوڑی ہی مدت کے لئے کیوں نہ ہو غلط اور خطرناک پالیسی تھی اس لئے مجھ کو اس اعلان پر دستخط کرنے میں تامل تھا اور سوبھاش بوس نے تو قطعاً انکار کردیا تھا۔ پہلے میں نے بھی انکار کیا، مگر جیسا کہ میں اکثر کرتا ہوں، سب کے کہنے سننے سے دستخط کردئے۔ پھر بھی مجھے سخت صدمہ تھا اور دوسرے ہی دن میں نے کانگریس کی صدارت سے استعفا دینے کا ارادہ کرلیا اور گاندھی جی کو خط کے ذریعے سے اس کی اطلاع دی۔ غالباً میں دل سے استعفا دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ میں واقعی بے حد پریشان تھا۔ گاندھی نے ایک تسکین دہ خط لکھا اور تین دن غور کرنے کے بعد میرا جوش ٹھنڈا ہوگیا۔

لاہور کانگریس سے تھوڑے ہی دن پہلے کانگریس اور حکومت کے درمیان سمجھوتے کی ایک آخری کوشش کی گئی۔ لارڈ اردن سے ملاقات کا انتظام کیا گیا مجھے نہیں معلوم کہ اس ملاقات کی تحریک کس نے کی تھی مگر میرا خیال یہ ہے کہ شاید وٹھل بھائی پٹیل اس کے محرک تھے۔ گاندھی جی اور میرے والد کانگریس کے خیالات کی نمائندگی کررہے تھے اور شاید مسٹر جناح، سر تیج بہادر سپرو اور پریسیڈنٹ پٹیل بھی موجود تھے۔ اس ملاقات سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ گفتگو کی کوئی مشترک بنیاد نہیں تھی، اور دونوں بڑے فریقوں، یعنی حکومت اور کانگریس کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ غرض اب کانگریس کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ عملی کارروائی شروع کرے۔ کلکتے میں جو ایک سال کی مہلت دی گئی تھی وہ ختم ہورہی

تھی۔ اب قطعی طور پر اس کا اعلان کرنا تھا کہ کانگرس کا مقصد کامل آزادی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے عملی تدابیر اختیار کرنی تھیں۔

لاہور کانگرس سے پہلے کے ہفتوں میں مجھے ایک اور اہم کام درپیش تھا۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کا اجلاس ناگپور میں ہونے والا تھا اور مجھے اس میں صدارت کرنی تھی یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ ایک ہی شخص چند ہفتے کے اندر نیشنل کانگرس اور ٹریڈ یونین کانگرس کی صدارت کرے۔ مجھے یہ امید تھی کہ میں دونوں کے درمیان ایک واسطے کا کام کروں گا اور انھیں ایک دوسرے سے قریب تر کردوں گا تاکہ کانگرس میں اشتراکیت اور مزدوروں کی حمایت کا جذبہ بڑھ جائے اور مزدور قومی تحریک میں شامل ہو جائیں۔

شاید یہ امید بالکل بے بنیاد تھی اس لئے کہ قومیت اشتراکیت کی راہ پر زیادہ دور اسی وقت تک چل سکتی ہے جب وہ قومیت نہ رہے۔ پھر بھی میرا یہ خیال تھا کہ اگرچہ کانگرس پر متوسط طبقے کے لوگوں کا رنگ غالب ہے لیکن ملک میں وہی ایک موثر انقلابی قوت ہے۔ اس لئے مزدوروں کو چاہیئے کہ اس سے اتحاد عمل کریں اور اس پر اپنا اثر ڈالیں مگر اپنی مستقل حیثیت اور اپنے خاص خیالات کو قائم رکھیں اور میں سمجھتا تھا کہ واقعات کی رفتار سے اور عملی جدوجہد کی شرکت کی وجہ سے کانگرس میں اور زیادہ انتہا پسندی پیدا ہو جائے گی اور وہ سماجی اور معاشی مسائل سے نپٹنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ پچھلے چند سال میں کانگرس کی توجہ زیادہ تر کسان اور گاؤں کی طرف رہی تھی، اگر یہی رفتار جاری رہتی تو وہ رفتہ رفتہ ایک بہت بڑی کسانوں کی انجمن بن جاتی یا کم سے کم اس میں کسانوں کا اثر بہت بڑھ جاتا۔ ہمارے صوبہ متحدہ میں اب بھی ضلع کی کانگرس کمیٹیوں میں کسانوں کے نمائندوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ اگرچہ ان کے لیڈر اوسط طبقے کے پڑھے لکھے

لوگ تھے۔

اس طرح اس بات کا امکان تھا کہ شہر اور گاؤں کی نزاع، جو ہمیشہ سے چلی آتی ہے نیشنل کانگرس اور ٹریڈ یونین کانگرس کے تعلقات پر اثر ڈالے گی مگر یہ امکان بعید تھا کیونکہ موجودہ نیشنل کانگرس متوسط طبقے کے شہریوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب تک کہ قومی آزادی کا مسئلہ طے نہ ہوگا اس پر قومیت کا رنگ غالب رہیگا۔ اور ملک میں اسی جذبے کا زور رہے گا۔ پھر بھی مجھے مناسب معلوم ہوا کہ کانگرس اور مزدوروں کی جماعت کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کیجائے اور صوبہ متحدہ میں ہم نے یہاں تک کیا کہ صوبے کی کانگرس کمیٹی میں ٹریڈ یونین کانگرس کی شاخ کے نمائندوں کو بھی دعوت دی۔ بہت سے کانگرسیوں نے بھی مزدوروں کی جدوجہد میں نمایاں حصّہ لیا۔

مگر مزدوروں کا انتہا پسند فریق نیشنل کانگرس سے دور ہی دور رہنا چاہتا تھا۔ انھیں اس کے لیڈروں پر اعتبار نہ تھا اور وہ اس کے خیالات کو متوسط طبقے کے رجعت پسندانہ خیالات سمجھتے تھے۔ سچ پوچھئے تو مزدوروں کے نقطۂ نظر سے یہ بات صحیح بھی تھی۔ نیشنل کانگرس جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر تھا قومیت پسندوں کی انجمن تھی۔

۱۹۲۹ء میں شروع سے آخر تک ہندوستان کے ٹریڈ یونین کے حلقوں میں ایک نئی چیز نے یعنی اس رائل کمیشن نے جو ہندوستان کے مزدوروں کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور وہٹلے کمیشن کہلاتا تھا ایک ہنگامہ برپا کر رکھا۔ انتہا پسند فریق کمیشن کا بائیکاٹ کرنا چاہتا تھا اور اعتدال پسند اتحادِ عمل کرنے پر تیار تھے۔ اس میں شخصی عنصر بھی شامل ہو گیا تھا اس لئے کہ اعتدال پسند فریق کے بعض لیڈر کمیشن کے ممبر بنائے جا رہے تھے اور بہت سی باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی

میری ہمدردی انتہا پسند فریق کے ساتھ تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ نیشنل کانگریس کی پالیسی بھی یہی تھی۔ ایسی حالت میں جب ہم عملی جدوجہد کے لئے تیار تھے۔ سرکاری کمیشنوں سے اتحاد عمل کرنا مہمل سی بات معلوم ہوتی تھی۔

ناگپور کی ٹریڈ یونین کانگریس میں وھٹلے کمیشن کے بائیکاٹ کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس میں اور بہت سے اور نزاعی مسائل میں انتہا پسند فریق کو کامیابی ہوئی۔ میرا حصہ اس کانگریس کی کارروائی میں محض برائے نام تھا چونکہ میں اس میدان میں نیا نیا آیا تھا اور ابھی تک حالات سے اچھی طرح واقف نہ تھا اس لئے دخل دیتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ عام طور پر انتہا پسند فریق کے خیالات سے اتفاق کرتا رہا مگر جلسے کی کارروائی میں میں نے کسی فریق کا ساتھ نہیں دیا اور بجائے صدر کے ایک غیر جانب دار مقرر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ چنانچہ ٹریڈ یونین کانگریس میں تفریق ہوگئی۔ اعتدال پسند جماعت نے ایک نئی انجمن بنالی اور میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ ذاتی طور پر میرا یہ خیال تھا کہ اعتدال پسند جماعت علیحدگی اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں ہے مگر اس میں انتہا پسند جماعت کا بھی قصور تھا اور اس نے انہیں الگ ہونے پر ایک حد تک مجبور کردیا تھا۔ ان دونوں فریقوں کے بیچ میں ایک درمیانی فریق تھا مگر وہ بالکل بے بس تھا۔ شاید اگر اس فریق کو اچھے لیڈر مل گئے ہوتے تو وہ ٹریڈ یونین کانگریس میں تفریق نہ پیدا ہونے دیتا اور اگر تفریق ہو بھی جاتی تو اس کے اتنے افسوسناک نتائج نہ ہوتے جتنے آگے چل کر پیدا ہوئے۔

موجودہ صورت میں ہندوستان کی ٹریڈ یونین کی تحریک کو بہت سخت دھچکا پہنچا جس سے وہ ابھی تک پنپنے نہیں پائی ہے۔ حکومت پہلے ہی مزدوروں کے انتہا پسند فریق کے خلاف اعلان جنگ کرچکی تھی اور میرٹھ کا مقدمہ اس کا پہلا نتیجہ تھا۔ یہ جنگ برابر جاری رہی۔ کارخانے کے مالکوں نے بھی اس موقع سے پورا

فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء کے جاڑے سے دنیا میں کساد بازاری شروع ہوگئی تھی۔ ایک تو اس کا اثر مزدوروں پر پڑ رہا تھا، دوسرے ان پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے، تیسرے ان کی ٹریڈ یونین کی تحریک انتہائی پستی کو پہنچ گئی تھی۔ غرض ان کے لئے بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ وہ اپنی حالت کو روز بروز بگڑتے ہوئے دیکھتے تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ دو ایک سال کے بعد ٹریڈ یونین کانگریس میں ایک اور تفریق ہوئی اور اشتمالیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت الگ ہوگئی۔ اب اصولی حیثیت سے ہندوستان میں تین ٹریڈ یونین تھیں۔ اعتدال پسند جماعت، اصل ٹریڈ یونین کانگریس اور اشتمالیوں کا گروہ۔ عملی حیثیت سے یہ سب کمزور اور بے اثر تھے اور ان کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے عام مزدور بہت بددل ہو گئے تھے۔ مجھے ۱۹۳۰ء کے بعد سے ان تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں رہا اس لئے کہ میں زیادہ تر جیل میں رہا۔ رہائی کے مختصر اوقات میں مجھے معلوم ہوا کہ اتحاد کی کوششیں ہو رہی ہیں مگر ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔(۱) اعتدال پسند جماعت کی قوت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ ریلوے کے مزدور ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ انھیں دوسری جماعتوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ حکومت ان کی انجمن کو تسلیم کرتی ہے اور جینوا کی لیبر کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے ان کی تجویزوں کو قبول کر لیتی ہے۔ جینوا جانے کے شوق میں مزدوروں کے بعض لیڈر ان کے ساتھ شریک ہو گئے ہیں اور اپنی انجمنوں کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لائے ہیں۔

---

(۱) اس کے بعد ٹریڈ یونین کی تحریک کے اتحاد میں کچھ کامیابی ہوئی ہے اور مختلف جماعتیں ایک حد تک آپس میں اتحاد عمل کر رہی ہیں۔

(۲۸)

کامل آزادی کا رزولیوشن اور اُس کے نتائج

لاہور کانگریس کی جیتی جاگتی تصویر اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے یہ قدرتی بات ہے اس لئے کہ وہاں مجھے کچھ دن کے لئے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی میں ان جذبات پر غور کیا کرتا ہوں جو اس مصروفیت کے زمانے میں میرے دل میں موجزن تھے۔ لاہور کے لوگوں نے بہت بڑے پیمانے پر اور بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جوش و خروش میری ذات کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک اصول کے لئے ہے جس کا مظہر میں ہوں۔ پھر بھی ایک انسان کے لئے یہ بہت بڑی چیز تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہزارہا آدمیوں کی نظروں میں اور ان کے دلوں میں اس اصول کا مظہر بن جائے۔ مجھ پر عجیب بیخودی اور مسرت کا عالم طاری تھا مگر جو زبردست مسائل اس وقت درپیش تھے ان کے مقابلے میں میرے ذاتی جذبات کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ ساری فضا میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑی ہوئی تھی اور موقع کی اہمیت کا خیال چھایا ہوا تھا ہم لوگ محض اظہار خیال یا نکتہ چینی یا احتجاج کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ عمل کی دعوت دینے کے لئے جس کے متعلق یقین تھا، کہ یہ سارے ملک کو ہلا دے گا، اور لاکھوں آدمیوں کی زندگی پر اثر ڈالے گا۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر ہمارا اور ہمارے ملک کا کیا انجام ہوگا۔ مگر اس وقت یہ ظاہر تھا کہ ہم کو اور ہمارے عزیزوں کو بڑی کش مکش اور مصیبت کا سامنا ہے۔ اس خیال نے ہمارے جوش و خروش میں ایک سنجیدگی کی شان پیدا کردی تھی اور ہم اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ ہر ووٹ کے ساتھ ہم آرام و آسائش کو، گھر کی خوشیوں کو اور دوستوں کی صحبت کو خیرباد کہہ رہے تھے اور دن رات کی تنہائی اور جسمانی اور روحانی تکلیف کو دعوت دے رہے تھے۔

کامل آزادی کا اصل رزولیوشن اور آزادی کی عملی تجویز تقریباً متفقہ طور پہ پاس ہوگئی۔ ہزاروں میں سے صرف پندرہ بیس آدمیوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ البتہ ایک ضمنی مسئلے پر جو ترمیم کی صورت میں پیش ہوا، واقعی ووٹ لینے کی نوبت آئی۔ یہ ترمیم کثرت رائے سے مسترد ہوگئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ رائے شماری کے نتیجے اور اصل رزولیوشن کی منظوری کا اعلان ۳۱ دسمبر کو ٹھیک بارہ بجے رات کو ہوا جب پرانا سال جا رہا تھا اور نیا سال آ رہا تھا۔ یعنی عین اس وقت جب کلکتہ کانگرس کی مقرر کی ہوئی ایک سال کی میعاد ختم ہوئی، نئی پالیسی کا فیصلہ کیا گیا اور لڑائی کی تیاری شروع ہوگئی۔ ریل نے سیٹی دے دی تھی مگر ہمیں ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کب چلے گی اور کیسے چلے گی۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ لڑائی کا نقشہ بنائے اور اس پر عمل کرے مگر سب جانتے تھے کہ حقیقی فیصلہ گاندھی جی کے ہاتھ میں رہے۔

لاہور کانگرس میں صوبہ سرحد سے بھی بہت سے لوگ آئے تھے۔ اس صوبے کے تھوڑے سے بہت نمائندے کانگرس میں ہمیشہ شریک ہوا کرتے تھے۔ چند سال سے خان عبدالغفار خاں بھی آتے تھے اور ہمارے مشوروں میں

حصہ لیتے تھے مگر لاہور میں پہلی بار سرحد کے پُرجوش نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو کل ہندوستان کی سیاسی تحریک سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ ان کے صاف دلوں پر اس کا بہت اثر پڑا، اور وہ اپنے دلوں میں سارے ہندوستان کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک ہونے کا احساس لئے ہوئے اور جوش میں بھرے ہوئے لوٹے۔ یہ سیدھے سادے عملی آدمی تھے اور انھیں ہندوستان کے اور صوبوں کے لوگوں کی طرح لفاظی اور سخن سازی نہیں آتی تھی۔ انھوں نے فوراً اپنی تنظیم اور نئے خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ انھیں اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور سرحد کے مردوں اور عورتوں نے جنھیں ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب کے بعد شریک ہونے کا موقع ملا تھا ۱۹۳۰ء سے اس میں بہت نمایاں اور حیرت انگیز حصہ لیا۔

لاہور کانگریس کے تھوڑے ہی دن بعد، اس کے حکم کے مطابق، میرے والد نے اسمبلی اور کونسلوں کے کانگریسی ممبروں کو ہدایت کی کہ وہ کونسلوں کی ممبری سے استعفا دیدیں۔ قریب قریب سب نے ایک ساتھ استعفا دیدیا مگر چند حضرات نے انکار کر دیا۔ حالانکہ یہ صریحاً اس وعدے کے خلاف تھا جو انھوں نے انتخاب کے وقت کیا تھا۔

ابھی تک ہم مستقبل کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ باوجود اس جوش و خروش کے جس کا اظہار کانگریس کے اجلاس میں ہوا تھا، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ملک ہمارے مجوزہ پروگرام پر کس حد تک عمل کرے گا۔ ہم واپسی کی سب راہیں بند کرکے آگے بڑھے تھے۔ پیچھے ہٹنا ممکن نہ تھا مگر جو منزل ہمارے سامنے تھی وہ بے بہانی بے دیکھی منزل تھی۔ اپنی تحریک کا افتتاح کرنے اور ملک کے مزاج کا اندازہ کرنے کے لئے ہم نے ۲۶ جنوری کو "یوم آزادی" قرار دیا اور یہ طے کیا کہ اس روز سارے ملک میں

آزادی کا عہدہ لیا جائے۔

ہمیں اپنے پروگرام کی کامیابی میں شبہ تھا مگر ہمارے جوش کا یہی تقاضا تھا کہ کوئی موثر عملی قدم اٹھائیں۔ چنانچہ ہم واقعات کی رفتار کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں شروع جنوری میں الہ آباد میں تھا۔ والد زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ غالباً اس سال کمبھ کا میلہ تھا اور لاکھوں مردوں عورتوں کے قافلے الہ آباد، جسے یاتری شری پریاگ کہتے ہیں چلے آ رہے تھے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ زیادہ تر تو کسان تھے۔ مگر مزدوروں دکانداروں، کاریگروں، تاجروں اور تعلیم یافتہ پیشہ ور لوگوں کی خاصی تعداد بھی اس عظیم الشان مجمع کو قطار در قطار دریا سے آتے جاتے دیکھ کر میں یہ سوچتا تھا کہ اگر ان لوگوں کو سول نافرمانی اور پا امن عملی جدوجہد کی دعوت دی جائے تو ان پر کیا اثر ہوگا۔ ان میں کتنے ہیں جنھیں لاہور کے فیصلوں کا علم ہے یا ان کی کچھ پروا ہے کتنی عجیب و غریب قوت ہے اس عقیدے میں جو انھیں ہندوستان کے گوشے گوشے سے گنگا اشنان کے لئے کھینچ لاتا ہے! کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ اس زبردست جوش عمل کا رخ کسی حد تک سیاسی اور معاشی جدوجہد کی طرف پھیر دیں جس میں خود انھیں کی بھلائی ہے؟ یا ان کے دل مذہب کی ظاہری رسموں اور روایتوں سے اس قدر معمور ہیں کہ ان میں دوسرے خیالات کی گنجائش ہی نہیں؟ مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ دوسرے خیالات بھی ان کے دلوں میں موجود ہیں اور صدیوں کے سکون اور خاموشی میں ہل چل پیدا کر رہے ہیں۔ انہی دھندلے سے خیالات اور خواہشات کے عام لوگوں میں پھیل جانے کی وجہ سے پچھلے بارہ سال میں یہ شورشیں برپا ہوئیں جنھوں نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں، کہ یہ خیالات دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں جن میں قوت کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ مگر پھر بھی مجھے شک تھا اور میرے دل میں بہت سے سوالات اٹھتے تھے جن کا اس وقت کوئی جواب

نہیں تھا۔ یہ خیالات کہاں تک پھیل چکے ہیں؟ ان کے ساتھ کس قدر طاقت ہے، منظم عمل اور برداشت کی کتنی قوت ہے؟

بہت سے یاتری ہمارے یہاں بھی آتے تھے۔ ہمارا گھر ایک تیرتھ کے قریب تھا جو "بھاردوج" کہلاتا ہے اور جہاں پرانے زمانے میں ایک ابتدائی یونیورسٹی تھی۔ میلے کے دنوں میں ہمارے یہاں صبح سے شام تک لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ میرے خیال میں ان میں سے اکثر محض اس شوق میں آتے تھے کہ ان مشہور لوگوں کو جن کا نام سنا کرتے ہیں، خصوصاً میرے والد کو دیکھ لیں۔ مگر بہت سے سیاسی احساس بھی رکھتے تھے اور کانگرس کے متعلق سوالات کرتے تھے کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے اور اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ اپنی معاشی مشکلات کا دکھڑا سناتے تھے اور پوچھتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے، وہ ہمارے سیاسی نعروں کو جانتے تھے اور دن بھر ہمارا گھر ان نعروں سے گونجتا رہتا تھا۔ پہلے تو میں بیس بیس، پچاس پچاس سو سو آدمیوں کی ٹولیوں سے جو باری باری سے آتی تھیں، دو چار باتیں کرتا تھا مگر جب دیکھا کہ اس سلسلے کا جاری رکھنا ناممکن ہے تو یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو ٹولی آتی اسے چپ چاپ سلام کر لیتا۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو میں نے چاہا کہ چھپ کر بیٹھ رہوں۔ مگر یہ کوشش بالکل بیکار تھی۔ نعروں کی گونج بڑھتی جاتی تھی، مکان کے برآمدے ان مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے، اور ہر کھڑکی اور دروازے سے لوگ اندر جھانک رہے تھے۔ گھر والوں کو چلنا پھرنا، کام کرنا، باتیں کرنا، کھانا کھانا دشوار تھا۔ اس سے نہ صرف الجھن بلکہ کوفت ہوتی تھی۔ مگر یہ لوگ کسی طرح نہیں مانتے تھے۔ ان کی آنکھیں پریم کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ صدیوں کے افلاس اور مصیبت کے بوجھ سے دبے ہوئے دل شکر گزاری اور محبت کے دریا بہا رہے تھے اور اس کے بدلے میں انسانی ہمدردی اور دلسوزی کے

سوا اور کچھ نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ الفت و عقیدت کے اس سیلاب کو دیکھ کر دل پر عجز اور رعب نہ چھا جائے۔

ان دنوں ہماری ایک عزیزہ دوست ہمارے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان سے باتیں کرنا مشکل تھا کیونکہ چار چار پانچ پانچ منٹ کے بعد مجھے باہر جا کر ان لوگوں سے جو وہاں اکٹھے ہو جاتے تھے، دو چار باتیں کرنی پڑتی تھیں اور بیچ بیچ میں ان کے شور و غل اور نعروں کی آواز چین نہیں لینے دیتی تھی۔ وہ میری یہ مصیبت دیکھ رہی تھیں اور اس سے لطف اٹھا رہی تھیں اور ان پر ایک حد تک اس ہر دلعزیزی کا رعب پڑ رہا تھا جو وہ میری طرف منسوب کرتی تھیں (حالانکہ اصل میں یہ کشش میرے والد کی تھی اور مجھے ان کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے گھیر لیا تھا) وہ یکایک مجھ سے پوچھ بیٹھیں کہ تمہیں یہ اظہار عقیدت پسند نہیں؟ کیا تم اس پر فخر نہیں کرتے؟ مجھے جواب دینے میں تامل ہوا جس سے وہ یہ سمجھیں کہ شاید اس ذاتی سوال سے مجھے حجاب آتا ہے اور معذرت کرنے لگیں۔ حجاب تو مجھے نہیں تھا مگر اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ میں کچھ کھو سا گیا اور اپنے احساسات پر غور کرنے لگا۔

میرے دل میں اس وقت طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قریب قریب اتفاقی طور پر میں عام لوگوں میں بہت ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ بھی میری قدر کرتے تھے اور نوجوان مردوں اور عورتوں کی نظر میں تو میں ہیرو بن گیا تھا اور ایک رومان کے ہالے میں گھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میری شان میں گیت گائے جاتے تھے اور عجیب بے سر و پا کہانیاں مشہور تھیں۔ میرے مخالف تک میری تعریف کرتے تھے اور مربیانہ انداز میں فرماتے تھے کہ اس شخص میں قابلیت اور خلوص کی کمی نہیں ہے۔

ان سب باتوں سے متاثر نہ ہونا یا تو ولی کا کام تھا یا شیطان کا اور میں دونوں میں سے ایک بھی نہ تھا مجھ پر ان کا بڑا اثر ہوا یعنی ایک فخر و مسرت کا نشہ سا چھا گیا اور میرے دل میں اعتماد نفس اور قوت کا احساس ابھر آیا۔ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر سے دیکھنا بہت مشکل کام ہے مگر میرا خیال ہے کہ مجھ میں کسی قدر خود داری اور تحکم پسندی پیدا ہو گئی۔ پھر بھی میں کچھ زیادہ مغرور نہیں تھا، مجھے اپنی قابلیت کا صحیح اندازہ تھا اور میں بے جا انکسار سے کام نہیں لیتا تھا، مگر یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھ میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور مجھے اپنی خامیوں کا پورا پورا احساس تھا۔ غالباً مشاہدہ نفس کی عادت کی وجہ سے میرے دماغ کا توازن قائم تھا اور میں بہت سے واقعات پر، جو میری ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ بے لاگ نظر سے غور کر سکتا تھا۔ قومی زندگی کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ہر دلعزیزی اکثر برے آدمیوں کو بھی حاصل ہو جاتی ہے اور یہ نیکی یا قابلیت کی لازمی نشانی نہیں ہے اب سوال یہ تھا کہ مجھے یہ ہر دلعزیزی اپنی خوبیوں کی وجہ سے حاصل ہے یا اپنی خامیوں کی وجہ سے؟ آخر اس کا راز کیا ہے؟

اس کا سبب ذہنی قابلیت تو ہو نہیں سکتی تھی اس لئے کہ نہ مجھ میں کوئی خاص علمی لیاقت تھی اور نہ علمی لیاقت سے ہر دلعزیزی حاصل ہوا کرتی ہے اب رہیں میری نام نہاد قربانیاں، تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں سیکڑوں، ہزاروں آدمیوں نے مجھ سے کہیں زیادہ تکلیفیں اٹھائیں یہاں تک کہ اپنی جان و مال ملک پر قربان کر دیا۔ ہیرو یا سورما کی حیثیت سے میری شہرت محض فرضی ہے مجھ میں سورمائی کا جذبہ مطلق نہیں ہے بلکہ لوگ جو ناٹک کا سا رستمانہ انداز اختیار کر لیا کرتے ہیں وہ مجھے ایک احمقانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ اور رومان تو مجھے چھو بھی نہیں گئی ہے۔ کسی قدر جسمانی اور ذہنی جرأت مجھ میں ضرور ہے مگر

یہ غالباً میرے ذاتی، خاندانی اور قومی غرور اور خودرائی کی عادت پر مبنی ہے جس کی وجہ سے میں دوسروں کے دباؤ سے کوئی کام نہیں کرسکتا۔

میں نے بہت سوچا مگر اس سوال کا کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ اب میں نے ایک پہلو سے غور کرنا شروع کیا۔ لوگوں کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی، کہ میرے اور میرے والد کے کپڑے دُھلنے کے لئے ہر ہفتے پیرس بھیجے جاتے ہیں ہم نے لاکھ تردید کی مگر اس روایت کی شہرت کم نہ ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے بڑھ کر لغو حرکت اور کیا ہوسکتی ہے اور اگر کوئی ریاست کی شان دکھانے کے لئے ایسی فضول خرچی کرے تو وہ اول درجے کی حماقت کے طعنے کا مستحق ہے۔

اسی طرح ایک اور روایت مشہور تھی کہ میں اسکول میں شاہزادہ ویلس کے ساتھ ساتھ پڑھتا تھا اور جب وہ سنہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان آئے تو انھوں نے مجھ سے ملنا چاہا مگر میں جیل میں تھا۔ حالانکہ ان کا ہم جماعت ہونا تو درکنار مجھے آج تک ان سے ملاقات یا گفتگو کرنے کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ میری شہرت یا ہر دلعزیزی اس قسم کی روایتوں پر منحصر ہے ممکن ہے کہ اس کی بنیاد زیادہ مضبوط ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ لوگوں نے اس بنیاد پر امارت اور ریاست کی ان کہانیوں کی عمارت کھڑی کردی ہے۔ کم سے کم یہ خیال ضرور ہے کہ اعلا طبقے کے لوگوں سے ملنے جلنے اور عیش و عشرت میں بسر کرنے کا عادی ہوتے ہوئے میں نے ان سب چیزوں کو ترک کردیا اور اس بات کی ہندوستانیوں کے دل میں بڑی قدر ہے۔ مگر مجھے یہ شہرت کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ میں فاعلی خوبیوں کو انفعالی خوبیوں پر ترجیح دیتا ہوں اور ترک لذات اور قربانی میرے نزدیک بجائے خود کوئی بڑی خوبی نہیں ہے۔ البتہ ایک ذہنی اور روحانی تربیت کی حیثیت سے یہ قابل قدر چیز ہے اور اسی قدر ضروری ہے

جیسے ایک ورزشی کے لئے سادہ اور باقاعدہ زندگی بسر کرنا۔ ان لوگوں کے لئے جو بڑے بڑے کاموں میں دخل دیتے ہیں، تکلیف برداشت کرنے اور ہر طرح کی سختیوں کے باوجود مستقل مزاج رہنے کی قوت ناگزیر ہے۔ مگر مجھے رہبانیت کا اصول یعنی زندگی کی نفی کرنا اور اس کی لذتوں اور مسرتوں کو ڈر کر چھوڑ دینا ہرگز پسند نہیں۔ میں نے جان بوجھ کر کسی چیز کو جس کی میں واقعی قدر کرتا ہوں ترک نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کا قدر کا پیمانہ ہی بدل جائے۔

میری دوست نے جو سوال کیا تھا کہ تمہیں لوگوں کے اظہار عقیدت پر فخر ہے یا نہیں اس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا تھا اور اور اس سے بھاگنا چاہتا تھا مگر اس کی عادت سی پڑ گئی تھی اور جب یہ نہ ہو تو اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ غرض دونوں طرح مشکل تھی مگر مجموعی طور پر لوگوں کا یہ جوش میری ایک اندرونی ضرورت کو پورا کرتا تھا۔ یہ خیال کہ میں ان پر اثر ڈال سکتا ہوں اور ان میں عمل کا ولولہ پیدا کر سکتا ہوں، میرے دل میں ان کے دل و دماغ پر حکومت کا احساس پیدا کرتا تھا اور ایک حد تک میری قوت پسندی کو تسکین دیتا تھا۔ دوسری طرف ان لوگوں کو بھی مجھ پر ایک غیر محسوس حکومت حاصل تھی اس لئے کہ ان کے اعتماد اور محبت سے میرے دل کی گہرائیوں میں ایک ہیجان اور میرے جذبات میں ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ باوجود میری انفرادیت پسندی کے کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ انفرادیت کے بند ٹوٹ گئے ہیں اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ان غریبوں کے ساتھ مصیبت کے بھنور میں ڈوب جانا اس سے بہتر ہے کہ میں اکیلا کنارے پر پہنچ جاؤں۔ مگر اصل میں یہ بند اس قدر مضبوط تھے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹتے تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

غرور کا قاعدہ ہے کہ مٹاپے کی طرح آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے اور انسان

کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ خوش قسمتی سے دنیا کی سختیاں اسے کم کر دیتی ہیں بلکہ کچل دیتی ہیں۔ گذشتہ چند سال سے ہم لوگ ہندوستان میں ایسی بہت سی سختیاں اٹھاتے رہے ہیں۔ "طوفان حوادث" کے مکتب میں موجوں کے تھپیڑے ہمارے لئے "سیلیٔ استاد" کا کام دیتے رہے ہیں۔

یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ میرے عزیزوں، دوستوں اور رفیقوں کی بہت بڑی تعداد ہے جن کی وجہ سے میری نظر کا توازن اور دماغ کا تناسب قائم رہا۔ عام جلسوں اور میونسپلٹی ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے ایڈریسوں سے میرے اعصاب پر بہت زور پڑتا تھا اور مجھے یہ چیزیں مہمل اور اصلیت سے خالی معلوم ہوتی تھیں۔ ان ایڈریسوں کی عبارت اتنی پُرتکلف اور مبالغہ آمیز ہوتی تھی اور لوگوں کے چہروں پر اس قدر تقدس اور سنجیدگی برستی تھی کہ بعض اوقات میرا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ زور سے قہقہہ لگاؤں، یا زبان نکال دوں، یا سر کے بل کھڑا ہو جاؤں تاکہ اس باوقار مجلس کی گھبراہٹ اور ان کے چہروں کی کیفیت دیکھ کر لطف آئے مگر میری شہرت اور ہندوستان کی قومی زندگی کی متانت اور ثقاہت کے حق میں یہ اچھا ہوا کہ میں نے اس قسم کی کوئی پاگل پن کی حرکت نہیں کی اور عموماً ادب قاعدے کا لحاظ رکھا مگر کبھی کبھی کسی جلسے میں یا زیادہ تر جلوس میں میں نے عاجز آکر اپنے جذبات کا اظہار بھی کر دیا۔ کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ میرے اعزاز میں جلوس نکالا گیا اور میں اپنی بیوی یا کسی اور شخص کو بگھی یا موٹر میں بٹھا کر اور خود مجمعے میں گھس کر غائب ہو گیا۔

عام مجمعوں میں ہمیشہ اپنے جذبات کو روکنے اور آداب مجلس کا خیال رکھنے سے طبیعت پر بہت زور پڑتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ انسان ایسے موقعوں پر کچھ گھمری اور روٹھی ہوئی سی شکل بنا لیتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ہندوؤں کے ایک رسالے میں مجھے ہندو بیوہ سے تشبیہ دی گئی تھی، اگرچہ میں پرانی وضع

کی ہندو بیواؤں کو بہت قابل قدر سمجھتا ہوں، مگر سچ پوچھئے تو اس کہنی سے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ مضمون لکھنے والے کو بظاہر میری تعریف مقصود تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ میں حلم، صبر اور ایثار کی صفات موجود ہیں اور میں افسردگی اور اداسی کے ساتھ دن رات اپنے فرض کے انجام دینے میں مصروف رہتا ہوں۔ حالانکہ میں اپنے خیال میں خاصا بذلہ سنج اور ہنسنے ہنسانے والا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہندو بیوائیں بھی ایسی ہی ہو جائیں۔ ایک بار گاندھی جی نے ایک شخص سے کہا تھا کہ اگر ان میں ظرافت کا مادہ نہ ہوتا تو وہ خودکشی کر لیتے۔ میں اس حد تک تو نہیں جا سکتا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر کچھ لوگوں کی بدولت زندگی میں ظرافت کی چاشنی نہ ہوتی تو مجھے زندگی اجیرن ہو جاتی۔

میرے خاندان والے اور بے تکلف دوست میری ہر دلعزیزی کی اور ان شاندار ایڈریسوں کی ہنسی اڑاتے تھے جو میرے سامنے پیش ہوا کرتے تھے اور جن میں (ہندوستان کے دستور کے مطابق) نہایت رنگین بیانی اور مبالغے سے کام لیا جاتا تھا۔ میری بیوی اور بہنیں چھانٹ چھانٹ کر پر تکلف اور شاندار الفاظ اور خطاب جو قومی تحریک کے لیڈروں کے لئے وضع کئے گئے تھے بے ادبی سے ہر وقت میرے لئے استعمال کیا کرتی تھیں۔ کبھی مجھے "بھارت بھوشن" (گوہر تابان ہند) کہہ کر پکارتی تھیں، کبھی "تیاگ مورتی" (ایثار مجسم) کہتی تھیں۔ اس طرح کی چہل سے دل بہل جاتا تھا اور پروقار جلسوں میں متین اور سنجیدہ بن کر بیٹھنے سے جو بوجھ طبیعت پر پڑتا تھا وہ ہلکا ہو جاتا تھا۔ میری چھوٹی سی اندرا بھی ان شرارتوں میں شریک ہو جاتی تھی۔ صرف میری والدہ میرے ساتھ سنجیدگی کا برتاؤ کرتی تھیں اور انھیں یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کے پیارے بیٹے پہ فقرے کسے جائیں۔ والد ان باتوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ انھیں چپ چاپ دلجوئی اور ہمدردی کرنے کا ڈھب خوب آتا تھا۔

مگر بڑے بڑے مجمعوں کے نعرے، بے لطف اور پریشان کن جلسے، اور سیاسی زندگی کے ہنگامے میرے قلب کی سطح کو چھوتے ہوئے گذر جاتے تھے اگرچہ کبھی کبھی ان کی خلش دیر تک محسوس ہوتی تھی۔ اصلی کش مکش میرے نفس کے اندر تھی، یہ خیالات کی، خواہشات کی، متضاد عقیدوں کی، داخلی نیم شعوری عناصر اور خارجی واقعات کی کش مکش تھی۔ دل کی گہرائیوں میں جس چیز کی طلب تھی وہ کہیں نہیں ملتی تھی۔ میرا نفس ایک میدان جنگ بن گیا تھا جس میں مختلف قوتیں برد آزما تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کش مکش سے نجات ملے توازن اور ہم آہنگی کی جستجو مجھے میدانِ عمل میں کھینچ لائی۔ عمل سے مجھے کسی قدر سکون حاصل ہوا۔ خارجی جنگ جدل سے داخلی کش مکش کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

آخر میں جیل میں بیٹھا یہ رام کہانی کیوں لکھ رہا ہوں؟ بات یہ ہے کہ قید ہو یا آزادی، جستجو اسی ایک چیز کی ہے۔ میں اپنے پرانے احساسات اور تجربات اس امید پہ قلم بند کر رہا ہوں کہ شاید اسی سے کچھ اطمینان قلب میسر آجائے۔

(۲۹)

سول نافرمانی کا آغاز

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا گیا اور اس سے ہمیں دفعتاً یہ اندازہ ہوا کہ ملک میں کس قدر جوش اور خلوص ہے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں بڑے بڑے مجمعوں کو نہایت پُرامن اور پُراثر طریقے سے آزادی کا عہد[1] کرتے ہوئے دیکھنا نہایت ہی شاندار نظارہ تھا، گاندھی جی کو جس محرک کی ضرورت تھی وہ حاصل ہو گیا وہ لوگوں کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ انھوں نے اندازہ کر لیا کہ اب کام شروع کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب واقعات کا سلسلہ بڑی تیزی سے شروع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ناٹک کے پردے ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں اور رفتہ رفتہ آخری سین کی باری آ رہی ہے۔

جب سول نافرمانی کا وقت قریب آیا اور ساری فضا میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑنے لگی تو ہمیں ۲۲-۱۹۲۱ء کے واقعات اور چورا چوری کے ہنگامے کے بعد تحریک کا ملتوی کیا جانا یاد آ گیا۔ اب ملک زیادہ منضبط ہو چکا تھا اور لوگ لڑائی کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے وہ طریق کار سے کسی حد تک واقف ہو گئے تھے اور گاندھی جی کے نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات تھی کہ لوگوں کو اس کا پورا پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عدم تشدد پر بہت سختی سے عمل کرنا چاہتے ہیں، اب

---

(۱) یہ عہد کتاب کے آخر میں ضمیمۂ الف میں درج ہے۔

دس سال پہلے غالباً لوگوں کو اس میں کچھ شک تھا، مگر اب شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ پھر بھی گاندھی جی کو کیونکر یقین ہو سکتا تھا کہ ملک کے کسی حصے میں بھی لوگ خود بخود یا کسی کے اکسانے سے تشدد کے مرتکب نہیں ہوں گے اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا تو اس کا سول نافرمانی کی تحریک پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا پہلے کی طرح اب بھی تحریک یکایک بند کر دی جائے گی؟ ان باتوں کو سوچ کر بڑی الجھن ہوتی تھی۔

غالباً گاندھی جی بھی اپنے طور پر اس پر غور کر رہے تھے مگر جہاں مجھے ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا ان کو جو مشکل در پیش تھی وہ کچھ اور تھی۔

ان کے نزدیک معاملات کی اصلاح کے لئے صرف ایک ہی صحیح طریقہ ہو سکتا تھا۔ اور وہ عدم تشدد کا طریقہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اس سے مناسب طور پر کام کیا جائے تو اس میں ہرگز ناکامیابی نہیں ہو سکتی، اگر کوئی یہ کہے، کہ اس طریقہ کے کامیاب ہونے کے لئے ایک مناسب فضا کی ضرورت ہے اور جب تک واقعات سازگار نہ ہوں اس سے کام نہیں لینا چاہیئے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عدم تشدد کا طریقہ ہر موقع پر کام نہیں دے سکتا یعنی یہ کوئی عالمگیر اور حکمی طریقہ عمل نہیں ہے۔ اس نتیجے کو گاندھی جی کسی طرح نہیں مان سکتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اسے عالمگیر اور حکمی طریقہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے نزدیک نامناسب حالات میں بلکہ تشدد اور بدامنی کی فضا میں بھی یہ طریقہ کام دے سکتا تھا مختلف حالات میں اس کی صورت تو بدلی جا سکتی ہے مگر اسے چھوڑنا ممکن نہیں کیونکہ یہ اس کی ناکامیابی کا اعتراف ہوگا۔

غالباً وہ کچھ اسی قسم کی باتیں سوچ رہے تھے مگر میں ان کے خیالات کا اندازہ یقینی طور پر نہیں کر سکتا۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ ان کا خیال کچھ خفیف سا بدلا ہوا اور سول نافرمانی کے شروع ہونے کے بعد اگر اتفاقی طور پر ایک آدھ تشدد کا واقعہ

پیش آجائے تو وہ تحریک کا بند کرنا ضروری نہیں سمجھیں گے۔ البتہ اگر تشدد خود تحریک بن جائے تو پھر وہ با امن سول نافرمانی نہیں رہے گی اور اس کی جدوجہد کو روکنا یا بدلنا پڑے گا۔ اس بات سے ہم لوگوں کو بہت کچھ تسکین ہوئی۔ اب سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ تحریک شروع کیونکر کی جائے؟ سول نافرمانی کی کونسی صورت اختیار کی جائے جو مؤثر بھی ہو، قرین مصلحت بھی ہو اور لوگوں میں مقبول بھی ہو سکے؟ مہاتما جی نے ایک ذرا سے اشارے سے اس مشکل کو حل کر دیا۔

نمک کا لفظ یکایک ایک جادو کا منتر بن گیا۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ نمک کے محصول کی ادائیگی بند کر دی جائے اور نمک سازی کے قوانین کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہم لوگ یہ سن کر چکر میں آ گئے کہ کہاں قومی جنگ اور کہاں نمک۔ ایک اور عجیب بات یہ ہوئی کہ گاندھی جی نے اپنی گیارہ شرطوں کا اعلان کر دیا۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ جب ہم آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں تو چند سیاسی اور سماجی اصلاحوں کی (گو وہ اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں) فہرست بنانے کے کیا معنی؟ کیا گاندھی جی کے نزدیک اس کا وہی مفہوم تھا جو ہمارے ذہن میں تھا یا وہ اس کے کچھ اور معنی سمجھتے تھے؟ مگر اب بحث اور گفتگو کا موقع نہ تھا اس لئے کہ واقعات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ادھر ہندوستان میں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی تحریک زور پکڑ گئی تھی اور اُدھر (اگرچہ ہمیں اس وقت اس کا احساس نہ تھا) ساری دنیا میں کساد بازاری نے ایک کھلبلی مچا رکھی تھی۔ چیزوں کی قیمتیں گر رہی تھیں اور گو شہر والے اسے خوش حالی کی علامت سمجھ کر خوش ہو رہے تھے مگر کسان بہت ڈر رہے تھے۔

گاندھی جی نے وائسرائے سے خط و کتابت کرنے کے بعد سابرمتی کے آشرم سے ڈنڈی کی طرف "نمک کا دھاوا" شروع کر دیا۔ لوگ یاتریوں کی اس فوج کے کوچ کے حالات کو روز بروز غور سے دیکھ رہے تھے۔ اور ملک کا جوش بڑھتا جاتا تھا۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ احمد آباد میں کیا گیا کہ لڑائی کی جو قریب شروع ہو گئی تھی مکمل تیاریاں کیجائیں۔ ہمارا سپہ سالار موجود نہ تھا اس لئے کہ وہ اپنی چھوٹی فوج کو لئے ہوئے پاپیادہ سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اس کی تدبیریں سوچیں کہ جب ہم لوگ گرفتار ہو جائیں تو کیا کرنا چاہیئے اور پریسیڈنٹ کو بہت وسیع اختیارات دئے گئے کہ اگر کمیٹی کا اجلاس نہ ہو سکے تو وہ اس کی طرف سے ورکنگ کمیٹی کے گرفتار شدہ ممبروں کی جگہ دوسرے ممبر نامزد کر دے اور اگر خود گرفتار ہو جائے تو اپنا جانشین نامزد کر کے اپنے اختیارات اس کے سپرد کرے۔ اسی قسم کے اختیارات ہر صوبہ دار اور مقامی کمیٹی نے بھی اپنے اپنے پریسیڈنٹ کو دے دیئے۔

اس طرح وہ "ڈکٹیٹروں" کا سلسلہ شروع ہوا جو کانگرس کی طرف سے اس تحریک کو چلاتا رہا۔ وزیر ہند، وائسرائے اور گورنر اس پر بہت کراہت کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھو کانگرس کتنی بری اور ذلیل ہے کہ وہ ڈکٹیٹر کی حکومت کی قائل ہے! ظاہر ہے کہ یہ لوگ خود تو دل وجان سے جمہوریت کا کلمہ پڑھتے تھے! کبھی کبھی ہندوستان کے اعتدال پسند اخبارات بھی ہمیں جمہوریت کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر ریاکاری اور کیا ہو سکتی تھی۔ ادھر ہندوستان میں استبداد اور مطلق العنانی کی حکومت تھی، آرڈیننس کے قانون بنائے جا رہے تھے، لوگوں کی قانونی آزادی سلب کی جا رہی تھی اور ادھر ہمارے حکمراں بڑی دینداری اور پرہیزگاری کے انداز سے جمہوریت کا وعظ کہہ رہے تھے، حالانکہ شورش کا زمانہ تو ایک طرف، معمولی حالات میں بھی ہندوستان میں جمہوریت کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ یہ سچ ہے کہ برطانوی حکومت کے لئے ہندوستان میں اپنی قوت اور اغراض کی حفاظت کرنا اور اپنے مخالفوں کو دبانا ایک قدرتی بات تھی مگر اس کا

یہ دعویٰ کہ وہ جمہوری طریقے سے حکومت کر رہی ہے اس قابل ہے کہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہے اور آئندہ نسلیں اس کی داد دیں اور اس سے عبرت حاصل کریں۔

کانگریس کو ایسے موقع کا سامنا تھا جس میں اس کا معمولی طریقے سے کام کرنا ناممکن تھا اسے اندیشہ تھا کہ وہ ایک خلاف قانون جماعت قرار دے دی جائے گی اور اس کی کمیٹیاں کھلم کھلا اپنا جلسہ نہیں کر سکیں گی خفیہ کارروائی کو ہم لوگ پسند نہیں کرتے تھے اس لئے کہ ہم اپنی تحریک کو علانیہ چلانا چاہتے تھے تاکہ ہمارا وقار اور اثر لوگوں کے دلوں میں قائم رہے اور پھر خفیہ کارروائی سے کام بھی نہیں چل سکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ ہماری مرکزی جماعت اور مقامی کمیٹیوں کے تمام لیڈر قید ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں تحریک کو کون چلاتا؟ ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں تھا کہ لڑنے والی فوج کی طرح ایسا انتظام کر دیں کہ جب پرانے سپہ سالار نہ رہیں تو ان کی جگہ نئے لوگ مقرر ہو جائیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم میدان جنگ میں بیٹھ کر کمیٹیاں کرتے رہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوا بھی مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ساری کمیٹی ایک ساتھ گرفتار کر لی گئی اور یہی ہمارا مقصود بھی تھا ہمیں یہ آسانی نہیں تھی کہ ہمارا فوج کا جنرل اسٹاف محاذ جنگ کے پیچھے اطمینان سے بیٹھا ہو یا غیر فوجی مجلس وزرا اور بھی زیادہ محفوظ مقام پر اپنا اجلاس کر رہی ہو ہماری لڑائی اس قسم کی تھی کہ ہمارے جنرل اسٹاف اور مجلس وزرا کو عین میدان جنگ میں سب سے آگے رہنا پڑتا تھا اور وہ سب شروع ہی میں گرفتار ہو جاتے تھے اور پھر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اپنے "ڈکٹیٹروں" کو اختیارات کیا دئے تھے؟ ان کو یہ عزت ضرور حاصل تھی کہ وہ قوم کے عزم جنگ کے مظہر بن کر آگے بڑھیں۔ ان کا اختیار بس یہیں تک محدود تھا کہ خود اپنے حکم سے جیل خانے چلے جائیں۔ ان کا حکم اسی وقت تک چلتا تھا جب تک وہ کمیٹیاں جن کے وہ نمائندے تھے صریحی مجبوری کی وجہ سے اپنا اجلاس نہ کر سکیں۔ جہاں کہیں کمیٹی کا اجلاس ہو سکتا تھا ڈکٹیٹر کے یہ تھوڑے

بہت اختیارات بھی ختم ہو جاتے تھے۔ کوئی عورت یا مرد "جو ڈکٹیٹر" مقرر کیا جائے کسی بنیادی معاملے یا مسئلے میں دخل نہیں دے سکتا تھا بلکہ اس کے اختیارات صرف تحریک کے جزوی پہلوؤں تک محدود تھے۔ اصل میں کانگریس کی "ڈکٹیٹری" جیل خانے کی ایک منزل تھی اور جو لوگ گرفتار ہوتے جاتے تھے ان کی جگہ نئے آدمی آتے جاتے تھے۔

غرض احمد آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنی تیاریوں کی تکمیل کی اور ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا کیونکہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم پھر کبھی ایک جگہ جمع ہو سکیں گے یا نہیں۔ اس کے بعد ہم سب اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے تاکہ مقامی انتظامات کی تکمیل کریں یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نئی ہدایات کے مطابق بقول سروجنی نائیڈو کے جیل جانے کے لئے بستر باندھ رکھیں۔

احمد آباد سے واپسی میں، میں اور والد گاندھی جی سے ملنے گئے۔ وہ اپنے یاتریوں کی فوج کے ساتھ جمبوسر کے مقام پر تھے ہم چند گھنٹے ان کے ساتھ رہے اور ہمارے سامنے ہی وہ نمک کے سمندر کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ آخری منظر جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ وہ ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے اپنے پیروؤں کے آگے آگے مضبوطی سے قدم رکھتے چلے جا رہے ہیں اور ان کے چہرے سے امن اور سکون مگر اسی کے ساتھ استقلال اور پختگی ظاہر ہو رہی ہے۔ بڑا پر اثر منظر تھا۔

جمبوسر میں والد نے گاندھی جی کے مشورے سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے الہ آباد والے گھر کو قوم کی خدمت میں پیش کر دیں گے اور اس کا نام سوراج بھون رکھیں گے۔ الہ آباد واپس آ کر انہوں نے اس کا اعلان کر دیا اور مکان کو کانگریس کے حوالے کر دیا۔ اس وسیع عمارت کا ایک حصہ اسپتال بنا دیا گیا۔ اس وقت وہ قانونی ضابطوں کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ ڈیڑھ سال کے بعد میں نے ان کی وصیت کے مطابق باقاعدہ وقف قائم کر دیا۔

اپریل کا مہینہ آگیا۔ گاندھی جی سمندر کے قریب پہنچ گئے تھے اور ہم ان کے حکم کے منتظر تھے کہ نمک سازی کے قوانین کی خلاف ورزی کر کے سول نافرمانی کا آغاز کر دیں۔ کئی مہینے سے ہم والنٹیروں کو قواعد کرا رہے تھے۔ کملا اور کرشنا (میری بیوی اور بہن) بھی والنٹیروں میں داخل ہو گئی تھیں اور مردانے کپڑے پہن کر قواعد میں شریک ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان والنٹیروں کے پاس ہتھیار کیا چھڑی تک نہ تھی۔ انھیں قواعد کرانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے کام میں مشاق ہو جائیں اور بڑے بڑے مجمعوں کا انتظام کر سکیں۔ اپریل قومی ہفتہ کا پہلا دن تھا جو ۱۹۱۹ء کے واقعات (یعنی ستیاگرہ کے دن سے لے کر جلیانوالہ باغ کے دن تک) کی یاد گار میں منایا جاتا ہے۔ اس روز گاندھی جی نے ڈانڈی کے ساحل پر نمک سازی کے قانون کی خلاف ورزی شروع کی اور تین چار دن کے بعد کانگریس کی شاخوں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں سول نافرمانی شروع کر دیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے کھٹکا دبا کر ایک مشین چلا دی ہے سارے ہندوستان کے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں نمک بنانے کا چرچا تھا اور اس کے عجیب عجیب طریقے اختیار کئے جاتے تھے ہم بالکل نہیں جانتے تھے کہ نمک کیسے بنایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے کتابوں سے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں، اشتہار کے ذریعے سے لوگوں کو ہدایتیں دیں اور کڑھاؤ وغیرہ جمع کئے غرض کسی نہ کسی طرح ایک نقصان دہ کڑوی چیز تیار کر لی جسے ہم بڑے فخر سے لئے پھرتے تھے اور کبھی کبھی بڑی قیمتوں پر نیلام کرتے تھے۔ اس سے کچھ مطلب نہ تھا کہ نمک اچھا ہے یا برا ہے۔ اصل مقصد یہ تھا کہ نمک کے ٹیکس وہ قوانین کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہمارا نمک برا سہی مگر اپنے مقصد میں ہم کامیاب ہو گئے لوگوں کے جوش کو بڑھتے ہوئے اور نمک سازی کو آگ کی طرح پھیلتے ہوئے

دیکھ کر ہمیں اس بات پر شرمندگی ہوئی کہ جب گاندھی جی نے پہلی بار یہ تجویز پیش کی تھی تو ہم نے اس پر اعتراض کیا تھا ہمیں حیرت تھی کہ اس شخص کو عام لوگوں پر اثر ڈالنے کا اور منظم طریقے سے کام کرنے کا کیا عجیب و غریب ڈھب آتا ہے۔

۱۴ اپریل کو میں رائے پور (صوبہ متوسط) میں جہاں میں کانفرنس میں شریک ہونے جا رہا تھا، ریل سے اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اسی روز جیل خانے کے اندر میرے مقدمے کی تحقیقات ہوئی اور نمک سازی کے قانون کے ماتحت مجھے چھ مہینے کی سزا دے دی گئی۔ مجھے پہلے ہی گرفتاری کی توقع تھی اس لئے میں نے (ان نئے اختیارات کی رو سے جو مجھے آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے دئے تھے) اپنی غیر موجودگی میں گاندھی جی کو کانگرس کا پریسیڈنٹ نامزد کر دیا تھا لیکن چونکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ انکار کر دیں گے اس لئے دوسرا نام اپنے والد کا تجویز کیا تھا جیسا کہ میرا خیال تھا گاندھی جی راضی نہیں ہوئے اور والد کانگرس کے قائم مقام پریسیڈنٹ ہو گئے۔ ان کی صحت بہت خراب تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے تحریک کو بڑے زور شور سے چلایا اور پہلے چند مہینوں میں ان کی زبردست رہنمائی اور سختی سے انضباط قائم رکھنے کی وجہ سے تحریک کو بہت فائدہ پہنچا مگر ان کی جو تھوڑی بہت صحت باقی تھی برباد ہو گئی۔

ان دنوں ہر طرف سے بڑی ہیجان انگیز خبریں آیا کرتی تھیں جلوس نکلتے تھے، لاٹھیاں اور گولیاں برسائی جاتی تھیں، مشہور لیڈروں کی گرفتاری کی وجہ سے اکثر ہڑتال ہوتی رہتی تھی اور خاص خاص واقعات کی یادگار میں پشاور کا دن گڑھوالیوں کا دن وغیرہ منائے جاتے تھے۔ بدیسی کپڑے اور برطانیہ کے ہر قسم کے مال کا قریب قریب مکمل بائیکاٹ ہو گیا تھا جب میں نے یہ سنا کہ میری بوڑھی ماں اور بہنیں گرمیوں کی دھوپ میں بدیسی کپڑے کی دوکانوں کے سامنے پکٹنگ کے لئے

کھڑی رہتی ہیں تو مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اور کملا نے صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کیا۔ اس نے الہ آباد شہر اور ضلع کی تحریک میں اس مستعدی اور استقلال سے کام کیا کہ جو اپنے خیال میں اسے برسوں سے جانتا تھا، حیرت میں رہ گیا۔ وہ اپنی بیماری کو بھول گئی اور دن دن بھر دھوپ میں دوڑتی پھرتی تھی، اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ تنظیم کی غیر معمولی قابلیت رکھتی ہے۔ مجھے جیل خانے میں ان باتوں کی مجمل سی خبریں پہنچتی تھیں۔ آگے چل کر جب میرے والد بھی جیل میں میرے پاس آ گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ کملا کے کام کے خصوصاً اس کی تنظیمی قابلیت کے کس قدر مداح ہیں۔ وہ اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے کہ والدہ اور لڑکیاں دھوپ میں دوڑتی پھریں۔ مگر ایک آدھ بار سمجھانے کے سوا انھوں نے اس معاملے میں دخل نہیں دیا۔

سب سے بڑی خبر جو اس ابتدائی زمانے میں ہم تک پہنچی وہ ان واقعات کی تھی جو ۲۳ر اپریل کو پشاور میں اور اس کے بعد سارے سرحدی صوبے میں پیش آئے۔ ہندوستان میں کہیں بھی لوگ مشین گن کی گولہ باری کا مقابلہ اس قدر انضباط امن اور بہادری سے کرتے تب بھی سارے ملک میں جوش پھیل جاتا سرحدی صوبے میں یہ چیز اور بھی اہمیت رکھتی تھی اس لئے کہ پٹھان بہادری میں تو بہت مشہور ہیں گو امن پسندی میں مشہور نہیں ہیں۔ اسی صوبے میں یہ مشہور واقعہ پیش آیا کہ گڑھ والی سپاہیوں نے شہر والوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کچھ تو اس وجہ سے انکار کیا کہ انھیں مجمع سے ہمدردی تھی۔ مگر ہمدردی کا جذبہ بھی عموماً اس کے لئے کافی نہیں ہوتا کہ سپاہی اتنی بڑی جرأت کرے کہ اپنے افسر کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ غالباً گڑھ والی (بعض اور رجمنٹوں کی طرح جن کی عدول حکمی مشہور نہیں ہونے پائی) اس دھوکے میں تھے کہ برطانوی

حکومت ختم ہو رہی ہے سپاہی کو اپنی خواہش اور ہمدردی کے مطابق کام کرنے کی جرأت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے دل میں اس قسم کا خیال بیٹھ جائے غالباً ملک کی عام بے چینی اور سول نافرمانی کی وجہ سے چند روز یا چند ہفتے کے لئے بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ برطانوی حکومت کے خاتمہ کے دن قریب آ گئے ہیں اور اس کا اثر ہندوستانی فوج کے کچھ حصہ پر پڑا۔ بہت جلد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مستقبل قریب میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے اس لئے اس کے بعد فوج میں عدول حکمی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں سے اس قسم کے کام لینے میں بھی احتیاط برتی جانے لگی۔

اس زمانے میں بہت سے عجیب واقعات پیش آئے مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز وہ خدمت تھی جو عورتوں نے قومی تحریک میں انجام دی۔ وہ بہت بڑی تعداد میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل آئیں اور اگرچہ انھیں قومی کاموں سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، انھوں نے اس لڑائی میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ بدیسی کپڑے اور شراب کی دکانوں کی پکٹنگ انھوں نے اپنے لئے مخصوص کر لی۔ بڑے بڑے جلوس جن میں صرف عورتیں ہی عورتیں ہوتی تھیں تمام شہروں میں نکلتے تھے اور عام طور پر عورتیں مردوں سے زیادہ ثابت قدمی کا ثبوت دیتی تھیں۔ ان میں سے اکثر صوبوں میں اور مقامی حلقوں میں "ڈکٹیٹر" بھی بنائی گئیں۔

تھوڑے دن میں نمک سازی کے قانون کی خلاف ورزی کے علاوہ سول نافرمانی کے دوسرے طریقے بھی اختیار کئے جانے لگے۔ اس میں اس وجہ سے اور بھی آسانی ہو گئی کہ وائسرائے نے کئی آرڈیننس نافذ کئے جن کی رو سے مختلف قسم کے کاموں کی ممانعت کر دی گئی۔ جوں جوں آرڈیننس اور ممانعت کے احکام بڑھتے جاتے تھے لوگوں کو خلاف ورزی کے نئے نئے موقع ہاتھ آتے تھے، اور سول

نافرمانی کی یہ صورت ہوتی جاتی تھی کہ جن کاموں کی آرڈیننس میں ممانعت ہو وہی کام کیے جائیں۔ کانگریس اور قوم کی جدوجہد روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور جب ایک آرڈیننس سے کام نہیں چلتا تھا تو وائسرائے کو دوسرا آرڈیننس جاری کرنا پڑتا تھا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بہت سے ممبر گرفتار ہو چکے تھے مگر ان کی جگہ نئے ممبر مقرر ہو گئے تھے اور حکومت کے ہر آرڈیننس کے جواب میں ورکنگ کمیٹی ایک نیا رزولیوشن پاس کرتی تھی جس میں لوگوں کو ہدایتیں دی جاتی تھیں کہ آرڈیننس کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیئے۔ ان ہدایات پر سارے ملک میں حیرت انگیز ہم آہنگی کے ساتھ عمل ہو رہا تھا۔ البتہ اخباروں کی اشاعت کے متعلق اس کی ہدایات کی تعمیل نہیں کی گئی۔

جب پریس آرڈیننس کی رو سے اخباروں پر مزید سختیاں عائد کی گئیں اور ان سے ضمانت مانگی جانے لگی تو ورکنگ کمیٹی نے قومیت پسند اخباروں کو ہدایت کی کہ وہ ضمانت داخل نہ کریں بلکہ اخبار کی اشاعت موقوف کر دیں۔ یہ اخبار والوں کے لئے بڑی ٹیڑھی کھیر تھی کیونکہ اس زمانے میں اخباروں کی مانگ خاص طور پر بڑھ گئی تھی۔ پھر بھی بہت سے اخباروں نے جن میں اعتدال پسند اخبار شامل نہ تھے اپنی اشاعت بند کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں مگر ان اخباروں سے زیادہ دن تک صبر نہیں ہو سکا اس لئے کہ ایک تو اشاعت کے بڑھنے کا لالچ تھا اور دوسرے ان سے یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ ان کے اعتدال پسند حریف ان کے کاروبار پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر نے اپنی اشاعت دوبارہ شروع کر دی۔

۵ مئی کو گاندھی جی گرفتار ہو گئے۔ ان کی گرفتاری کے بعد مغربی ساحل پر نمک سازی کے مرکزوں پر بہت بڑے پیمانے پر حملے شروع کر دیئے گئے۔ ان حملوں میں پولیس کی وحشیانہ بے رحمی کے بہت افسوسناک واقعات رونما ہوئے۔

بمبئی ان دنوں تحریک کا مرکز تھا اور وہاں بڑی زبردست ہڑتالیں ہوتی تھیں، بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے اور آئے دن لاٹھی چارج ہوا کرتے تھے۔ لاٹھی چارج کے مجروحوں کی خبر گیری کے لئے کئی ہنگامی اسپتال قائم ہو گئے۔ بمبئی نے اس زمانے میں بہت نمایاں کام کئے اور بڑا شہر ہونے کی وجہ سے ان کاموں کو شہرت بھی خوب حاصل ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہات میں بھی اس قدر اہم واقعات رونما ہوئے مگر مشہور نہ ہو سکے۔

جون کے نصف آخر میں میرے والد بمبئی گئے اور والدہ اور کملا کو بھی ساتھ لے گئے۔ ان کا نہایت شاندار استقبال ہوا اور ان کے قیام کے زمانے میں پولیس نے بہت شدید لاٹھی چارج کئے۔ لاٹھی چارج بمبئی میں روزمرّہ کی چیز ہو گئی تھی۔ کوئی دو ہفتے کے بعد وہاں ایک رات کو لوگوں کو بڑی سخت آزمائش کا سامنا ہوا۔ مالوی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر ایک بہت بڑے جلوس کو لے کر نکلے۔ پولیس نے ان کا راستہ روک دیا مگر وہ رات بھر اس کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

بمبئی سے واپس آنے کے بعد ۳۰ جون کو والد اور ان کے ساتھ سید محمود گرفتار کر لئے گئے اس لئے کہ ورکنگ کمیٹی خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی اور والد اس کے قائم مقام پریسیڈنٹ اور سید محمود اس کے سکرٹری تھے۔ دونوں کو چھ چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ میرے والد کی گرفتاری کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھوں نے ایک بیان شائع کیا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ جب فوج یا پولیس کے سپاہی کو شہریوں پر گولی چلانے کا حکم دیا جائے تو اس کا کیا فرض ہے۔ یہ بیان بالکل قانون کے مطابق تھا اور اس میں صرف اس بات کی تصریح کی گئی تھی کہ ہندوستان کا موجودہ برطانوی قانون اس معاملے کے متعلق کیا کہتا ہے۔

اس کے باوجود یہ بیان اشتعال انگیز اور خطرناک قرار دیا گیا۔

بمبئی جانے کی وجہ سے میرے والد کی صحت پر بہت بار پڑا۔ وہ صبح تڑکے سے لے کر رات گئے تک ہر وقت مصروف رہتے تھے اور ہر اہم معاملے کے فیصلے کی ذمہ داری انھیں پر تھی۔ یوں تو ان کی طبیعت ایک عرصے سے ناساز تھی مگر بمبئی سے لوٹنے کے بعد بہت ہی مضمحل ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹروں کی سخت تاکید سے انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کامل آرام کریں گے۔ انھوں نے مسوری جانے کا انتظام کیا اور سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ مگر جس روز ان کی روانگی تھی اس سے ایک دن پہلے وہ یکایک نینی سنٹرل جیل میں ہماری بارک میں پہنچ گئے۔

(۳۰)

نینی جیل میں

اب میں کوئی سات برس کے بعد قید ہوا تھا اور جیل کی زندگی کی یاد میرے دل سے کچھ مٹ سی گئی تھی۔ اس بار میں نینی سنٹرل جیل میں بھیجا گیا تھا جو اس صوبے کے بڑے جیل خانوں میں سے ہے، اور سب قیدیوں سے الگ رکھا گیا جو میرے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ میرا احاطہ جیل کے بڑے احاطے سے جس میں سب ملا کر بائیس تئیس سو آدمی رہتے تھے، الگ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گول احاطہ تھا جس کا قطر تقریباً سو فٹ ہوگا اور دیوار کوئی پندرہ فٹ اونچی ہوگی۔ اس کے بیچ میں ایک بھدی بدنما عمارت تھی اور اس میں چار کوٹھریاں تھیں، مجھے ان میں سے دو کوٹھریاں جن کے بیچ میں دروازہ تھا دی گئیں، ایک رہنے کے لئے اور دوسری غسل خانے اور پاخانے کے طور پر استعمال کرنے کے لئے۔ باقی دو کوٹھریاں کچھ عرصے تک خالی رہیں۔

اس مصروفیت اور ہلچل کی زندگی کے بعد جو میں نے پچھلے دنوں گزاری تھی میں تنہائی اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور دو تین دن تک نیند بھر سوتا رہا۔ گرمی شروع ہو گئی تھی اس لئے مجھے رات کو صحن میں جو مکان کے اور احاطے کی دیوار کے بیچ میں تھا سونے کی اجازت تھی۔ میرا پلنگ زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا کہ کہیں میں اس کو لیکر بھاگ نہ جاؤں یا شاید اس لئے کہ اس سے سیڑھی کا کام لیکر دیوار پر نہ چڑھ سکوں۔ رات کو عجیب عجیب آوازیں آیا کرتی تھیں۔ قیدی چوکیدار جو رات بھر بڑے احاطے کے گرد پہرہ دیتے تھے اکثر ایک دوسرے کو طرح طرح کے سروں میں

پکارتے تھے اور کبھی کبھی ایسی تان لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا دور سے آندھی چلنے کی آواز آرہی ہے۔ بارکوں کے پہرے والے زور زور سے قیدیوں کو گنتے رہتے تھے اور چیخ چیخ کر خیریت کی اطلاع دیتے تھے۔ سلاخوں کی یا جیل کا کوئی افسر راؤنڈ پھیرتا ہوا ہمارے احاطے کے پاس سے گذرتا تھا اور پہرے والے کو پکارتا تھا چونکہ میرا احاطہ اور احاطوں سے کسی قدر فاصلے پہ تھا اس لئے اکثر آوازیں صاف طور پہ نہیں سنائی دیتی تھیں اور ابتدا میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسا شور برپا ہے۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ کوئی جنگل قریب ہے اور کسان جنگلی جانوروں کو کھیتوں سے ہنکا رہے ہیں اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود جنگل کی صدا درندوں کی آوازیں ملی جلی آرہی ہے۔

معلوم نہیں یہ صرف میرا وہم ہے یا واقعہ ہے کہ گول دیوار چوکور دیوار سے زیادہ قید کا احساس پیدا کرتی ہے۔ کونوں اور زاویوں کے نہ ہونے سے آدمی کا اور بھی دم گھٹتا ہے۔ دن کو یہ دیوار آسمان تک کو چھپا لیتی تھی۔ بس اس کے ایک ذرا سے ٹکڑے کی جھلک نظر آتی تھی اور میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

وہ اس چھوٹے سے نیلے خیمے کو
جسے قیدی آسمان کہتے ہیں،
اور بادل کے ہر تیرتے ہوئے ٹکڑے کو
جو ریشمی بادبان لگائے اڑا چلا جاتا ہے"

رات کو یہ دیوار مجھے اور زیادہ سختی سے گھیر لیتی تھی اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں کنویں میں پڑا ہوا ہوں۔ تاروں بھرے آسمان کا وہ حصہ جو مجھے دکھائی دیتا تھا سچ مچ کا آسمان نہیں بلکہ اس کا ایک مصنوعی نقشہ معلوم ہوتا تھا

میری بارک سارے جیل میں "کتا گھر" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ نام میری وجہ سے نہیں ہوا بلکہ پہلے سے تھا۔ ابتدا میں یہ ان خطرناک مجرموں کے لئے بنائی گئی تھی جنھیں

قید تنہائی کی سزا ملتی تھی مگر آگے چل کر اس میں سیاسی قیدی اور نظر بند رکھے جانے لگے تاکہ وہ جیل کے اور حصوں سے الگ رہیں۔ اس احاطے کے سامنے کچھ دور پر ایک عجیب قسم کی چیز تھی جب میں نے پہلی بار اپنی بارک سے اس کی جھلک دیکھی تو مجھے ایک چرخے کا سا لگا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑا سا پنجرا ہے جس میں آدمی کولھو کے بیل کی طرح پھر رہے ہیں۔ آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہ پانی کا پمپ ہے جو انسانوں کی قوت سے چلایا جاتا ہے اور اس میں ایک وقت میں سولہ آدمی لگتے ہیں۔ انسانوں کو ہر چیز کی عادت ہو جاتی ہے۔ میں کچھ دن میں اس منظر کا عادی ہو گیا مگر میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ یہ انسانی قوت کے استعمال کا نہایت احمقانہ اور وحشیانہ طریقہ ہے۔ جب کبھی میں ادھر سے گزرتا ہوں مجھے چڑیا خانے کا دھیان آتا ہے۔

چند روز تک مجھے ورزش وغیرہ کے لئے بھی اپنے احاطے سے باہر نکلنے کی ممانعت رہی مگر بعد میں اجازت ہو گئی کہ صبح تڑکے جھٹپٹے وقت آدھ گھنٹے کے لئے باہر جا سکتے ہو اور بڑی دیوار کے نیچے نیچے ٹہل یا دوڑ سکتے ہو۔ اتنے سویرے کا وقت اس لئے مقرر کیا گیا کہ اور قیدی مجھ سے نہ مل سکیں بلکہ مجھے دیکھ بھی نہ سکیں۔ مجھے یہ سیر بہت پسند تھی اور اس سے بڑی تفریح ہوتی تھی۔ میں اس تھوڑے سے وقت کے اندر کھلی ہوا میں زیادہ سے زیادہ ورزش کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے دوڑنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ روزانہ دو میل سے اوپر دوڑنے لگا۔

میں صبح بہت تڑکے کوئی ساڑھے تین بجے اٹھتا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں سویرے سو جاتا تھا اس لئے کہ جو روشنی مجھے ملتی تھی وہ پڑھنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ میں بڑے شوق سے تاروں کو دیکھا کرتا تھا اور ان کی جانی بوجھی صورتوں سے مجھے وقت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ جہاں میں لیٹتا تھا وہاں سے قطب تارا دیوار سے ملا ہوا نظر آتا تھا اور اس کے ہر وقت سامنے رہنے سے مجھے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ گھومتے ہوئے آسمان کے بیچ میں یہ ثبات و استقلال کا نمونہ کھڑا مسکراتا رہتا تھا۔

ایک مہینے تک میرا کوئی ساتھی نہیں تھا مگر میں بالکل اکیلا بھی نہ تھا اس لئے کہ میرے احاطے میں ایک وارڈر، ایک قیدی باورچی اور چند قیدی نگراں رہتے تھے۔ کبھی کبھی دوسرے قیدی بھی کسی کام سے آجاتے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ قیدی تھے جو لمبی سزائیں بھگت رہے تھے اور دوسروں کے نگراں بنا دیئے گئے تھے۔ بہت سے عمر قیدی بھی تھے۔ عام طور پر عمر قید کی میعاد بیس سال سمجھی جاتی ہے مگر وہاں ایسے لوگ بھی تھے جنھیں بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ان میں مجھے ایک عجیب مثال نظر آئی۔ قیدیوں کے کرتوں میں کندھے پر ایک تختی لگی رہتی ہے جس میں سزا کی کیفیت اور رہائی کی تاریخ درج ہوتی ہے۔ ایک قیدی کی تختی میں میں نے رہائی کی تاریخ سنہ ۱۹۹۶ء لکھی ہوئی دیکھی۔ ابھی سنہ ۱۹۳۰ء میں اس میں سے کئی سال ختم ہو چکے تھے اور وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ غالباً اسے کئی سزائیں ملی تھیں اور ان سب کی میعاد جوڑ دی گئی تھی۔ میرے خیال میں ان کا مجموعہ پچھتر برس تھا۔

ان عمر قیدیوں کو برسوں تک عورت یا بچے کی صورت بلکہ جانور کی شکل تک دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ باہر کی دنیا سے الگ اور نوع انسانی سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت دل میں کڑھا کرتے ہیں اور خوف، انتقام اور نفرت کے خیالات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ انھیں یاد نہیں رہتا کہ دنیا میں نیکی، سلوک اور خوشی بھی ہوتی ہے اور ان کی طبیعت میں بدی سما جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ نفرت کا جوش بھی کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ زندگی ایک بے روح مشین بن جاتی ہے۔ وہ بے جان پتلیوں کی طرح حرکت کرتے ہیں اور ان کے دن جو ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں بے حسی میں گذرتے چلے جاتے ہیں بس ایک ہی چیز کا احساس رہ جاتا ہے یعنی خوف کا۔ وقتاً فوقتاً قیدیوں کا جسم تولا جاتا ہے مگر ان کے نفس اور ان کی روح کو کیونکر تول سکتے ہیں جو اس جبر و تشدد کی فضا میں سوکھتی اور مرجھاتی چلی جاتی ہے؟ لوگ موت کی سزا کی مخالفت میں بحث کرتے ہیں اور ان کی دلیلیں میرے دل کو لگتی ہیں مگر جب میں قیدیوں کی عمر بھر کی مصیبت

کو دیکھتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنے سے تو موت کی سزا ہی اچھی ہے۔ ایک بار ایک عمر قیدی نے مجھ سے پوچھا ہمارے جیسے قیدیوں کا کیا ہوتا ہے کیا سوراج ہمیں اس جہنم سے چھڑا دے گا؟"

آخر یہ عمر قیدی ہیں کون؟ ان میں سے بہت سے ڈکیتی کے الزام میں جیل بھیجے جاتے ہیں اکثر پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کے گروہ اکٹھے سزا پاتے ہیں۔ ان میں سے بعض مجرم ہوں گے مگر تعجب نہیں کہ بہت سے بے گناہ بھی ہوں۔ ایسے مقدموں میں لوگوں کو پھانس دینا آسان ہے۔ ایک سرکاری گواہ کی شہادت اور دو ایک آدمیوں کی سرسری شناخت بہت کافی ہے۔ آج کل ڈکیتوں کا زور ہے اور قیدیوں کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے۔ آخر جب لوگ بھوکوں مریں تو پھر اور کیا کریں؟ جج اور مجسٹریٹ جرائم کے بڑھنے کا راگ تو گاتے رہتے ہیں مگر اس کے کھلے ہوئے معاشی اسباب انھیں نہیں سوجھتے۔

پھر وہ کاشتکار ہیں جن میں زمین کے بارے میں معمولی سے جھگڑے پر لاٹھی چل جاتی ہے اور ایک آدھ آدمی مارا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ عمر بھر گویا ایک لمبی میعاد کے لئے جیل بھیج دئے جاتے ہیں۔ اکثر ایک خاندان کے سارے مرد اس طرح سے قید ہو جاتے ہیں اور عورتیں رہ جاتی ہیں جو کسی نہ کسی طرح گھر بار کو چلاتی ہیں۔ ان میں سے ایک شخص بھی مجرموں کی سی طبیعت کا نہیں اکثر گبھرو جوان ہیں جو جسم اور دماغ کے لحاظ سے گاؤں والوں کی عام سطح سے بہت اونچے ہیں۔ اگر ان کی تھوڑی سی تربیت ہو اور ان کی توجہ دوسرے کاموں کی طرف پھیر دی جائے تو یہ اپنے ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے جیل خانوں میں بعض عادی مجرم بھی پائے جاتے ہیں جو غیر معاشرت پسند اور سماج کے لئے خطرناک ہوتے ہیں مگر میں نے

تعجب اور خوشی کے ساتھ دیکھا کہ بہت بڑی تعداد میں اچھی قسم کے لڑکے اور بڑی عمر کے لوگ ہیں جن پر میں بے تکلف بھروسا کر سکتا ہوں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ مجرمانہ طبیعت اور غیر مجرمانہ طبیعت کے لوگوں میں تعداد کا تناسب کیا ہے۔ شاید جیل کے محکمے والوں نے تو کبھی اس فرق پر غور ہی نہیں کیا ہوگا۔ نیویارک کے سنگ سنگ جیل کے وارڈن لیوئس۔ ا۔ لائس نے اس کے متعلق دلچسپ اعداد و شمار شائع کئے ہیں وہ اپنے قیدیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ جہاں تک انھیں معلوم ہوا ۵۰ فیصدی مجرمانہ رجحان طبع سے بالکل پاک ہیں ۲۵ فی صدی گرد و پیش کے حالات کی بدولت مجرم بن گئے ہیں اور بقیہ ۲۵ میں سے شاید آدھے یعنی ۱۲½ فی صدی پکے غیر معاشرت پسند ہوں گے سب جانتے ہیں کہ اصلی مجرم بڑے شہروں اور جدید تمدن کے مرکزوں میں غیر ترقی یافتہ ملکوں سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ امریکا کے ڈاکو مشہور ہیں اور سنگ سنگ کے جیل میں خاص طور پر بدترین مجرم بھیجے جاتے ہیں۔ اس پر بھی خود اس کے وارڈن کے قول کے مطابق صرف ۱۲½ فی صدی قیدی ایسے ہیں جو واقعی بری طبیعت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان کے جیلوں میں ایسے قیدیوں کا تناسب اور بھی کم ہوگا۔ اگر ہمارا معاشی نظام معقول ہو تعلیم پھیل جائے اور روزگار بڑھ جائے تو تھوڑے دن میں ہمارے جیل خانے بالکل خالی ہو جائیں گے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہماری معاشرت کا سارا نظام ایک سرے سے بدل جائے۔ دوسری صورت وہی ہے جو برطانوی حکومت نے اختیار کی ہے کہ پولیس کی تعداد اور جیل خانوں کی عمارت بڑھائی جاتی ہے ہندوستان کے جیلوں میں قیدیوں کی تعداد دن دن بڑھتی ہے۔ قیدیوں کی امداد کے لئے جو انجمن قائم ہوئی ہے اس کے سکرٹری نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں صرف بمبئی پریسیڈنسی میں ایک لاکھ اٹھائیس ہزار اور بنگال میں ایک لاکھ

چوبیس[1] ہزار آدمی جیل بھیجے گئے۔ مجھے سب صوبوں کے قیدیوں کی تعداد نہیں معلوم ہو سکی لیکن جب دو صوبوں میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ قیدی ہیں تو سارے ہندوستان میں کوئی دس لاکھ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد مستقل طور پر جیل میں رہنے والوں کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے چھوٹی چھوٹی سزائیں پائی ہیں۔ مستقل قیدیوں کی تعداد ان سے بہت کم سہی مگر پھر بھی بہت ہو گی۔ ہندوستان کے بعض بڑے صوبوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے جیل کے محکمے اس قدر وسیع ہیں کہ دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوں گے۔ صوبہ متحدہ کو بھی یہ عزّت، جس کا عزت ہونا مشتبہ ہے، حاصل ہے اور غالباً اس کا جیل کا محکمہ سب سے پیچھے اور سب سے زیادہ رجعت پسند بھی ہے۔ یہاں قیدی انسان نہیں سمجھا جاتا اور اس کی طبیعت کو پہچاننے یا اس کی اصلاح کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی جاتی۔ البتہ ایک چیز میں یہ صوبہ سب سے آگے ہے کہ اپنے قیدیوں کی نگرانی بڑی سختی سے کرتا ہے۔ فرار کی کوششیں بہت ہی کم ہوتی ہیں اور مشکل سے دس ہزار میں ایک قیدی جیل سے بھاگتا ہو گا۔

جیل خانوں میں ایک افسوس ناک بات یہ نظر آتی ہے کہ قیدیوں میں پندرہ برس یا اس سے زیادہ عمر کے لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہونہار معلوم ہوتے ہیں اور اگر انھیں موقع دیا جائے تو کام کے آدمی بن سکتے ہیں۔ کچھ دن سے انھیں لکھنے پڑھنے کی ابتدائی تعلیم دینے کی کوشش شروع ہوئی ہے مگر اس کا انتظام بھی بہت ناقص ہے۔ کھیل تفریح کا موقع انھیں بہت ہی کم ملتا ہے۔ اخبار پڑھنے نہیں پاتے اور کتابوں کی اجازت بھی مشکل سے دی جاتی ہے۔ بارہ گھنٹے بلکہ اس سے بھی زیادہ قیدی اپنی بارکوں میں یا کوٹھریوں میں بند رہتے ہیں اور شام سے صبح تک ان کے لئے کوئی

---

(۱) اخبار اسٹیٹسمین ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۴ء

شغل نہیں ہوتا۔

عزیزوں وغیرہ سے ملنے کی اور انھیں خط لکھنے کی اجازت تین مہینے میں ایک بار ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وقفہ حد سے زیادہ لمبا ہے۔ اور اس پر بھی بہت سے قیدی اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اگر وہ بے پڑھے ہوں، جیسے کہ ان میں سے اکثر ہوتے ہیں تو انھیں جیل کے عہدیداروں سے خط لکھوانا پڑتا ہے اور یہ لوگ اسے بیگار سمجھ کر ٹالتے رہتے ہیں۔ یا اگر خط لکھوا بھی لیا تو پتہ ٹھیک نہیں ہوتا اور وہ پہنچتا نہیں۔ ملاقات کا معاملہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ عام طور سے جب تک جیل کے کسی عہدے دار کی مٹھی نہ گرمائی جائے، کام نہیں چلتا۔ اکثر قیدی ایک جیل سے دوسرے جیل بھیج دئے جاتے ہیں اور ان کے عزیز ان کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ میں نے ایسے قیدیوں کو دیکھا ہے جنھیں برسوں سے گھر کی خیر خبر نہیں معلوم ہوئی۔ اور جب یہ ملاقاتیں تین مہینے یا اس سے زیادہ عرصے کے بعد ہوتی بھی ہیں تو عجیب طریقے سے ہوتی ہیں۔ بہت سے قیدی اور ان کے ملاقاتی آمنے سامنے کھڑے کر دئیے جاتے ہیں اور بیچ میں کٹہرہ ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ ایک ساتھ بولتے ہیں اور ہر شخص کو چیخ چیخ کر باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ غرض اس ملاقات سے انسانی محبت کا جو تھوڑا بہت اثر پڑنا چاہیئے تھا وہ غائب ہو جاتا ہے۔

چند اونچے گنے قیدیوں کے ساتھ خاص رعایت ہوتی ہے یعنی کھانا کچھ اچھا دیا جاتا ہے اور کم وقفے کے بعد ملاقات کرنے اور خط لکھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ ان کی تعداد (فرنگیوں کو چھوڑ کر) ہزار میں ایک سے زیادہ نہیں ہوتی سول نافرمانی کی بڑی تحریکوں کے زمانے میں، جب جیل میں سیکڑوں سیاسی قیدی بھرے ہوتے ہیں ان رعایت پانے والے قیدیوں کی تعداد کچھ خفیف سی بڑھ جاتی ہے مگر مجموعہ پھر بھی بہت کم ہوتا ہے۔ ان سیاسی قیدیوں (مردوں اور عورتوں) میں سے

۹۵ فی صدی کے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا ہے اور انھیں یہ سہولتیں بھی نہیں دی جاتیں۔

بعض اشخاص جنھیں انقلابی جدوجہد کے جرم میں عمر قید یا لمبی میعاد کی سزائیں دی جاتی ہیں مدتوں قید تنہائی میں پڑے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں صوبہ متحدہ میں تو بندھا ہوا قاعدہ ہے کہ ایسے مجرم کال کوٹھری میں رکھے جائیں۔ عام مجرموں کو قید تنہائی جیل کے اندر کوئی جرم کرنے کے بدلے مزید سزا کے طور پر ہوتی ہے۔ مگر یہ سیاسی مجرم جو عموماً کم سن لڑکے ہوتے ہیں جیل میں انتہائی قابل تعریف رویہ رکھیں اب بھی کال کوٹھری میں رکھے جاتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ جیل کا محکمہ بغیر کسی وجہ کے عدالت کی دی ہوئی سزا میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ بات بڑی عجیب اور بالکل خلاف قانون معلوم ہوتی ہے۔ قید تنہائی میں خواہ تھوڑے ہی دن کی کیوں نہ ہو سخت اذیت ہوتی ہے اور جب یہ سزا برسوں تک کھنچ جائے تو نہایت ہی ہولناک چیز بن جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ذہنی قوت برابر گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ جنون کی نوبت آ جاتی ہے اور چہرے سے کچھ عجیب وحشت برسنے لگتی ہے جیسے کوئی سہما ہوا جانور ہو۔ یہ جان کو ریت ریت کر یا روح کو کند چھری سے حلال کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر آدمی اس سے بچ بھی نکلا تو ایک غیر طبعی مخلوق بن کر رہ جاتا ہے اور دنیا میں کہیں نہیں کھپ سکتا۔ یہ سوال ہمیشہ پیدا ہوتا ہے کہ دراصل اس کا کوئی قصور بھی نہ تھا؟ پولیس کے طور طریقے یوں بھی ہندوستان میں بہت سے مشتبہ ہیں اور پھر سیاسی معاملات میں تو اور بھی زیادہ۔

فرنگی یا گرانی قیدیوں کے لیے بندھا ہوا دستور ہے کہ وہ اونچے درجے میں شمار ہوتے ہیں۔ انھیں اچھا کھانا ملتا ہے ہلکا کام کرنا پڑتا ہے اور ملاقات اور خط و کتابت میں سہولتیں دی جاتی ہیں۔ ہفتے میں ایک بار پادری آتا ہے اور اس کے ذریعے

سے ان کا تعلق باہر کی دنیا سے قائم رہتا ہے۔ وہ ان کے لئے غیر ملکوں کے باتصویر اور ظریفانہ اخبار لاتا ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے ان کے عزیزوں سے ملاقات یا خط و کتابت بھی کرتا ہے۔

اس کی کوئی شکایت نہیں کہ فرنگی قیدیوں کو یہ سہولتیں حاصل ہیں اس لئے کہ اصل میں یہ کچھ زیادہ رعایتیں نہیں ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ دوسرے قیدیوں، مردوں اور عورتوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ انسانیت کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ یہ لوگ سرے سے انسان ہی نہیں سمجھے جاتے اس لئے ان کے ساتھ ویسا برتاؤ بھی نہیں ہوتا۔ جیل خانے میں حکومت کے انتظامی تشدد کا بدترین نمونہ نظر آتا ہے۔ یہ ایک مشین ہے جو بے دردی اور بے خیالی سے چلتی رہتی ہے اور جو اس کی داب میں آجائے اسے کچل کر رکھ دیتی ہے جیل کے قواعد خاص کر کے ایسے بنائے گئے ہیں جس سے اس کا مشین ہونا ظاہر ہو۔ نرودجس مردوں اور عورتوں کے لئے یہ بے روح ضابطہ سوہان روح ہو جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ لمبی میعاد کے قیدی بعض اوقات اس بے رنگ زندگی سے اس قدر عاجز آجاتے ہیں کہ ان کا جی چھوٹ جاتا ہے اور وہ بچوں کی طرح رونے لگتے ہیں۔ ایک ذرا سی ہمدردی اور دلدہی سے جو اس فضا میں اس قدر کمیاب ہے، ان کا چہرہ خوشی اور احسان مندی سے چمک اٹھتا ہے۔

مگر خود ان قیدیوں میں اکثر دیا اور بھائی چارے کی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئیں جن سے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ایک بار ایک اندھا عادی قیدی تیرہ برس کے بعد رہا کیا گیا۔ اتنی مدت کے بعد وہ بالکل خالی ہاتھ اس دنیا میں جا رہا تھا جس میں اس کا کوئی نہ تھا۔ اس کے ساتھ قیدی اس کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر ان بیچاروں کے پاس کیا تھا۔ ایک نے اپنا کرتہ جو جیل کے دفتر میں امانت تھا اسے دیدیا، دوسرے نے کچھ اور کپڑا دیا۔ تیسرے کو اسی دن صبح نئی چپل ملی تھی جو اس نے مجھے بڑے فخر

کے ساتھ دکھائی تھی جیل میں یہ بڑی دولت تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کا اندھا ساتھی ننگے پاؤں جا رہا ہے تو اس نے بڑی خوشی سے اپنی نئی چپل اسے دیدی۔ مجھے اس وقت یہ خیال آیا کہ جیل کے اندر جتنی دُنیا ہے اتنی باہر نہیں۔

اس سال یعنی سنہ ۱۹۳۰ء میں ملک کی آنکھوں نے بہت سے ناٹک کے سے منظر اور جوش دلانے والے واقعات دیکھے۔ مجھے سب سے بڑھ کر حیرت یہ تھی کہ گاندھی جی قوم کی قوم کو ابھارنے اور جوش میں لانے کی کتنی بڑی قوت رکھتے ہیں۔ اس میں کچھ مسمریزم کی سی شان نظر آتی تھی اور ہم لوگوں کو گوکھلے کے وہ الفاظ یاد آگئے جو انھوں نے گاندھی جی کے بارے میں کہے تھے کہ ان میں وہ طاقت ہے جو مٹی کے پتلوں کو سورما بنا دیتی ہے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ بامن سول نافرمانی بڑے بڑے قومی مقصد حاصل کرنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے اور سارے ملک میں خاموشی کے ساتھ یہ خیال پھیل گیا جس میں دوست دشمن سب شریک تھے، کہ ہندوستان کی فتح ہونے والی ہے۔ جو لوگ تحریک میں عملی حصہ لے رہے تھے ان کے دل میں ایک عجیب ولولہ تھا جس کا کچھ اثر جیل کے اندر بھی پہنچ گیا۔ معمولی قیدی تک یہ کہتے تھے کہ "سوراج آرہا ہے!" وہ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے تھے اس خود غرضی کی امید میں کہ شاید انھیں بھی اس سے کچھ فائدہ پہنچے۔ پہرے والے بھی بازاری خبریں سن کر یہ سمجھتے تھے کہ سوراج قریب ہے۔ جیل کے چھوٹے چھوٹے عہدیدار کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔

ہمیں جیل میں روزانہ اخبار پڑھنے کو نہیں ملتے تھے۔ صرف ایک ہندی کے ہفتہ وار اخبار سے تھوڑی بہت خبریں بھی ہمارے تخیل کو اڑ لگانے کے لئے کافی تھیں۔ روزانہ لاٹھی چارج، کبھی کبھی گولی چلنا، شولاپور کا مارشل لا، قومی جھنڈا اٹھانے والوں کو دس دس سال کی سزا۔ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ہماری قوم خصوصاً عورتیں جو کچھ کر رہی تھیں اسے سنکر ہم ان پر فخر کرتے تھے۔ مجھے خاص

طور پر یہ خوشی تھی کہ میری والدہ، بیوی، سگی بہنیں، رشتے کی بہنیں اور ان کی سہیلیاں بڑا کام کر رہی ہیں۔ اگرچہ میں ان سے جدا تھا اور قید میں تھا لیکن ایک اعلیٰ مقصد کی خدمت نے ہمارے دلوں میں رفاقت کا ایک نیا رشتہ قائم کرکے دوری کے پردے اٹھا دیئے تھے اور ہم ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ خاندان قوم میں گھل مل گیا ہے مگر آپس کی محبت کا وہی مزا ہے جو پہلا تھا۔ مجھے کملا پر تعجب آتا تھا۔ اس کا جوش عمل بیماری پر غالب آ گیا اور کم سے کم کچھ دن تک سخت محنت اور مصروفیت کے باوجود وہ بالکل اچھی رہی۔

مجھے یہ فکر ستا رہی تھی کہ میں ایک حد تک آرام سے بیٹھا ہوں اور جو لوگ باہر ہیں وہ اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں اور تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ میرا دل بےچین تھا کہ کسی طرح میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔ مگر یہ تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے جیل میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا شروع کیا کہ کچھ تو تسلی کا مزا آئے۔ کوئی تین گھنٹے روز چرخا کاتتا تھا اور تین گھنٹے نواڑ بننے کا کام کرتا تھا جو میں نے جیل والوں سے خاص طور پر کہہ کر اپنے ذمہ لیا تھا۔ یہ شغل مجھے پسند تھے ان میں کچھ زیادہ محنت اور توجہ کی ضرورت نہیں تھی اور ان کی وجہ سے جی بہل جاتا تھا اور دل کی بےچینی کچھ کم ہو جاتی تھی۔ کتب بینی بھی بہت کرتا تھا اور اس کے علاوہ جھاڑنے پونچھنے، اپنے کپڑے دھونے اور اسی قسم کے اور کاموں میں مصروف رہا کرتا تھا۔ یہ ساری مشقت میں اپنی خوشی سے کرتا تھا ورنہ میری قید اصل میں "قید محض" تھی۔

غرض باہر کے واقعات کے خیال میں، اور جیل کے کاموں کے شغل میں، میری زندگی یکسانی میں گذرتی رہی۔ ہندوستان کے جیل کے طریقوں کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس میں اور ہمارے ملک کی برطانوی حکومت میں بہت مشابہت ہے۔ حکومت کا نظام بہت پکا اور گٹھا ہوا ہے جس کی وجہ سے ملک اس کی

ملتی ہیں ہے مگر ملک کے باشندوں کی کوئی پرواہ نہیں جیل کا انتظام بھی دیکھنے میں بہت باقاعدہ معلوم ہوتا ہے اور ایک حد تک ہے بھی مگر کسی کو اس کا احساس نہیں کہ جیل کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو بیچارے اس میں آتے ہیں ان کی مدد اور اصلاح کرے۔ ہاں تو بس ایک ہی خیال ہے کہ انھیں کوٹ پیٹ کر سارا کس بل نکال دو تاکہ جب وہ باہر جائیں تو ان میں ذرا بھی جان نہ باقی رہے۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ جیل کا انتظام اور قیدیوں کی روک تھام اور تنبیہ کس طرح ہوتی ہے؟ زیادہ تر خود انھیں قیدیوں کی مدد سے جن میں قیدی پہریدار اور قیدی جمعدار بنائے جاتے ہیں اور سزا کے خوف سے یا انعام اور تخفیف میعاد کے لالچ میں جیل کے عہدیداروں سے اتحاد عمل پر آمادہ کئے جاتے ہیں ان کے مقابلے میں تنخواہ پانے والے پہرے دار بہت کم ہیں جیل کے اندر نگرانی کا کام زیادہ تر یہی قیدی پہریدار اور قیدی جمعدار کرتے ہیں۔ جاسوسی کا ایک جال پھیلا ہوا ہے اور قیدیوں سے ایک دوسرے کی مخبری کرائی جاتی ہے۔ ان کو ایک جگہ جمع ہونے یا مل کر کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب تک وہ الگ نہ رکھے جائیں ان پر قابو نہیں رہ سکتا۔

جیل کے باہر ملک کی حکومت میں یہی طریقہ ایک بڑے پیمانے پر نظر آتا ہے۔ اگرچہ اتنا کھلا ہوا نہیں ہے۔ وہاں قیدی پہریداروں اور قیدی جمعداروں کے نام دوسرے ہیں۔ ان کے القاب اور خطاب زیادہ شاندار اور وردیاں زیادہ بھڑکدار ہوتی ہیں اور ان کے پیچھے (اسی طرح جیسے جیل میں) مسلح گارد سنگینیں لئے کھڑا رہتا ہے کہ وہ حکم سے سرتابی نہ کرنے پائیں۔

اس زمانے کی سلطنت میں جیل خانے کس قدر اہم چیز ہیں! کم سے کم قیدی یہی سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں حکومت کے اور سب شعبے جیل، پولیس اور فوج کے سامنے بالکل حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ جیل ہی میں مارکس کا یہ نظریہ سمجھ

میں آتا ہے کہ سلطنت یا ریاست وہ جبر و تشدد کا آلہ ہے جس کے ذریعے سب لوگ حکومت کرنے والے طبقے کی مرضی کے آگے سر جھکانے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔

ایک مہینے تک میں اپنی بارک میں اکیلا رہا۔ اس کے بعد ایک ساتھی نربدا پرشاد سنگھ آ گئے اور ان کے آنے سے بڑی تسکین ہوئی۔ ڈھائی مہینے بعد جون ۱۹۳۰ء کی آخری تاریخ کو ہمارے چھوٹے سے احاطے میں غیر معمولی ہلچل مچ گئی۔ صبح تڑکے کیا دیکھتے ہیں کہ میرے والد اور ڈاکٹر سید محمود چلے آ رہے ہیں۔ یہ دونوں صبح کو آنند بھون میں سو رہے تھے کہ ایک دم سے گرفتار کر کے یہاں بھیج دئے گئے۔

(۳۱)

یروڈا میں صلح کی بات چیت

میرے والد کے گرفتار ہوتے ہی یا شاید اس کے کچھ دن پہلے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی خلاف قانون جماعت قرار دیدی گئی۔ اس سے ایک نئی صورت یہ پیدا ہوئی کہ جب کبھی کمیٹی کا اجلاس ہوتا تھا اس کے سب ممبر ایک ساتھ گرفتار کر لیے جاتے تھے۔ قائمقام ممبروں کو جو اختیارات حاصل تھے ان کی رو سے ان ممبروں کی جگہ دوسرے ممبر منتخب کئے جاتے تھے اور اس طرح کئی عورتیں بھی ممبر مقرر ہوئیں جن میں سے ایک کملا بھی تھی۔

جس وقت میرے والد جیل میں آئے ان کی صحت بہت خراب تھی اور جس طریقے سے وہ وہاں رکھے گئے اس سے انھیں سخت تکلیف پہنچی۔ حکومت نے خواہش کر کے ایسا نہیں کیا اس لئے کہ جہاں تک ممکن تھا وہ ان تکلیفوں کو کم کرنے کو تیار تھی مگر نینی جیل میں راحت کا سامان مہیا کرنا ممکن نہ تھا۔ بارک کی تنگ چار دیواری کے اندر ہم چار آدمی ٹھونس دیے گئے تھے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے یہ تجویز کیا کہ والد جیل کے کسی اور حصے میں رکھے جائیں جہاں ذرا زیادہ جگہ ہو مگر ہم نے ساتھ رہنا پسند کیا تاکہ ہم لوگ خود ان کی خدمت کر سکیں۔

برسات شروع ہو گئی تھی اور کوٹھری کے اندر بھی پانی سے محفوظ رہنا مشکل تھا اس لیے کہ چھت جگہ جگہ سے ٹپکتی تھی۔ رات کو یہ فکر ہوتی تھی کہ دس فٹ لمبے اور پانچ فٹ چوڑے برآمدے میں جو ہماری کوٹھری کے آگے تھا والد کا پلنگ کہاں بچھایا جائے کہ وہ بھیگنے سے محفوظ رہیں۔ ان کی طبیعت بہت مضمحل تھی، اور

کبھی کبھی بخار بھی آجاتا تھا۔ آخر میں جیل کے حکام نے یہ فیصلہ کیا کہ ہماری کوٹھری کے متصل ایک اور برآمدہ جو کافی وسیع ہو بنوا دیا جائے۔ چنانچہ یہ برآمدہ بن گیا اور اس سے گنجائش بہت بڑھ گئی مگر والد کو اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ اس لئے کہ اس کے تیار ہونے کے چند ہی روز بعد وہ رہا کر دیئے گئے۔ البتہ ہم لوگوں نے جو وہاں رہ گئے تھے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔

جولائی کے آخر میں ہر طرف یہ چرچا ہو رہا تھا کہ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکار صاحب حکومت اور کانگریس میں صلح کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں اس کی اطلاع ایک روزانہ اخبار سے ہوئی جو والد کے لئے خاص رعایت کے طور پر آتا تھا۔ اسی میں ہم نے وہ خطوط پڑھے جو لارڈ اروِن اور سپرو اور جیکار صاحبان نے ایک دوسرے کو لکھے تھے اور اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں جو "صلح کے پیامبر" کہلاتے تھے گاندھی جی سے ملنے گئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان حضرات نے یہ پیش قدمی کس وجہ سے کی ہے اور یہ کیا چاہتے ہیں۔ آگے چل کر انھوں نے ہمیں بتایا کہ انھیں اس کارروائی کی جرأت اس مختصر بیان کی وجہ سے ہوئی تھی جس کے شائع کرنے پر میرے والد نے بمبئی میں اپنی گرفتاری سے چند روز پہلے رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس بیان کا مسودہ مسٹر سولوکوسب (لندن کے ڈیلی ہیرلڈ کے نامہ نگار جو ان دنوں ہندوستان میں تھے) نے والد سے گفتگو کرنے کے بعد تیار کیا تھا اور والد نے اسے پسند کیا تھا۔ اس بیان[1] میں

---

(۱) وہ بیان جو ۲۵ جون ۱۹۳۰ء کو بمبئی میں پنڈت موتی لال نہرو کی رضامندی سے مرتب کیا گیا۔ "گو یہ ظاہر ہے کہ حکومت ہند اور حکومت برطانیہ پہلے سے یہ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ گول میز کانفرنس جو اپنی رائے میں بالکل آزاد ہے، کیا تجاویز پیش کرے گی اور یہ کہ برطانوی

اس کا امکان ظاہر کیا گیا تھا کہ اگر حکومت چند شرائط کو مان لے تو کانگرس سول نافرمانی کی تحریک کو روک دے گی۔ یہ ایک مبہم اور مشروط بیان تھا مگر اس میں یہ بات بالکل صاف کر دی گئی تھی کہ ان شرائط پر اس وقت تک غور نہیں کیا جا سکتا جب تک والد کو گاندھی جی سے اور مجھ سے مشورہ کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ میرا نام اس وجہ سے لیا گیا تھا کہ میں اس سال کانگرس کا صدر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ والد نے اپنی گرفتاری کے بعد نینی میں مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا اور انھیں افسوس تھا کہ انھوں نے جلد ہی میں ایسا مبہم بیان دے دیا جس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ واقعی اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اور اسی پر کیا موقوف ہے ہر بیان سے خواہ وہ کتنا ہی صاف اور واضح کیوں نہ ہو ان لوگوں کو جن کا طرز خیال ہم سے بالکل مختلف ہے غلط فہمی

(نوٹ صفحہ ٣٧٥) پارلیمنٹ کا رویہ ان تجاویز کے متعلق کیا ہوگا۔ پھر بھی اگر کسی صورت سے یہ دونوں حکومتیں اپنی طرف سے یہ وعدہ کر لیں کہ وہ ہندوستان کو کامل خود اختیاری حکومت دئے جانے کی حمایت انتقال اختیارات کی ان شرائط کے ماتحت کرنے پر تیار ہیں جو ہندوستان کے مخصوص خیالات اور ضروریات اور اس کے اور برطانیہ کے قدیم تعلقات کے لحاظ سے ان کے باہمی معاملات کے تصفیہ کے لئے ضروری ہیں اور گول میز کانفرنس میں طے کی جائیں گی، تو پنڈت موتی لال نہرو حکومت کے اس وعدے کی (یا کسی ذمہ وار فریق ثالث کے اس بیان کی کہ حکومت ایسا وعدہ کرنے والی ہے) اطلاع خود جا کر مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو دیں گے۔ اگر یہ وعدہ کیا جائے اور فریق ثانی اسے قبول کر لے تو آپس میں اس حد تک مصالحت ہو سکتی ہے کہ ایک ہی وقت میں سول نافرمانی موقوف کر دی جائے۔ حکومت کی موجودہ تشدد کی پالیسی ختم ہو جائے اور سیاسی قیدیوں کو عام معافی مل جائے اور اس کے بعد کانگرس ان شرطوں کے ساتھ جنھیں فریقین منظور کر لیں گول میز کانفرنس میں شرکت کرے۔"

پیدا ہو سکتی ہے۔

۲۷ جولائی کو یکایک سر تیج بہادر سپرو اور جے کار صاحب گاندھی جی کا خط لیکر ینی جیل میں ہمارے پاس آن پہنچے۔ اس روز اور دوسرے دن ہم میں اور ان میں طویل گفتگو ہوتی رہی جس سے والد کو بہت سخت تکان ہوئی اس لئے کہ ان دنوں انھیں حرارت رہا کرتی تھی، ہم میں گھنٹوں بحث ہوتی تھی مگر لوٹ پھیر کر اسی جگہ آجاتے تھے جہاں سے ہمارے اور ان کے سیاسی خیالات میں اس قدر اختلاف تھا کہ ہم ایک دوسرے کے خیالات اور الفاظ کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہمارے خیال میں یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ موجودہ حالات میں کانگرس اور حکومت میں صلح کا مطلق امکان نہیں ہے۔ ہم نے صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیقوں خصوصاً گاندھی جی سے مشورہ نہ کرلیں کوئی تجویز پیش نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہم نے گاندھی جی کو اسی مضمون کا خط لکھ دیا۔

گیارہ دن کے بعد یعنی ۸ راگست کو ڈاکٹر سپرو وائسرائے کا جواب لے کر ہم سے ملنے کے لئے دوبارہ تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ وائسرائے کو ہمارے یروداجانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر وہ اور ان کی کونسل ہمیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ ہم سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں سے ملیں جو جیل کے باہر ہیں اور حکومت کے خلاف عملی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سپرو نے ہم سے پوچھا کہ تم لوگ اس صورت میں یرودا جانے پر تیار ہو یا نہیں، ہم نے جواب دیا کہ ہم گاندھی جی سے ملنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں مگر جب تک ہم اپنے دوسرے رفیقوں سے نہ ملیں ہمارے لئے کوئی قطعی فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ اسی روز (یا شاید اس سے ایک دن پہلے) اخبار سے یہ خبر معلوم ہوئی تھی کہ بمبئی میں سخت لاٹھی چارج ہوا اور ولبھ بھائی پٹیل

مالوی جی، تصدق شیروانی اور دوسرے لوگ جو ورکنگ کمیٹی کے مستقل یا قائم مقام ممبر تھے گرفتار کرلئے گئے ہم نے ڈاکٹر سپرو سے کہا کہ اس سے معاملہ اور زیادہ خراب ہوگیا ہے اور ان سے درخواست کی کہ وائسرائے کو صورت حال اچھی طرح سمجھا دیں۔ مگر ڈاکٹر سپرو کو اس پر اصرار تھا کہ گاندھی جی سے جلد سے جلد مل لو۔ یہ ہم ان سے پہلے بھی کہہ چکے تھے کہ اگر یروداِ بھیجے جائیں تو ڈاکٹر سید محمود کو بھی جو نینی میں ہمارے ساتھ تھے کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے ضرور جانا چاہیئے۔

اس کے تیسرے دن یعنی ۱۰ اگست کو ہم تینوں (والد، محمود اور میں) اسپیشل ٹرین پر نینی سے پونا بھیجے گئے ہماری گاڑی بڑے اسٹیشنوں پر نہیں ٹھہرتی تھی بلکہ انہیں چھوڑتی چلی جاتی تھی اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر ٹھہرائی جاتی تھی پھر بھی ہمارے جانے کی خبر پھیل گئی تھی اور جن اسٹیشنوں پر ہم ٹھہرے اور جن پر نہیں ٹھہرے سب پہ لوگوں کے بڑے بڑے مجمعے اکٹھا ہو گئے تھے۔ ۱۱ کو رات گئے ہم کرکی اسٹیشن پہ جو پونا کے قریب ہے پہنچ گئے۔

ہمیں یہ توقع تھی کہ ہم گاندھی جی کے ساتھ ٹھہرائے جائیں گے یا کم سے کم ان سے بہت جلد مل سکیں گے۔ یروداِ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے یہی انتظام کیا بھی تھا مگر عین وقت پر انہیں اس پولیس افسر کے ذریعے سے جو نینی سے ہمارے ساتھ آیا تھا کچھ ایسی ہدایتیں ملیں جن کی وجہ سے انہیں اپنا انتظام بدلنا پڑا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ لفٹننٹ کرنل مارٹن یہ راز ہم پر نہیں ظاہر کرنا چاہتے تھے مگر والد نے چپکے چپکے پوچھ کچھ کرکے معلوم کرلیا کہ اصل مدعا یہ ہے کہ ہم (کم سے کم پہلی بار) گاندھی جی سے اس وقت تک نہ ملنے پائیں جب تک سپرو اور جیکار صاحبان وہاں موجود نہ ہوں کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر ہم ان سے پہلے مل لئے تو ہمارا رویّہ اور زیادہ سخت ہو جائے گا یا ہمارے خیالات میں اور زیادہ اتفاق ہو جائے گا۔ چنانچہ اس رات کو اور دوسرے

دن اور دوسری رات کو ہم ایک الگ بارک میں رکھے گئے جس پر والد کو بہت غصہ آیا۔ ہمیں سخت تکلیف اور تعلق تھا کہ ہم گاندھی جی سے ملنے کے لئے اتنی دور سے آئے ہیں اور ایک ہی عمارت میں ہونے کے باوجود ان سے ملنے نہیں پاتے۔ ۱۳ رکی سہ پہر کو یہ اطلاع آئی کہ سر تیج بہادر سپرو اور جیکار صاحب آ گئے ہیں۔ گاندھی جی بھی ان کے ساتھ جیل کے دفتر میں ہیں اور ہم لوگوں کی وہیں طلبی ہے۔ والد نے جانے سے انکار کر دیا۔ جب بہت کچھ عذر معذرت کی گئی تو وہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ پہلے ہم لوگ تنہائی میں گاندھی جی سے ملیں گے۔ اس کے بعد ہم سب کی متفقہ درخواست پر ولبھ بھائی پٹیل، جیرام داس دولت رام (جو یروداجیل میں لائے جا چکے تھے) اور سروجنی نائیڈو (جو اسی عمارت کے سامنے عورتوں کے جیل میں تھیں) کو بھی ہمارے مشورے میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اسی دن شام کو والد، محمود اور میں گاندھی جی کے احاطے میں منتقل کر دیئے گئے اور یروداکے مختصر دوران قیام میں وہیں رہے۔ ولبھ بھائی پٹیل اور جیرام داس دولت رام بھی اس عرصے میں ہمارے ساتھ ہی رکھے گئے تاکہ ہم آپس میں مشورہ کر سکیں۔

تین روز یعنی ۱۳ر ۱۴ر ۱۵ر اگست کو ہم سے اور سپرو اور جیکار صاحبان سے جیل کے دفتر میں گفتگو ہوتی رہی اور ہم نے انھیں چند خطوط کے ذریعے سے اپنے خیالات کی اطلاع دی اور وہ کم سے کم شرطیں بتائیں جن پر ہم سول نافرمانی کو روکنے اور حکومت سے اتحاد عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔ یہ خطوط[1] بعد میں اخباروں میں شائع ہو گئے۔

---

(۱) وہ خط جس میں کم سے کم شرطیں بتائی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ (ب) میں درج ہیں۔

ان طویل مشوروں میں شریک ہونے کا میرے والد کی صحت پر اس قدر بوجھ پڑا کہ ۱۶ ار کو انھیں بہت تیز بخار ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ہماری واپسی میں کچھ دیر ہوئی ۱۹ ار کو ہم پھر اسپیشل ٹرین سے نینی روانہ ہوئے۔ بمبئی کی حکومت نے ہر طرح سے کوشش کی کہ والد آرام سے سفر کر سکیں اور یرودا کے مختصر قیام کے زمانے میں بھی ان کے آرام کا خاص طور پہ خیال رکھا گیا جس رات کو ہم یرودا پہنچے ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ کرنل مارٹن سپرنٹنڈنٹ جیل نے والد سے پوچھا کہ آپ کس قسم کا کھانا پسند کرینگے والد نے کہا کہ میں بہت سادہ اور ہلکی غذا کھاتا ہوں اور اس کے بعد صبح کی چائے سے لے کر رات کے کھانے تک اپنی کل ضروریات کی فہرست بتانی شروع کی (نینی میں ہمارے لئے روز گھر سے کھانا آیا کرتا تھا) یہ فہرست جو والد نے بہت ہی سادگی اور بھولے پن سے بتائی تھی، تھی تو ہلکی غذاؤں کی، مگر بڑی زبردست فہرست تھی۔ اس میں شک نہیں کہ رٹز ہوٹل یا سوائے ہوٹل میں یہ بہت سادے اور معمولی کھانے سمجھے جاتے جیسا کہ والد انھیں سمجھتے تھے مگر کہاں یرودا جیل اور کہاں یہ چیزیں۔ جب کرنل مارٹن والد کی مہنگی ضرورتوں کی لمبی چوڑی فہرست سن رہے تھے تو ان کے چہرے کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی اور میں اور محمود اسے دیکھ کر لطف اٹھا رہے تھے۔ ایک مدت سے ہندوستان کا سب سے بڑا اور سب سے مشہور لیڈر ان کے جیل میں تھا اور اسے کھانے کے لئے صرف بکری کے دودھ کھجور یا کبھی کبھی ایک آدھ سنترے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب جن لیڈر سے انھیں سابقہ پڑا یہ کچھ اور ہی قسم کا تھا۔

پونا سے نینی واپس جاتے ہوئے پھر ہماری گاڑی بڑے اسٹیشنوں کو چھوڑتی گئی اور چھوٹے اسٹیشنوں پہ ٹھہری۔ مگر مجمع پہلے سے بھی زیادہ تھا۔ پلیٹ فارم کھچا کھچ بھر جاتے تھے بلکہ کہیں کہیں خصوصاً ہردا، اٹارسی اور سہاگ پور میں لوگ ریل

کی بیڑیوں پر چل پڑتے تھے۔ کئی بار حادثے ہوتے ہوتے رہ گئے۔

والد کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔ بہت سے ڈاکٹر خود ان کے بلائے ہوئے اور صوبے کی حکومت کے بھیجے ہوئے انھیں دیکھنے آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جیل میں رہنا ان کے لئے سخت مضر تھا اور وہاں ٹھیک طور پر علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی جب کسی دوست نے اخبار میں یہ تجویز پیش کی کہ وہ بیماری کی وجہ سے رہا کر دیئے جائیں تو انھیں بہت ناگوار ہوا اس لئے کہ انھیں اندیشہ تھا لوگ یہ سمجھیں گے کہ اس میں خود ان کا اشارہ ہے بلکہ انھوں نے لارڈ اردن کو اس مضمون کا تار بھی بھیجا کہ مجھے خاص رعایت کے طور پر رہا کیا جانا منظور نہیں۔ مگر ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ وزن بہت تیزی سے گھٹ رہا تھا اور اس قدر دُبلے ہو گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ خود نہیں بلکہ ان کی پرچھائیں رہ گئی ہے۔ ۸ ستمبر کو وہ دس ہفتے جیل میں رہنے کے بعد رہا کر دیئے گئے۔

ان کے جانے سے ہماری بارک سونی ہو گئی۔ جب تک وہ تھے ہمیں بہت سے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لئے رہا کرتے تھے اور ہم سب یعنی محمود، نرمدا پرشاد اور میں بڑی خوشی سے ان کی خدمت میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ میں نے نواڑ بننا چھوڑ دیا تھا اور چرخا بھی بہت کم کاتتا تھا۔ اب ہم نے بادل ناخواستہ پھر وہی پرانا دھندا اختیار کر لیا۔ والد کی رہائی کے بعد روزانہ اخبار تک بند ہو گیا چار پانچ روز کے بعد میرے بہنوئی رنجیت۔ ایس۔ پنڈت بھی گرفتار ہو کر ہماری بارک میں پہنچ گئے۔

ایک مہینے بعد یعنی ۱۱ر اکتوبر کو میری چھ مہینے کی قید کی میعاد ختم ہو گئی اور میں رہا کر دیا گیا۔ میں جانتا تھا کہ زیادہ دن آزاد نہیں رہنے پاؤں گا۔ اس لئے کہ لڑائی جاری تھی اور اس کی شدت بڑھتی جاتی تھی۔ "صلح کے پیامبر" سپرو اور

چونکہ کار صاحبان کی کوششیں ناکامیاب ثابت ہوئی تھیں میری رہائی کے دو تین
دن بعد نئے آرڈی ننس جاری کئے گئے۔ میں خوش تھا کہ آزادی کے مختصر
زمانے میں کچھ مفید کام کر لوں گا۔

کملا ان دنوں الہ آباد ہی میں کانگریس کا کام کر رہی تھی۔ والد علاج کے لئے
مسوری گئے ہوئے تھے اور والدہ اور بہنیں ان کے ساتھ تھیں۔ کملا کے ساتھ مسوری
روانہ ہونے سے پہلے میں ڈیڑھ دن الہ آباد میں بہت مصروف رہا۔ اس وقت ہمارے
سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کی جائے یا نہیں
لگان اور مالگزاری کی ادائگی کا زمانہ قریب آگیا تھا اور اس کی وصولی بہرحال مشکل
تھی اس لئے کہ زراعتی پیداوار کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ عالمگیر کساد بازاری کا اثر
اب ہندوستان میں صاف نظر آرہا تھا۔

محصول نہ دینے کی تحریک شروع کرنے کے لئے یہ بہت اچھا موقع تھا۔ یہ
چیز سول نافرمانی کی عام تحریک کا ایک جزو بن سکتی تھی اور بجائے خود بھی ضروری تھی
زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں کے لئے اس سال کی پیداوار میں سے
پورا مطالبہ ادا کرنا صریحی طور پر ناممکن تھا۔ زمینداروں میں سے تو اکثر کے پاس تھوڑا
بہت سرمایہ بھی تھا اور انہیں قرض بھی آسانی سے مل سکتا تھا۔ مگر کاشتکار ہمیشہ
اس قدر محتاج تھے کہ انہیں یوں بھی فاقے کا سامنا رہتا تھا اور ان کے لئے
روپیہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کسی جمہوری ملک میں یا ایسی جگہ جہاں
کاشتکاروں میں تنظیم ہوتی ہے اور ان کا کچھ اثر ہوتا ہے ان حالات میں
لگان وصول کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ ہندوستان میں ان چند حصوں کے علاوہ جن میں
کانگریس ان کی حمایت کرتی ہے، ان کا کوئی اثر نہیں۔ البتہ اس کا اندیشہ ضرور رہتا
ہے کہ جب ان کی حالت ناقابل برداشت ہو جائے گی تو وہ شورش پر آمادہ

ہوجائیں گے مگر انھیں پشت ہا پشت سے اس کی عادت ڈال دی گئی ہے کہ ہر طرح کی سختیاں چپ چاپ برداشت کریں۔

گجرات میں اور بعض اور حصوں میں اس وقت محصول نہ دینے کی تحریک جاری تھی مگر یہ سب تقریباً سیاسی تحریکیں تھیں جو سول نافرمانی کے سلسلے میں ہو رہی تھیں بعض علاقوں میں رعیت واری طریقہ رائج تھا اور کسانوں کو بلاواسطہ حکومت سے سابقہ تھا۔ ان کے محصول نہ دینے کا اثر براہ راست سلطنت پر پڑتا تھا مگر صوبہ متحدہ کی حالت دوسری تھی اس لئے کہ یہاں زمینداری اور تعلقداری کا رواج تھا اور کاشتکاروں اور سلطنت کے بیچ میں درمیانی لوگ موجود تھے۔ اگر کاشتکار لگان دینا موقوف کردیں تو اس کا اثر براہ راست زمیندار پر پڑتا تھا اور اس طرح طبقوں کی مخالفت کا مسئلہ پیدا ہوجاتا تھا۔ کانگریس مجموعی طور پر خالص قومی جماعت تھی اور اس میں بہت سے اوسط درجے کے اور بعض بڑے بڑے زمیندار بھی شامل تھے۔ اس کے لیڈر اس بات سے بہت ڈرتے تھے کہ کہیں طبقوں کی مخالفت کا سوال نہ اٹھ کھڑا ہو اور زمیندار نہ بگڑ جائیں۔ اس لئے سول نافرمانی کے پہلے چھ مہینے میں وہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کرنے سے بچتے رہے حالانکہ موقع بہت اچھا تھا۔ مجھے اس صورت میں بلکہ کسی صورت میں بھی طبقوں کی مخالفت کا مسئلہ چھیڑنے میں مطلق تامل نہ تھا مگر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کانگریس کی جو نوعیت ہے اس کی وجہ سے وہ اس وقت طبقوں کی جنگ کی سرپرستی نہیں کرسکتی۔ البتہ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ زمینداروں اور کاشتکاروں دونوں کو لگان اور مالگذاری ادا نہ کرنے کی ہدایت کرے۔ یہ خیال ضرور تھا کہ غالباً اکثر زمیندار حکومت کو مالگذاری ادا کردیں گے مگر ایسا کرتے تو خود انھیں کا قصور تھا۔

اکتوبر میں جب میں جیل سے چھوٹا تو مجھے یہ نظر آیا کہ سیاسی اور معاشی حالات

کا شدید تقاضا ہے کہ دیہات میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کردی جائے۔ کسانوں کی معاشی مشکلات تو ظاہر ہی تھیں اور سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو اگرچہ ہماری سول نافرمانی کی تحریک اب بھی سارے ملک میں چل رہی تھی مگر ذرا پھیکی پڑتی جاتی تھی۔ شہروں میں اوسط طبقے کے لوگ ہڑتالوں اور جلوسوں سے کچھ اکتا سے گئے تھے۔ صریحی طور پر کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دے اور ان کی رگوں میں تازہ خون دوڑا دے۔ یہ نئی چیز صرف کاشتکاروں ہی سے حاصل ہوسکتی تھی۔ یہ ہماری محفوظ قوت کا زبردست خزانہ تھا جس سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا تھا۔ اس طرح یہ امید تھی کہ ہماری تحریک عام لوگوں کی اہم اغراض سے وابستہ ہوکر نئے سرے سے ایک عام تحریک بن جائے گی اور میرے نزدیک اس سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ اس کی وجہ سے سماجی مسائل چھڑ جائیں گے۔

میرے ڈیڑھ دن کے الہ آباد کے قیام میں مجھ میں اور میرے رفیقوں میں انھیں معاملات پر بحث ہوتی رہی۔ فوری اطلاع کے ذریعے سے ہم نے اپنے صوبے کی کانگرس کمیٹی کا جلسہ کیا اور طویل بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ صرف لگان نہ دینے کی تحریک کی منظوری دیدی جائے اور ہر ضلعے کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ چاہے تو اس تحریک کو شروع کردے۔ خود ہم نے صوبے کے کسی حصے میں اس تحریک کا اعلان نہیں کیا۔ ہماری مجلس منتظمہ نے اس تجویز میں کاشتکاروں اور زمینداروں دونوں کو شامل کرلیا تاکہ جہاں تک ہوسکے طبقوں کی مخالفت کا مسئلہ نہ چھڑنے پائے۔ مگر یہ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ اصل میں اس پر صرف کاشتکار ہی عمل کریں گے۔

اس اجازت کے ملتے ہی ہمارا الہ آباد کا ضلع پہلا قدم اٹھانے کو تیار ہوگیا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ ایک ہفتے کے بعد ضلعے کے کسانوں کی ایک نمائندہ کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ نئی تحریک شروع کی جاسکے۔ میں سمجھتا تھا کہ جیل سے چھوٹنے

کے بعد ایک ہی روز میں میں نے کافی کام کرلیا ہے اس کے علاوہ اسی دن میں الہ آباد شہر کے ایک بہت بڑے عام جلسے میں شریک ہوا اور وہاں ایک طویل تقریر کی۔ اسی تقریر کی وجہ سے مجھے کچھ دن کے بعد دوبارہ قید کی سزا دی گئی۔

۱۳ اکتوبر کو کملا اور میں دونوں مسوری روانہ ہو گئے تاکہ تین دن والد کی خدمت میں رہیں۔ انھیں کسی قدر افاقہ معلوم ہوتا تھا اور میں یہ سمجھ کر بہت خوش ہوا کہ اب اُن کی طبیعت سنبھل گئی اور اچھے ہو جائیں گے۔ مجھے وہ سکون اور مسرت کے دن اب تک یاد ہیں اتنے عرصے کے بعد اپنے خاندان میں واپس آنا کیا اچھا معلوم ہوتا تھا میری لڑکی اندرا اور میری بہن کی تین بچیاں بھی وہاں موجود تھیں میں ان بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور کبھی کبھی ہم ایک شاندار جلوس بنا کر گھر کے آس پاس چکر لگاتے تھے سب سے چھوٹی بچی جس کی عمر تین چار سال کی تھی ہاتھ میں جھنڈا لئے آگے آگے ہوتی تھی اور سب مل کر "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" گاتے جاتے تھے۔ یہ آخری تین دن تھے جو میں نے اپنے والد کے ساتھ اطمینان سے گذارے۔ اس لئے کہ اس کے بعد ان پر اس مہلک بیماری کا حملہ ہوا جس نے انھیں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

چونکہ میرے والد کو یہ اندیشہ تھا کہ میں بہت جلد دوبارہ گرفتار ہو جاؤں گا اور وہ چاہتے تھے کہ کچھ دن اور میرے ساتھ رہ لیں اس لئے انھوں نے یکایک یہ فیصلہ کیا کہ وہ بھی الہ آباد واپس چلیں گے۔ کملا اور میں ۱۷ اکتوبر کو مسوری سے جا رہے تھے تاکہ ۱۹ اکتوبر کو الہ آباد میں کسانوں کی کانفرنس میں شریک ہو سکیں۔ والد نے کہا کہ میں ۱۸ اکتوبر کو سب کر کے روانہ ہو جاؤں گا۔

واپسی میں میرا اور کملا کا سفر خاصہ ہنگامہ خیز رہا۔ دہرہ دون سے روانہ ہوتے وقت مجھے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا نوٹس دیا گیا۔ لکھنؤ میں ہمیں چند گھنٹے کی مہلت مل گئی۔ معلوم ہوا کہ وہاں بھی دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس میرے لئے تیار تھا مگر

اس کی تعمیل نہ ہوسکی کیونکہ پولیس کا افسر مجمع کی زیادتی کی وجہ سے مجھ تک پہنچ نہیں پایا۔ وہاں میونسپلٹی نے مجھے ایڈریس دیا اور اس کے بعد ہم موٹر کار میں الہ آباد روانہ ہوگئے۔ راستے میں کئی جگہ ٹھہر کر کسانوں کے مجمعوں میں تقریریں کیں اور ۱۸ کو رات کے وقت الہ آباد پہنچ گئے۔

۱۹ کی صبح کو میرے لئے دفعہ ۱۴۴ کا ایک اور نوٹس آن پہنچا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور میں چند گھنٹے سے زیادہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ دوبارہ گرفتار ہونے سے پہلے کسانوں کی کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع مل جائے ہم اسے پرائیویٹ کانفرنس کہتے تھے اور وہ واقعی پرائیویٹ کانفرنس تھی اس لئے کہ اس میں صرف کسانوں کے نمائندے شریک کئے گئے تھے۔ باہر والوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ کانفرنس الہ آباد کے ضلعے کی پوری نمائندگی کر رہی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس میں ۱۶۰۰ ڈیلی گیٹ موجود تھے۔ کانفرنس نے بہت جوش و خروش سے یہ فیصلہ کیا کہ ضلعے میں محصول نہ دینے کی تحریک شروع کردی جائے۔ ہمارے خاص خاص کارکنوں کو کسی قدر تامل تھا اور اس تحریک کی کامیابی میں شبہ تھا کیونکہ بڑے زمیندار، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ حکومت ان کی پشت پناہ تھی، کسانوں کو دھمکانے اور ستانے کی بہت بڑی قوت رکھتے تھے اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کسان کس حد تک اس کا مقابلہ کرسکیں گے۔ مگر چھوٹے بڑے کسانوں کے ۱۶۰۰ نمائندوں کو جو وہاں موجود تھے مطلق تامّل اور شبہ نہیں تھا یا کم سے کم وہ اسے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ میں نے بھی اس کانفرنس میں تقریر کی معلوم نہیں کہ یہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی تھی یا نہیں۔

وہاں سے میں والدہ اور دوسرے عزیزوں کو لینے اسٹیشن گیا۔ گاڑی دیر سے آئی اور ان لوگوں کے پہنچنے کے بعد ہی مجھے ایک جلسے میں شریک ہونے کے

لئے جانا پڑا جو کسان اور شہر والے مل کر کر رہے تھے۔ کملا اور میں آٹھ بجے رات کے بعد جلسے سے تھکے تھکائے واپس آ رہے تھے۔ میں خوش تھا کہ گھر جا کر والد سے باتیں کروں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے اس لئے کہ ان کے واپس آنے کے بعد میری ان کی بات چیت نہیں ہونے پائی تھی۔ ہم گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے کہ ہماری موٹر روک لی گئی اور میں گرفتار کر کے جمنا پار اپنی پرانی بارک میں پہنچا دیا گیا۔ کملا اکیلی آنند بھون پہنچی۔ اس نے سارے خاندان کو جو ہمارا انتظار کر رہا تھا یہ نئی خبر سنائی۔ ادھر میں پھاٹک نو بجے نینی جیل کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوا۔

(۴۲)

صوبہ متحدہ میں محصول نہ دینے کی تجویز

آٹھ روز کے بعد میں پھر نینی جیل میں پہنچ گیا اور اپنی اسی پرانی بارک میں سید محمود نرمدا پرشاد اور رنجیت پنڈت سے آن ملا۔ چند روز کے بعد جیل ہی میں میرے مقدمے کی تحقیقات ہوئی۔ مجھ پر کئی الزام لگائے گئے تھے اور وہ سب اس تقریر کے مختلف حصوں پر مبنی تھے جو میں نے رہائی کے دوسرے دن الٰہ آباد میں کی تھی۔ جیسا کہ ہم لوگوں کا قاعدہ ہے میں نے جواب دہی نہیں کی بلکہ عدالت میں صرف ایک مختصر سا بیان دے دیا۔ مجھے دفعہ ۱۲۴ الف کے ماتحت بغاوت کے جرم میں ۱۸ مہینے کی قید سخت اور ۵۰۰ روپے جرمانے، قانون نمک سازی ۱۸۸۲ء کے ماتحت چھ مہینے قید اور سو روپے جرمانے اور آرڈیننس نمبر ۶ سنہ ۱۹۳۰ء (مجھے یاد نہیں کہ اس آرڈیننس کا منشا کیا تھا) کے ماتحت بھی چھ مہینے قید اور سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ چونکہ آخری دو سزائیں ساتھ ساتھ چلنے والی تھیں اس لئے مجموعی طور پر مجھے دو سال قید سخت اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں پانچ مہینے کی مزید قید کی سزا ہوئی۔ اب میں پانچویں بار گرفتار ہوا تھا۔

میرے دوبارہ گرفتار ہونے اور سزا پانے کا سول نافرمانی کی رفتار پر تھوڑے دن کے لئے کچھ اثر پڑا۔ اس کا زور اور سرگرمی کسی قدر بڑھ گئی۔ یہ زیادہ تر میرے والد کی وجہ سے ہوا۔ جب کملا نے انہیں میری گرفتاری کی خبر پہنچائی تو انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور میز پر جو ان کے سامنے رکھی تھی زور سے

ہاتھ مار کر کہا کہ اب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بستر علالت پر پڑا رہوں۔ میں مردوں کا کام کروں گا اور بیماری کو نہیں مانوں گا۔ یہ ایک بہادرانہ عزم تھا مگر بدقسمتی سے بڑی سے بڑی قوت ارادی بھی اس روگ کو دور نہیں کر سکتی تھی جس نے ان کے جسم میں گھن لگا دیا تھا۔ پھر بھی کچھ دن کے لئے ان کی حالت میں اس قدر نمایاں تغیر ہو گیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کئی مہینے سے یعنی جب سے وہ برما گئے تھے ان کے تھوک میں خون آنے لگا تھا۔ یہ ارادہ کرتے ہی خون بند ہو گیا۔ اور کئی روز تک نہیں آیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور جیل میں مجھ سے ملنے آئے تو یہ بات بڑے فخر سے بیان کی مگر بدقسمتی سے یہ افاقہ بہت مختصر تھا۔ کیونکہ چند ہی روز کے بعد خون اور زیادہ آنے لگا اور بیماری پھر زور پکڑ گئی۔ اس وقفے میں انھوں نے پرانے جوش عمل کے ساتھ کام کیا اور سارے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک کا زور بڑھا دیا۔ انھوں نے مختلف مقامات کے لوگوں سے مشورہ کر کے مفصل ہدایتیں جاری کیں اور نومبر کے مہینے میں ایک خاص دن مقرر کیا (جو میری سالگرہ کا دن تھا) جس میں سارے ہندوستان میں میری تقریر کے وہ حصے عام جلسوں میں پڑھے گئے جن کی وجہ سے مجھے سزا دی گئی تھی۔ اس روز بہت سے مقامات پر لاٹھی چارج ہوئے۔ جلسے اور جلوس زبردستی منتشر کئے گئے اور ایک دن کے اندر سارے ہندوستان میں پانچ ہزار آدمی گرفتار ہو گئے۔ یہ میری سالگرہ کے منانے کا انوکھا طریقہ تھا۔

اس بیماری کی حالت میں ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا اور اس قدر قوت صرف کرنا والد کے لئے بہت برا تھا اس لئے میں نے ان سے التجا کی کہ آپ کامل آرام کیجئے میں جانتا تھا کہ ہندوستان میں ان کے لئے چین سے بیٹھنا ممکن نہیں کیونکہ وہ ہر وقت تحریک کے نشیب و فراز پر غور کرتے رہیں گے اور لوگ لامحالہ ان سے مشورہ لینے آئیں گے۔ اس لئے میں نے یہ تجویز کی آپ رنگون سنگاپور اور شرقی

جزیروں کا ایک چھوٹا سا بحری سفر کر ڈالیے۔ انھیں یہ بات پسند آئی۔ یہ انتظام کیا گیا کہ ان کے ایک دوست اس سفر میں ان کے ساتھ جائیں۔ اسی غرض سے وہ کلکتے گئے مگر ان کی حالت روز بروز بگڑتی گئی اور ان میں اتنے بڑے سفر کی طاقت نہیں رہی۔ وہ سات ہفتے تک کلکتے کے مضافات میں مقیم رہے۔ اور سارا خاندان وہیں ان کے پاس پہنچ گیا۔ صرف کملا الہ آباد میں رہ گئی اور کانگریس کا کام کرتی رہی۔

غالباً میرے اس قدر جلد دوبارہ گرفتار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے محصول نہ دینے کی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ مگر سچ پوچھئے تو اس تحریک کے حق میں اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ میں کسانوں کی کانفرنس کے بعد ہی جبکہ ان کے نمائندے الہ آباد میں موجود تھے گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے ان کا جوش بہت بڑھ گیا اور انھوں نے قریب قریب ضلعے کے ہر گاؤں میں کانفرنس کے فیصلے کی اطلاع پہنچا دی۔ دو دن کے اندر اندر سارے ضلعے کو خبر ہو گئی کہ محصول نہ دینے کی تحریک شروع ہو گئی ہے اور سب کہیں لوگ خوشی خوشی اس کی تعمیل کرنے لگے۔

اس زمانے میں ہمیں سب سے بڑی مشکل پیام رسانی کی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا لوگوں کو کس طرح اطلاع دی جائے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ان سے کیا چاہتے ہیں۔ اخبار ہماری خبریں سزا اور ضبطی کے ڈر سے شائع نہیں کرتے تھے۔ مطبعے ہمارے اشتہار اور نوٹس چھاپنے پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ خطوں اور تاروں کی نگرانی ہوتی تھی اور اکثر روک دئے جاتے تھے۔ ہمارے لئے پیام رسانی کا قابل اعتماد طریقہ صرف یہی رہ گیا تھا کہ قاصدوں کے ہاتھ خط بھیجیں مگر یہ بھی کبھی کبھی گرفتار ہو جاتے تھے۔ اس طریقے میں بہت خرچ ہوتا تھا اور بڑی تنظیم کی ضرورت تھی پھر بھی اس میں خاصی کامیابی رہی، اور صوبوں کے مرکزوں، ضلعوں کے مرکزوں اور

کانگرس کے صدر مقام کے درمیان خبر رسانی کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ شہروں میں خبر پھیلانا تو کچھ مشکل نہ تھا۔ ہاں خلاف قانون خبر کے پرچے عموماً "سائکلو اسٹائل" سے چھاپ کر ہفتہ وار یا روزانہ شائع کیے جاتے تھے اور ان کی بڑی مانگ تھی۔ عام اعلان کرنے کے لیے شہر میں ڈھنڈورا بھی پیٹا جاتا تھا جس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ ڈھنڈورا پیٹنے والا گرفتار ہو جاتا تھا۔ اس میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ اس لیے کہ لوگ گرفتاری سے ڈرتے نہیں تھے بلکہ خود چاہتے تھے کہ گرفتار کیے جائیں۔ یہ سب طریقے شہروں کے لیے موزوں تھے مگر دیہات میں ان سے کام نہیں چلتا تھا۔ دیہات کے بعض بڑے بڑے مرکزوں سے قاصدوں اور سائکلو اسٹائل کے پرچوں کے ذریعے سے خبر رسانی کا تھوڑا بہت سلسلہ قائم تھا مگر یہ قابل اطمینان نہیں تھا اور ہماری ہدایتوں کو دور دراز گاؤں تک پہنچتے پہنچتے بہت دن لگ جاتے تھے۔

الہ آباد کی کسان کانفرنس کے لیے یہ مشکل آسان ہو گئی۔ اس میں ضلعے کے قریب قریب ہر اہم گاؤں سے نمائندے آئے تھے اور جب یہ واپس گئے تو انھوں نے کانفرنس کے فیصلے اور میری گرفتاری کی خبر سارے ضلعے میں پھیلا دی۔ یہ سولہ سو آدمی سب کے سب محصول نہ دینے کی تحریک کے پرجوش مبلغ بن گئے۔ اس طرح تحریک کی ابتدائی کامیابی کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس علاقے کے کسان شروع میں لگان ادا نہیں کریں گے اور اگر تخویف سے کام نہ لیا گیا تو آخر تک نہیں دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اگر زمینداروں نے یا حکومت نے تشدد اور تخویف شروع کر دی تو ان کی قوت برداشت کہاں تک کام دے گی۔

ہم نے کاشتکاروں اور زمینداروں دونوں سے محصول ادا نہ کرنے کا اپیل کیا تھا۔ اس لیے اصولی طور پر اس میں کسی طبقے کی طرف داری نہیں تھی مگر

عملی صورت یہ ہوئی کہ اکثر زمینداروں نے جن میں بعض قوم پرست بھی شامل تھے مالگذاری ادا کر دی۔ ان پہ زیادہ دباؤ پڑ رہا تھا اور انھیں زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مگر کاشتکار ثابت قدم رہے اور انھوں نے لگان ادا نہیں کیا۔ اس طرح ہماری تحریک اصل میں لگان نہ دینے کی تحریک بن گئی۔ الہ آباد کے ضلعے سے یہ تحریک صوبہ متحدہ کے چند اور ضلعوں میں بھی پھیل گئی۔ اکثر جگہ اس کا باقاعدہ اعلان نہیں ہوا مگر عملی طور پہ کسانوں نے لگان نہیں دیا اور ان میں سے اکثر قیمتیں گر جانے کی وجہ سے واقعی دے بھی نہیں سکتے تھے۔ اتفاق سے کئی مہینے تک حکومت اور بڑے زمینداروں نے عام طور پہ سرکش کسانوں کے خلاف کوئی تخویفی کارروائی بھی نہیں کی۔ انھیں اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ ایک طرف تو سیاسی تحریک اور سول نافرمانی کا زور تھا اور دوسری طرف عالمگیر کساد بازاری کی وجہ سے کسانوں کی حالت بہت ابتر تھی۔ یہ دونوں چیزیں مل گئی تھیں اور حکومت کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں کسانوں میں یہ شورش برپا نہ ہو جائے۔ لندن میں گول میز کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا اور حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اور سبے چینی پھیلے اور اسے اور زیادہ استبداد سے کام لینا پڑے۔

صوبہ متحدہ میں محصول نہ دینے کی تحریک کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری جدوجہد کا مرکز شہروں سے دیہات میں منتقل ہو گیا جس کی وجہ سے تحریک میں نئے سرے سے جان پڑ گئی اور اس کی بنیاد زیادہ وسیع اور پائدار ہو گئی۔ اگرچہ ہمارے شہر والے تھک گئے تھے اور ہمارے اوسط طبقے کے کارکن پست ہو چلے تھے مگر ہمارے صوبے میں تحریک کا زور کم نہیں ہونے پایا تھا بلکہ اور بڑھ گیا تھا۔ دوسرے صوبوں میں یہ تغیر یعنی شہر کے سیاسی مسائل کی جگہ دیہات کے معاشی مسائل پر زور دینا اس حد تک واقع نہیں ہوا تھا اس لئے وہاں جدوجہد کا مرکز بدستور شہروں

میں تھا اور اوسط طبقے کے لوگوں کے تھک جانے کی وجہ سے تحریک کمزور ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ بمبئی بھی جس نے اس سارے عرصے میں سب سے نمایاں حصہ لیا تھا کسی قدر پست ہو چلا تھا وہاں اور دوسرے مقامات پر قانون کی خلاف ورزی جاری تھی اور گرفتاریاں بھی ہو رہی تھیں مگر اب ان چیزوں میں کچھ بناوٹ سی معلوم ہوتی تھی۔ تحریک میں وہ روح نہیں رہی تھی۔ یہ قدرتی بات تھی اس لئے کہ عام لوگوں میں انقلابی جوش زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہ سکتا، عموماً یہ جوش چند دن تک رہتا ہے مگر سول نافرمانی میں یہ غیر معمولی صفت تھی کہ اس نے اسے کئی مہینے تک باقی رکھا اور اس کے بعد بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ مدتوں چلتا رہا۔

حکومت نے اور زیادہ تشدد سے کام لینا شروع کیا، مقامی کانگریس کمیٹیاں جو اب تک حیرت انگیز طریقے سے کام کر رہی تھیں، خلاف قانون قرار دے کر توڑ دی گئیں جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اور بھی برا برتاؤ ہونے لگا۔ حکومت کو زیادہ غصہ اس پر آتا تھا کہ لوگ جیل سے رہا ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد دوبارہ سزا پاکر جیل میں پہنچ جاتے تھے۔ اس بات سے کہ لوگ سزا پانے پر بھی حکومت کا دباؤ نہیں مانتے تھے، اس کا اخلاقی توازن بگڑ گیا۔ نومبر یا شروع دسمبر ۱۹۳۰ء میں صوبہ متحدہ کے کئی جیلوں میں سیاسی قیدیوں کو جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کے بہانے سے کوڑے لگائے گئے۔ یہیں نینی جیل میں یہ خبر ملی اور اس سے سخت صدمہ پہنچا (اب تو ہم ہندوستان میں اس کے اور اس سے بدتر چیزوں کے عادی ہو گئے ہیں) میرے خیال میں کوڑے مارنے کی سزا بدترین عادی مجرموں کے لئے بھی جائز نہیں۔ نوعمر نو دس لڑکوں کو محض ضابطے کی خلاف ورزی کے بدلے یہ سزا دینا سخت وحشیانہ فعل تھا ہم چار دوستوں نے جو ایک ہی بارک میں رہتے تھے حکومت کو اس کے متعلق ایک خط لکھا جب دو ہفتے تک کوئی جواب نہیں آیا

توہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کوڑے کی سزا کے خلاف احتجاج کرنے اور ان مظلوموں سے جنھیں یہ وحشیانہ سزا دی گئی تھی اظہار ہمدردی کرنے کے لئے ہمیں کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ہم نے تین دن یعنی بہتر گھنٹے کا پورا فاقہ شروع کر دیا۔ یہ کوئی بڑا فاقہ نہیں تھا مگر ہم میں سے کوئی بھی فاقے کرنے کا عادی نہیں تھا اور ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہم اسے کہاں تک برداشت کر سکیں گے۔ میں نے اس سے پہلے چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا فاقہ کبھی نہیں کیا تھا۔

ہمیں اس فاقے میں کوئی خاص مشکل نہیں پیش آئی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ اتنی سخت آزمائش نہیں ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔ میں نے بڑی حماقت کی کہ اس عرصے میں سخت ورزشیں (دوڑنا، کسرت کرنا، وغیرہ) جو میں کیا کرتا تھا بدستور جاری رکھیں۔ مجھے اس سے نقصان پہنچا خصوصاً اس وجہ سے کہ میری طبیعت پہلے ہی سے خراب تھی۔ ان تین دن میں ہم میں سے ہر شخص کا وزن سات آٹھ پونڈ گھٹ گیا۔ اس سے پہلے نینی جیل میں چند مہینے کے اندر ہم میں سے ہر ایک کا وزن پندرہ سے لے کر چھبیس پونڈ تک کم ہو گیا تھا۔

ہمارے فاقے کے علاوہ جیل کے باہر بھی لوگوں نے کوڑے کی سزا کے خلاف بہت کچھ احتجاج کیا اور غالباً صوبہ متحدہ کی حکومت نے جیل کے محکمے کو حکم دیا کہ آئندہ یہ سزا نہ دی جائے مگر یہ حکم زیادہ دن قائم نہیں رہا اور کوئی سوا سال کے بعد صوبہ متحدہ اور دوسرے صوبوں کے جیلوں میں قیدیوں کو بار بار کوڑے کی سزائیں دی گئیں۔

اس قسم کے واقعات سے جو کبھی کبھی پیش آتے تھے قطع نظر کرکے ہماری زندگی جیل میں بہت سکون سے گزرتی تھی۔ موسم اچھا تھا اس لئے کہ الٰہ آباد کا جاڑا بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ رنجیت پنڈت ہماری بارک کے لئے ایک نعمت تھے

اس لئے کہ انھیں باغبانی خوب آتی تھی اور تھوڑے دن میں ہمارے اس اُجاڑ احاطے میں رنگ برنگ کے پھول لہلہانے لگے۔ اور انھوں نے یہ کمال کیا کہ اتنی سی جگہ میں ایک چھوٹا سا گولف کورس بھی بنا لیا۔

نینی جیل کی زندگی میں ایک دلچسپی یہ تھی کہ ہمارے سر پر سے طیارے گزرا کرتے تھے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان جتنے بڑے ہوائی راستے ہیں وہ سب الہ آباد سے ہو کر جاتے ہیں اور آسٹریلیا، جاوا، فرانسیسی چینی ہند جانے والے بڑے بڑے طیارے ٹھیک ہمارے سر پر سے گزرتے تھے۔ سب سے زیادہ شاندار ڈچ ہوائی جہاز تھے جو ہٹاویا آتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے ہمیں صبح تڑکے جب خوب اندھیرا ہوتا تھا اور آسمان پر تارے چھٹکے ہوتے تھے طیارے اڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ڈچ جہاز میں خوب روشنی ہوتی تھی اور دونوں سروں پر سرخ لیمپ دہکتے تھے۔ اس جہاز کو صبح کے جھٹپٹے میں گزرتے ہوئے دیکھنا بڑا خوش نما منظر تھا۔

پنڈت مدن موہن مالوی بھی کسی اور جیل سے نینی بھیج دیئے گئے۔ وہ ہماری بارک میں نہیں بلکہ ہم سے الگ رکھے گئے مگر ان سے روز ملاقات ہوتی تھی۔ مجھے یہاں ان سے ملنے کا جتنا موقع ملا شاید جیل سے باہر کبھی نہیں ملا تھا۔ ان میں بڑی زندگی اور زندہ دلی تھی اور نوجوانوں کی طرح ہر چیز کا شوق تھا اس لئے ان کی صحبت میں بہت لطف آتا تھا۔ انھوں نے رنجیت سے جرمن پڑھنا شروع کی اور حیرت انگیز قوت حافظہ کا ثبوت دیا۔ جب کوڑوں کی سزا کی خبر آئی تو وہ نینی ہی میں تھے۔ انھیں بھی سخت صدمہ ہوا اور انھوں نے صوبے کے قائم مقام گورنر کو خط لکھا۔ کچھ دن کے بعد وہ بیمار پڑ گئے۔ وہ سردی برداشت نہیں کر سکتے تھے اور جیل میں سردی سے محفوظ رہنے کا کافی انتظام نہیں تھا۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس لئے

وہ شہر کے اسپتال میں بھیج دیئے گئے اور کچھ دن کے بعد میعاد سے پہلے رہا کر دیئے گئے
خوش قسمتی سے ان کی طبیعت اسپتال ہی میں سنبھل گئی۔

سال نو کے دن یعنی یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو کملا کی گرفتاری کی خبر آئی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اس لئے کہ اس کی بہت سی سہیلیاں جو اس کے ساتھ کام کرتی تھیں جیل میں تھیں اور وہ خود بھی ان کی طرح جیل جانے کے لئے بے چین تھی۔ میری بیوی اور بہن جو کام کر رہی تھیں اگر مرد کرتے تو کب کے گرفتار ہو چکے ہوتے۔ مگر اس زمانے میں حکومت جہاں تک ہو سکتا تھا عورتوں کو گرفتار نہیں کرتی تھی، اس لئے وہ اب تک بچی ہوئی تھیں مگر اب خدا خدا کر کے کملا کے دل کی آرزو پوری ہوئی! میں سوچتا تھا کہ وہ کس قدر خوش ہو گی۔ مگر مجھے یہ تشویش تھی کہ اس کی صحت ہمیشہ سے کمزور ہے جیل میں اسے بڑی تکلیف ہو گی۔

جب وہ گرفتار ہوئی تو کسی اخبار کے نمائندے نے جو وہاں موجود تھا اس سے ایک پیام کی درخواست کی اور اس نے فوراً بے سوچے ہوئے ایک مختصر سا پیام اپنے خاص انداز میں لکھوا دیا: "مجھے فخر ہے کہ میں اپنے شوہر کے نقش قدم پر چل رہی ہوں اور امید ہے کہ لوگ لڑائی جاری رکھیں گے" شاید اگر اسے سوچنے کا موقع ملتا تو وہ یہ الفاظ نہ کہتی اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو عورتوں کے حقوق کا حامی اور مردوں کے استبداد کا مخالف سمجھتی ہے۔ مگر اس وقت تو وہ جذبہ جو ہر ہندو بیوی کے دل میں ہوتا ہے، اس پر غالب آ گیا اور اسے مردوں کے استبداد کا بھی خیال نہیں رہا۔

میرے والد کلکتے میں تھے اور ان کی طبیعت بہت خراب تھی مگر کملا کی گرفتاری اور سزا یابی کی خبر کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ الہ آباد آنے کو تیار ہو گئے میری بہن کرشنا کو انھوں نے فوراً الہ آباد بھیج دیا اور چند روز کے بعد خود بھی بقیہ

خاندان کو لے کر روانہ ہوگئے۔ ۱۲ جنوری کو وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے میں نے انھیں تقریباً دو مہینے کے بعد دیکھا تھا اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا جسے میں مشکل سے چھپا سکا۔ بظاہر انھیں اس کا اندازہ نہیں ہونے پایا اور انھوں نے کہا کہ میری صحت کلکتے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے، ان کے سارے چہرے پر ورم تھا مگر وہ سب سمجھتے تھے کہ یہ کسی عارضی سبب سے ہو گیا۔

ان کے چہرے کی یہ ہیئت میرے دل میں کھٹکتی رہی معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کی صورت نہیں کسی اور کی ہے۔ پہلی بار میرے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ ان کی حالت واقعی خطرناک ہے۔ میں انھیں صحت اور قوت کا مجسمہ سمجھا کرتا تھا، اور ان کی موت کا تصور کرنا میرے لئے دشوار تھا۔ وہ موت کے ذکر پر ہنسا کرتے تھے اور ہمیں تسکین دیتے تھے کہ ابھی میں بہت دن تک زندہ رہوں گا۔ مگر کچھ عرصے سے میں دیکھتا تھا کہ جب ان کا کوئی بچپن کا دوست مرجاتا ہے تو انھیں تنہائی کا احساس رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجنبیوں کے مجمع میں بالکل اکیلے ہیں بلکہ اشارۃً اپنی موت کا ذکر بھی کر دیتے تھے۔ مگر عموماً یہ کیفیت کچھ دیر کے بعد جاتی رہتی تھی اور ان کی زندگی اور زندہ دلی کی قوت پھر ابھر آتی تھی ہمارا سارا خاندان ان کی جامع شخصیت کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ ہم ان کے بغیر دنیا کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر میں بہت پریشان ہو گیا اور میرے دل میں طرح طرح کے وہم آنے لگے۔ پھر بھی میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خطرہ اس قدر قریب ہے۔ میری صحت بھی نہ معلوم کیوں اس زمانے میں بہت خراب رہتی تھی۔

پہلی گول میز کانفرنس ختم ہو رہی تھی اور اس کے فیصلوں کی بڑی دھوم دھام تھی۔ ہمیں اس پر ہنسی آتی تھی اور شاید اس ہنسی میں کسی قدر حقارت بھی شامل

تھی۔ یہ ساری تقریریں اور بحثیں بالکل بیکار اور حقیقت سے خالی معلوم ہوتی تھیں، البتہ ایک حقیقت بالکل ظاہر تھی کہ اس وقت جب ہمارا ملک انتہائی مصیبت کے دور سے گزر رہا تھا اور ہماری عورتیں اور مرد حیرت انگیز بہادری کا ثبوت دے رہے تھے۔ ہمارے بعض وطن پرست ان سب چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ہمارے حریفوں کو اخلاقی مدد پہنچا رہے تھے۔ ہم پر یہ بات اور بھی واضح ہو گئی کہ قوم پرستی کے پردے میں متضاد معاشی اغراض کام کر رہے ہیں اور وہ لوگ جو مستقل حقوق کے مالک ہیں اسی قوم پرستی کے نام سے آئندہ کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت کا انتظام کر رہے ہیں۔ گول میز کانفرنس صریحی طور پر ان ہی لوگوں کی ایک جماعت تھی۔ ان میں سے اکثر نے ہماری تحریک کی مخالفت کی تھی اور بعض دور سے تماشا دیکھا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں جتا دیتے تھے کہ "ان لوگوں کی خدمت بھی کچھ کم نہیں جو موقع کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔" مگر یہ انتظار کا زمانہ لندن کی نگاہ ناز کے ایک اشارے میں ختم ہو گیا۔ اور یہ سب حضرات وہاں دوڑ گئے کہ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت کریں اور جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آجائے اس میں حصہ بٹائیں۔ لندن میں یہ صف بندی کرنے میں اس خیال سے اور بھی عجلت کی گئی کہ کانگریس کی انتہا پسندی بڑھتی جاتی ہے اور اس پر عام لوگوں کا اثر غالب آتا جاتا ہے مستقل حقوق کے مالکوں میں خود بخود یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اگر ہندوستان میں کوئی بنیادی سیاسی تبدیلی ہوئی تو عام لوگوں کا طبقہ حاوی ہو جائے گا یا کم سے کم اس کی اہمیت بڑھ جائے گی اور وہ یقیناً بنیادی سماجی تبدیلیوں پر زور دے گا جس سے ان کے مستقل حقوق خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس خطرے کو دیکھ کر یہ حضرات گھبرائے اور انھوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ کوئی اہم سیاسی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ وہ چاہتے تھے انگریز ہندوستان میں پنچ بنے بیٹھے رہیں۔

تاکہ وہ موجودہ سیاسی نظام کو قائم رکھیں اور ان کے مستقل حقوق کی حفاظت کرتے رہیں نوآبادیات کے درجے پر نہ دینے میں اصل مصلحت یہی تھی۔ ایک بار ایک مشہور اعتدال پسند لیڈر مجھ سے اس بات پر خفا ہو گئے کہ میں نے برطانوی حکومت سے معاملہ کرنے کے لئے یہ لازمی شرط قرار دی کہ برطانوی فوج ہندوستان سے فوراً ہٹالی جائے اور ہندوستانی فوج جمہور ہند کی نگرانی میں دے دی جائے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خود برطانوی حکومت بھی اسے منظور کرلے تب بھی میں اس کی انتہائی مخالفت کروں۔ وہ قومی آزادی کی اس لازمی شرط کے مخالف کچھ اس وجہ سے نہیں تھے کہ موجودہ حالات میں اس کا پورا ہونا ناممکن ہے، بلکہ وہ سرے سے اسے ناپسند کرتے تھے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ انھیں بیرونی حملے کا خوف تھا اور وہ چاہتے تھے کہ برطانوی فوج ہماری حفاظت کے لئے موجود رہے۔ قطع نظر اس بحث کے کہ بیرونی حملے کا امکان ہے یا نہیں، یہ بات بجائے خود ہر غیرتمند ہندوستانی کے لئے باعث شرم ہے کہ اپنی حفاظت کی درخواست دوسروں سے کی جائے۔ مگر میرے خیال میں ہندوستان میں برطانوی قوت قائم رکھنے کی خواہش بیرونی حملے کے خوف پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت اس وجہ سے محسوس کی جاتی ہے کہ وہ مستقل حقوق کے مالکوں کو خود ہندوستانیوں سے، یعنی خالص جمہوریت سے اور عام لوگوں کے غلبے سے بچائے۔

غرض گول میز کانفرنس کے ہندوستانی نمائندے یعنی نہ صرف وہ لوگ جو کھلے ہوئے رجعت پسند اور فرقہ پرست تھے بلکہ وہ بھی جو اپنے آپ کو ترقی پسند اور قوم پرست کہتے تھے، برطانوی حکومت کے ساتھ بہت سی مشترک اغراض رکھتے تھے۔ ہم حیران تھے کہ لفظ قوم پرستی کا مفہوم کس قدر وسیع ہے کہ اس کے دائرے میں ان لوگوں کے علاوہ جو جنگ آزادی میں شریک ہو کر

جیل بھیجے گئے وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو ہمارے قید کرنے والوں سے مصالحہ کر کے
ان کی صف میں شامل ہو گئے اور ان کے ساتھ مل کر ایک متحدہ پالیسی پر غور کرنے
لگے۔ ان کے علاوہ ہمارے ملک میں بہادر اور لسّان قوم پرستوں کا ایک اور گروہ تھا
جو دل وجان سے سودیشی کی حمایت میں مصروف تھے اور ہم سے کہتے تھے کہ
یہی سوراج کی جان ہے اور اپنے ہم وطنوں سے درخواست کرتے تھے کہ وہ اس
کی خاطر قربانی سے دریغ نہ کریں۔ یہ اور بات ہے کہ خوش قسمتی سے انھیں اس
تحریک میں کوئی قربانی نہیں کرنی پڑی بلکہ ان کے کاروبار کو اور انھیں خوب منافع
ہوا۔ دوسرے لوگ جیل جا رہے تھے یا لاٹھیاں کھا رہے تھے اور وہ اپنی دکانوں میں
بیٹھے روپے گن رہے تھے۔ آگے چل کر جب جارحانہ قوم پرستی ذرا خطرناک چیز
ہو گئی تو انھوں نے اپنی تقریروں کی لے دھیمی کر دی "انتہا پسندوں" کو برا بھلا
کہنے لگے اور حکومت سے معاہدے کرنے لگے۔

سچ پوچھئے تو ہمیں اس کی کچھ پروا نہ تھی کہ گول میز کانفرنس کیا فیصلہ کرتی
ہے۔ یہ ہم سے بہت دور ایک بے اصل اور بے جان چیز تھی۔ اصل کشمکش ہمارے
شہروں اور گانوؤں میں ہو رہی تھی۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہماری کوشش جلد
ختم ہونے والی نہیں اور ہمیں بہت سے خطروں کا سامنا ہے۔ پھر بھی سنہ ۱۹۳۰ء کے
واقعات کو دیکھ کر ہمیں یہ بھروسا ہو گیا تھا کہ ہماری قوم میں بڑی قوت اور بڑا دم ہے
اور یہ بھروسا دل میں لیے ہوئے ہم مستقبل کا مقابلہ کر رہے تھے۔

آخر دسمبر یا شروع جنوری میں ایک بات ایسی ہوئی جس سے ہمیں سخت
صدمہ پہنچا۔ سری نواس شاستری صاحب نے اڈنبرا میں (جہاں انھیں غالباً
اعزازی شہریت پیش کی گئی تھی) اپنی تقریر کے دوران میں کسی قدر حقارت کے ساتھ
ان لوگوں کا ذکر کیا جو ہندوستان میں سول نافرمانی کے سلسلے میں قید ہوئے تھے

تھے۔ ان کی یہ تقریر خصوصاً اس موقع پر ہمارے دل میں نشتر کی طرح چبھ گئی اس لئے کہ سیاسی اختلافات کے باوجود ہم ان کی عزت کرتے تھے۔

مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے گول میز کانفرنس کو برخواست کرتے ہوئے حسب معمول ایک برادرانہ تقریر کی اور اس میں اشارۃً کانگریس سے اپیل کیا کہ اپنی بدعنوانیوں کو چھوڑ کر اس مبارک برادری میں شامل ہو جائے۔ اسی زمانے میں یعنی وسط جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں الٰہ آباد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور دوسرے مسائل کے سلسلے میں مسٹر میکڈانلڈ کی اس تقریر اور اس اپیل پر بھی غور کیا گیا۔ میں ان دنوں نینی جیل میں تھا اور رہا ہونے کے بعد مجھے اس جلسے کی کارروائی کا حال معلوم ہوا۔ والد ابھی کلکتے سے واپس آئے تھے اور اگرچہ ان کی طبیعت بہت خراب تھی، لیکن ان کے اصرار سے سب ممبران کے بستر کے گرد جمع ہو کر اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کسی نے یہ رائے دی کہ مسٹر میکڈانلڈ کی دلجوئی کے لئے ہمیں سول نافرمانی کی تحریک دھیمی کر دینی چاہیئے۔ اس سے والد کو غصہ آ گیا۔ وہ جوش میں اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ جب تک ہمارا قومی مقصد حاصل نہ ہو جائے میں ہرگز صلح کے لئے تیار نہیں۔ اگر اور سب میدان سے ہٹ جائیں گے تو میں اکیلا لڑوں گا۔ یہ اشتعال ان کے لئے بہت مضر تھا اور ان کا بخار اور تیز ہو گیا۔ آخر ڈاکٹروں نے کسی نہ کسی طرح لوگوں کو ہٹایا کہ انھیں تنہائی میں کچھ سکون ہو۔

زیادہ تر ان کی وجہ سے ورکنگ کمیٹی نے ایک سخت رزولیوشن پاس کیا مگر اس کے شائع ہونے سے پہلے سر تیج بہادر سپرو اور سری نواس شاستری صاحب کا تار والد کے نام پہنچا جس میں ان کے ذریعہ سے کانگریس سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ ان دونوں حضرات سے گفتگو کرنے سے پہلے کوئی فیصلہ نہ کرے۔ وہ انگلستان سے روانہ ہو چکے تھے اور عنقریب ہندوستان پہنچنے والے تھے۔ انھیں

یہ جواب دیا گیا کہ کانگریس پہلے ہی ایک رزولیوشن[۱] پاس کر چکی ہے مگر یہ اس وقت تک اخباروں میں شائع نہیں کیا جائے گا جب تک آپ آکر ہم سے گفتگو نہ کرلیں۔

ہمیں جیل کے اندر خبر نہ تھی کہ باہر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ البتہ اتنی سن گن مل گئی تھی، کہ کوئی نیا قصہ چھڑا ہوا ہے اور اس سے ہمیں کسی قدر تشویش تھی، مگر سب سے زیادہ فکر ہمیں اس کی تھی کہ ۲۶ جنوری یعنی یوم آزادی قریب ہے دیکھئے یہ کس طرح منایا جاتا ہے۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اس دن سارے ملک میں عام جلسے ہوئے جس میں آزادی کے رزولیوشن کی توثیق کی گئی اور اسی مضمون کی ایک تجویز "یادآوری کے رزولیوشن" کے نام سے پاس کی گئی۔ اس سال یوم آزادی کے منانے کا انتظام کرنا" ایک حیرت انگیز" کارنامہ تھا اس لیئے کہ نہ تو اخباروں اور مطبعوں سے کوئی مدد مل سکتی تھی اور نہ ڈاک اور تار سے کام لیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی سارے ملک میں بے شمار قصبوں اور گانوؤں میں قریب قریب ایک ہی وقت جلسے کئے گئے اور ان میں ایک ہی مضمون کا رزولیوشن پاس ہوا۔ ان میں سے اکثر جلسے قانونی ممانعت کے باوجود منعقد ہوئے اور پولیس نے انھیں زبردستی منتشر کر دیا۔

ہم ۲۶ جنوری کو نینی جیل میں بیٹھے جانے والے سال کے واقعات اور آنے والے سال کی توقعات پر غور کر رہے تھے۔ دوپہر کے قریب مجھے یکایک اطلاع ملی کہ والد کی حالت نازک ہے اور مجھے فوراً گھر جانا چاہیئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میری رہائی کا حکم ہو گیا ہے۔ رنجیت بھی میرے ساتھ روانہ ہوئے۔

اسی روز شام کو سارے ہندوستان کے جیلوں سے اور بہت سے لوگ بھی رہا کئے جا رہے تھے۔ یہ سب ورکنگ کمیٹی کے اصل یا قائم مقام ممبر تھے۔ حکومت

---

(۱) یہ رزولیوشن کتاب کے آخر میں ضمیمہ (ج) میں درج ہے۔

انھیں موقع دے رہی تھی۔ کہ ایک جگہ جمع ہو کر صورت حال پر غور کریں۔ چنانچہ میں بھی شام کو بہر حال رہا ہو جاتا۔ مگر والد کی حالت کے خراب ہو جانے کی وجہ سے چند گھنٹے پہلے چھوڑ دیا گیا تھا۔ کملا بھی ۲۶ دن قید رہنے کے بعد اسی روز لکھنؤ جیل سے رہا کر دی گئی۔ اس لئے کہ وہ بھی ورکنگ کمیٹی کی قائم مقام ممبر تھی۔

(۳۳)

میرے والد کی وفات

میں نے اپنے والد کو دو ہفتے کے بعد دیکھا، اس سے پہلے وہ ۱۲ر جنوری کو مجھ سے ملنے نینی گئے تھے اور اسی وقت میں ان کی صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اب ان کی حالت اور بھی خراب تھی، چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سوج گیا تھا۔ ان سے بات نہیں کی جاتی تھی اور ان کے حواس بھی بعض وقت ٹھیک نہیں رہتے تھے مگر ان کے ارادے کی مضبوطی کا وہی حال تھا اور اسی کی وجہ سے ان کا جسم اور دماغ کام کرتا رہا۔

وہ مجھے اور رنجیت کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ دو ایک روز کے بعد رنجیت (جو ورکنگ کمیٹی کے زمرے میں نہیں آتے تھے) پھر نینی جیل بھیج دیئے گئے اس کا والد کو بہت قلق ہوا وہ بار بار انھیں پوچھتے اور شکایت کرتے کہ لوگ دور دور سے انھیں دیکھنے آتے ہیں مگر ان کا داماد ان سے چھڑا لیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کو ان کی اس بے چینی سے تشویش تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے لئے اچھا نہیں ہے۔ تین چار روز کے بعد غالباً ڈاکٹروں کی تحریک سے صوبہ متحدہ کی حکومت نے رنجیت کو رہا کر دیا۔

۲۶ر جنوری کو جس دن میری رہائی ہوئی گاندھی جی بھی یرواڈا جیل سے رہا کر دیئے گئے میرا بہت جی چاہتا تھا کہ انھیں الہ آباد بلاؤں اور جب میں نے ان کی رہائی کا ذکر والد سے کیا تو انھوں نے بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

دوسرے ہی دن گاندھی جی خیر مقدم کے ایک زبردست جلسے کے بعد جیسا بمبئی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ وہ رات گئے الہ آباد پہنچے مگر والد ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کے آنے سے اور تسلی کے چند کلموں سے جو انھوں نے کہے والد کو بہت سکون ہوا اور میری والدہ کو بہت ہی تسکین ہوئی۔

اس زمانے میں ورکنگ کمیٹی کے اصلی اور قائم مقام ممبر جو قید سے رہا ہوئے تھے بیکار بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ جلسے کی کوئی اطلاع آئے۔ ان میں سے بہت سے والد کی طرف سے فکر مند تھے اور فوراً الہ آباد آنا چاہتے تھے چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ جلسہ فوراً کیا جائے اور ان سب کو الہ آباد بلا لیا جائے۔ دو روز کے بعد ان میں سے تیس چالیس پہنچ گئے اور ان کا جلسہ سوراج بھون میں ہوا۔ جو ہمارے گھر سے ملا ہوا ہے میں کبھی کبھی ان جلسوں میں جایا کرتا تھا مگر اس قدر بدحواس تھا کہ ان میں اچھی طرح حصہ نہیں لے سکتا تھا اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ ان میں کیا فیصلہ کیا گیا۔ غالباً یہی طے ہوا کہ سول نافرمانی جاری رکھی جائے۔

یہ سب پرانے دوست اور رفیق جو وہاں موجود تھے، جن میں سے اکثر سیدھے جیل سے چھوٹ کر آئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کوئی دن میں پھر قید کر دیے جائیں گے والد سے مل کر ان کو خدا حافظ کہنا چاہتے تھے۔ غالب خیال یہی تھا کہ اس کے بعد ان کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ وہ صبح اور شام کے وقت دو دو تین تین کر کے آتے تھے اور والد بڑے اصرار سے آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنے پرانے رفیقوں سے ملتے تھے۔ یوں تو وہ بت بنے بیٹھے رہتے تھے اس لئے کہ ان کے چہرے کی جو حالت تھی اس کی وجہ سے کوئی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی، مگر جب ان کے دوست اور رفیق ایک ایک کر کے آتے تو ان کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا کہ وہ انھیں پہچانتے ہیں۔ ان کا سر کسی قدر جھک جاتا اور ان کے ہاتھ پرنام کرنے کے لئے

جُڑ جاتے۔ انھیں بات کرنی مشکل تھی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے اور ان کی پُرانی ظرافت اب تک باقی تھی۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔ ان کی طاقتِ جواب دے چکی تھی مگر ان کے چہرے سے شاہانہ جلال ٹپکتا تھا۔ میں انھیں دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے ان کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہوں گے۔ خدا معلوم انھیں ہماری جدو جہد میں کوئی دلچسپی باقی ہے یا نہیں؟ ان کے چہرے سے اکثر ایک اندرونی کشمکش کے آثار ظاہر ہوتے تھے جیسے خیالات کا سلسلہ ان کے قابو سے نکلا جاتا ہو اور وہ اسے پکڑنا چاہتے ہوں۔ یہ کش مکش آخر وقت تک جاری رہی اور انھوں نے ہار نہیں مانی۔ کبھی کبھی وہ بالکل ہوش و حواس کی باتیں کرنے لگتے تھے اس وقت بھی جب ان کے گلے سے بالکل آواز نہیں نکلتی تھی وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے کاغذ کے پرچوں پر لکھ دیتے تھے۔

انھیں ورکنگ کمیٹی کے جلسوں سے جو برابر کے مکان میں ہو رہے تھے تقریباً کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ دو ہفتے پہلے انھیں ان چیزوں سے بہت جوش آتا مگر اب انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان سے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے ایک بار گاندھی جی سے کہا "مہاتما جی اب میرا چل چلاؤ ہے۔ میں سوراج دیکھنے کے لئے نہیں رہوں گا۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ نے لڑائی جیت لی اور سوراج آنے ہی والا ہے۔"

اکثر لوگ جو دوسرے شہروں اور صوبوں سے انھیں دیکھنے آئے تھے رخصت ہو گئے۔ صرف گاندھی جی اور چند خاص خاص دوست اور عزیز رہ گئے۔ تینوں مشہور ڈاکٹر یعنی مختار احمد انصاری، بدھان چندرائے اور جیوراج مہتا جو ان کے پرانے دوست تھے اور جن کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی جان ان کے سپرد کر دی ہے، آخر تک ساتھ رہے۔ چوتھی فروری کی صبح کو ان کی

طبیعت بظاہر کچھ سنبھل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں لکھنؤ لیجائیں جہاں ایکسرے کے علاج کے لئے الہ آباد سے زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ اسی دن ہم انھیں موٹر سے لکھنؤ لے گئے اور گاندھی جی مع اور بہت سے لوگوں کے ہمارے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے، ہم بہت آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر پھر بھی وہ بہت مضمحل ہو گئے۔ دوسرے دن بظاہر ان کی تکان دور ہو گئی مگر اور آثار کچھ اچھے نہ تھے۔ اگلے دن یعنی چھ فروری کو صبح تڑکے میں ان کی پٹی کے پاس بیٹھا تھا رات بھر انھیں بڑی تکلیف اور بے چینی رہی تھی۔ دفعتاً مجھے ان کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آئے اور بے چینی کی کیفیت دور ہو گئی۔ میں یہ سمجھ کر خوش ہوا کہ انھیں نیند آ گئی ہے مگر میری والدہ حقیقت کو سمجھ گئیں اور چیخ کر رونے لگیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ خاموش رہیئے۔ ان کو نیند آ گئی ہے۔ مگر یہ نیند ان کی آخری نیند تھی جس سے انھیں کوئی نہیں جگا سکتا تھا۔

ہم اسی دن ان کی لاش موٹر سے الہ آباد لے گئے۔ میں اسی گاڑی میں بیٹھا تھا اور اسے چلا رہا تھا۔ والد کا معتمد خدمتگار ہری بھی ہمارے ساتھ تھا۔ دوسری گاڑی میں والدہ اور گاندھی جی تھے۔ اس کے پیچھے اور گاڑیوں کا سلسلہ تھا میری عقل خبط تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ مسلسل واقعات اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ لکھنؤ میں لوگوں کا زبردست مجمع جو یہ خبر سنتے ہی اکٹھا ہو گیا تھا، لاش کو قومی جھنڈے میں لپیٹ کر موٹر میں جس پر ایک بڑا سا جھنڈا لگا ہوا تھا لکھنؤ سے الہ آباد لے جانا، الہ آباد پہنچنا، تعزیت کرنے والوں کا ہجوم جو میلوں تک چلا گیا تھا، یہ سب باتیں مجھے خواب سی یاد ہیں۔ گھر پر کچھ رسمیں ادا کی گئیں اور اس کے بعد ارتھی بے شمار مجمع کے ساتھ گنگا کی طرف روانہ ہوئی۔ جاڑے کی شام تھی اندھیرا چھا رہا تھا، گنگا کے کنارے بڑے بڑے شعلے اٹھ رہے تھے اور اس

جسم کو جلا کر خاک کر رہے تھے جو ہم خاندان والوں کو اور ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کو دل و جان سے عزیز تھا۔ گاندھی جی نے مجمع کو مخاطب کر کے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور اس کے بعد ہم سب خاموشی سے اپنے اپنے گھر چلے آئے۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ہم تنہائی کا درد اور غم کا بوجھ دل پر لئے ہوئے واپس آ رہے تھے۔

میرے اور والدہ کے نام ہمدردی کے ہزاروں پیام آئے۔ لارڈ ارون اور لیڈی ارون نے بھی مناسب الفاظ میں ہمدردی کا اظہار کیا۔ لوگوں کی اِن بے پایاں دلسوزی اور ہمدردی سے ہمارے دل میں درد کی کھٹک کچھ کم ہوئی مگر سب سے بڑھ کر جس چیز نے میری والدہ کو اور ہم سب کو اس جانکاہ صدمے کے برداشت کرنے میں مدد دی وہ گاندھی جی کی موجودگی تھی۔ جن میں غمزدوں کو تسکین دینے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی عجیب و غریب قوت ہے۔

مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ والد ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے تین مہینے کے بعد میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ لنکا گیا ہوا تھا اور نوارا ایلیا میں چند روز کے لئے سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ والد کو یہاں کی آب و ہوا راس آئے گی، لاؤ ان کو بلا بھیجیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں کچھ دن آرام کر لیں گے۔ میں ان کے نام الہ آباد تار بھیجتے بھیجتے رہ گیا۔

لنکا سے الہ آباد واپس آنے کے بعد ایک دن ڈاک میں ایک عجیب خط آیا۔ لفافہ پر میرا پتہ والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور خدا جانے کن کن ڈاکخانوں کی بے شمار مہریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی حیرت سے اُسے کھولا تو معلوم ہوا کہ واقعی والد کا خط ہے مگر ۲۸ فروری سنہ ۱۹۲۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مجھے سنہ ۱۹۳۱ء

کے وسط میں، یعنی ساڑھے پانچ سال کے بعد ملا۔ والد نے یہ خط ۱۹۳۶ء میں میرے اور کملا کے یورپ روانہ ہونے سے ایک روز پہلے احمد آباد سے لکھا تھا اور اطالوی لائڈ ٹرسٹینو کمپنی کے اس جہاز کے پتے سے، جس سے ہم روانہ ہونے والے تھے بمبئی بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاز کی روانگی کے بعد پہنچا اور پھر خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ کسی من چلے نے میرے پاس بھیج دیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ الوداعی خط تھا۔

(۳۴)

دہلی کا معاہدہ

جس روز میرے والد کا انتقال ہوا اسی دن، بلکہ قریب قریب اسی وقت گول میز کانفرنس کے بہت سے ممبر بمبئی میں جہاز سے اترے۔ سری نواس شاستری صاحب، سر تیج بہادر سپرو اور شاید بعض اور حضرات جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا، سیدھے الہ آباد پہنچے۔ گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبر وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ہمارے گھر پر چند نج کے جلسے ہوئے جن میں گول میز کانفرنس کے حالات بیان کئے گئے۔ سب سے پہلے ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا۔ سری نواس شاستری صاحب نے خود بخود اپنے الفاظ پر، جو انھوں نے اڈنبرا میں کہے تھے افسوس ظاہر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ "میں اپنے ماحول سے بہت متاثر ہو جاتا ہوں اور "جوش خطابت" کے سیلاب میں بہہ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہوں"

گول میز کانفرنس کے نمائندوں نے سوائے ان باتوں کے جو ہمیں پہلے سے معلوم تھیں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ البتہ انھوں نے یہ ضرور بتایا کہ پردے کے پیچھے کیا کیا سازشیں ہو رہی تھیں، فلاں "سر" نے کیا فرمایا تھا۔ اور فلاں لارڈ نے کیا ارشاد کیا تھا۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ ہمارے دوست ہندوستانی اعتدال پسند بڑے بڑے حکام کی ذاتی گفتگو اور گپ شپ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اصولی باتوں اور ہندوستان کے واقعی حالات کی طرف کم توجہ کرتے ہیں اس بے ضابطہ گفت وشنید کا جو اعتدال پسند لیڈروں سے ہو رہی تھی، کوئی نتیجہ نہیں

نکلا اور ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہوا کہ گول میز کانفرنس بالکل بیکار چیز ہے. کسی شخص نے یہ رائے دی کہ گاندھی جی وائسرائے کو خط لکھیں کہ میں آپ سے مل کر صاف صاف باتیں کرنا چاہتا ہوں. وہ اس پر راضی ہو گئے. اگرچہ میرے خیال میں انھیں یہ امّید نہیں تھی کہ اس سے کوئی نتیجہ نکلے گا مگر اصولاً وہ اپنے مخالفوں سے ملنے اور ان سے ہر مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے. انھیں اپنے خیال کے صحیح ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتے تھے میں حریف کو قائل کر لوں گا. مگر ان کا مقصود صرف قائل کرنا ہی نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی ہوتا تھا. وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ مخالفوں کے دل پہ اثر پڑے، غصّے اور بے اعتمادی کی دیواریں جو بیچ میں حائل ہیں، ہٹ جائیں اور انسانیت کے لطیف جذبات ابھر آئیں. وہ جانتے تھے کہ اگر یہ بات حاصل ہو گئی تو لوگوں کو قائل کرنا آسان ہے اور اگر وہ قائل نہ بھی ہوں تو مخالفت کا جوش گھٹ جاتا ہے اور اس میں وہ تلخی نہیں رہتی. اپنے مخالفوں سے شخصی طور پر معاملہ کرنے میں انھیں اکثر فتح حاصل ہوئی تھی یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ محض اپنی شخصیت کے اثر سے وہ دشمن کو دوست بنا لیتے ہیں. بہت سے لوگ جو ان پر نکتہ چینی کرتے تھے اور ہنستے تھے ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے معترف بن گئے یا اگر مخالف بھی رہے تو انکی مخالفت میں تضحیک کا رنگ مطلق نہیں رہا.

گاندھی جی کو اپنی اس قوت کا احساس تھا اس لئے وہ اپنے مخالفوں سے ملنے کے لئے ہمیشہ خوشی سے تیار رہتے تھے مگر افراد سے شخصی معاملات یا چھوٹے چھوٹے مسائل میں نبٹنا اور بات تھی اور برطانوی حکومت جیسی لاشخصی قوت سے جو شہنشاہی کے نشے میں سرشار تھی مقابلہ کرنا بالکل دوسری چیز تھی. اس لئے جب گاندھی جی لارڈ ارون سے ملنے گئے تو انھیں کامیابی کی کچھ زیادہ امید نہیں

تھی۔ سول نافرمانی کی تحریک ابھی تک جاری تھی۔ اگرچہ حکومت سے گفت و شنید کی خبریں مشہور ہونے کی وجہ سے اس کا زور کم ہو گیا تھا۔

ملاقات فوراً منظور کر لی گئی اور گاندھی جی دہلی روانہ ہو گئے۔ انھوں نے چلتے وقت ہم سے کہا کہ اگر وائسرائے سے ایسی گفتگو ہوئی جس سے واقعی کسی عارضی تصفیے کی امید ہوئی تو وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو بھی بلا بھیجیں گے۔ چند روز کے بعد ہم سب دہلی طلب کئے گئے۔ تین ہفتے تک ہم وہاں رہے اور روزانہ طول طویل تھکا دینے والی بحثیں ہوتی رہیں۔ گاندھی جی برابر لارڈ اروِن سے ملتے رہے۔ مگر کبھی کبھی تین چار دن کا وقفہ بھی ہو جاتا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس عرصے میں حکومت ہند انڈیا آفس سے تبادلۂ خیالات کرتی تھی۔ بعض اوقات بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں یا الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے گاڑی رُک جاتی تھی۔ ان میں سے ایک سول نافرمانی کے "التوا" کا لفظ بھی تھا۔ گاندھی جی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سول نافرمانی ہمیشہ کے لئے ترک نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ عام لوگوں کے ہاتھ میں یہی ایک ہتھیار ہے۔ البتہ یہ تحریک ملتوی ہو سکتی ہے۔ لارڈ اروِن کو اس لفظ پر اعتراض تھا اور وہ چاہتے تھے کہ "ترک" کا لفظ استعمال کیا جائے مگر اسے گاندھی جی نہیں مانتے تھے۔ آخر کار "موقوف" کے لفظ پر فیصلہ ہوا۔ بدیسی کپڑے اور شراب کی دکانوں کی پکٹنگ پر بڑی بحث رہی۔ ہمارا وقت زیادہ تر عارضی معاہدے کی شرطوں پر غور کرنے میں صرف ہوتا تھا اور بنیادی مسائل پر بہت کم توجہ کی جاتی تھی غالباً لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان بنیادی معاملات پر آگے چل کر بہتر فضا میں غور کیا جائے گا جو عارضی تصفیہ ہو جانے اور روزمرہ کی لڑائی موقوف ہونے کے بعد پیدا ہو گی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس وقت محض ایک عارضی صلح کی گفتگو ہو رہی ہے اور اس کے بعد اصل اختلافی مسائل پر بحث کرنے کی باری آئے گی۔

ان دنوں دلّی میں طرح طرح کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بہت سے غیر ملکی خصوصاً امریکی اخباروں کے نامہ نگار تھے، جو ہم سے اس بات پر خفا تھے کہ ہم انھیں کچھ بتاتے نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ انھیں گاندھی جی اور لارڈ اروِن کی گفتگو کی خبریں ہم سے زیادہ دہلی کے سکریٹریٹ سے ملتی ہیں اور یہ بالکل صحیح تھا۔ ان کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے لوگ گاندھی جی کے سلام کے لئے آئے تھے کیونکہ آج کل مہاتما کا ستارہ اوج پر تھا۔ بڑے مزے کا تماشا تھا کہ جو لوگ کبھی گاندھی جی اور کانگرس کے پاس بھی نہیں پھٹکے اور اکثر انھیں برا بھلا کہتے رہے وہ اس کی تلافی کرنے کے لئے دوڑے آتے تھے۔ بظاہر کانگرس کی بن آئی تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے مصلحت اسی میں تھی کہ کانگرس کے لیڈروں سے بھی بنائے رکھیں۔ ایک سال کے بعد ان حضرات کا رنگ پھر بدلا اور انھوں نے بڑے زور شور سے کانگرس سے نفرت اور بیزاری کا اظہار شروع کر دیا۔

فرقہ پرستوں میں بھی ان معاملات سے ایک ہل چل مچ گئی اور وہ گھبرائے کہ کہیں نئے دور میں ان کی بات نہ بگڑ جائے چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگ مہاتما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں یقین دلایا کہ ہم فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ اگر آپ اس معاملے میں پیش قدمی کریں تو فوراً فیصلہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر انصاری کے مکان پر جہاں گاندھی جی اور ہم میں سے اکثر ٹھہرے ہوئے تھے، لوگوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا اور فرصت کے اوقات میں ہم انھیں دیکھ کر لطف اور فائدہ اٹھاتے تھے۔ چند سال سے ہمیں صرف شہروں اور گاؤں کے غریبوں سے اور جیل کے قیدیوں سے سابقہ رہا تھا۔ ان ارباب دولت میں جو گاندھی جی سے ملنے آتے تھے، ہمیں انسانی فطرت کا ایک اور پہلو نظر آیا۔ یہ حضرات ہوا

کے رُخ پہ چلتے تھے اور جہاں قوت اور اقتدار کی بو پاتے تھے مسکراتے ہوئے جا پہنچتے تھے۔ ان میں سے اکثر ہندوستان کی برطانوی حکومت کے محکم ستون تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ اگر ہندوستان میں کوئی اور حکومت ہو گی تو یہ اسی طرح اس کے محکم ستون بھی بن جائیں گے۔

گاندھی جی صبح تڑکے چہل قدمی کے لئے نئی دہلی جاتے تھے اور میں اکثر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ ان سے گفتگو کرنے کا یہی ایک وقت تھا اس لئے کہ دن کے بقیہ حصّے میں ان کے اوقات چھوٹے چھوٹے حصوں میں سب بٹ جاتے تھے اور ہر لمحے کسی کام کے لئے یا کسی شخص کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ صبح کی چہل قدمی میں بھی کبھی کبھی ملاقات کرنے والے خصوصاً غیر ملکی لوگ شریک ہو جاتے تھے یا کوئی دوست ذاتی معاملات میں مشورہ کرنے کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ ہم دونوں ماضی، حال اور خصوصاً مستقبل کے بہت سے امور کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے مجھے یاد ہے کہ ایک بار کانگرس کے مستقبل کے بارے میں ان کے ایک خیال کو سن کر میں حیرت میں رہ گیا۔ میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ جب آزادی مل جائے گی تو کانگرس خود بخود ختم ہو جائے گی مگر ان کی رائے تھی کہ نہیں کانگرس کو باقی رہنا چاہیئے مگر اس شرط پر کہ وہ ایثار سے کام لے کر خود ہی یہ ضابطہ بنا دے کہ اس کا کوئی ممبر تنخواہ دار سرکاری ملازمت قبول نہ کرے گا اور اگر کوئی شخص عہدہ حاصل کرنا چاہے تو اسے کانگرس کی ممبری سے استعفا دینا ہو گا۔ مجھے اب یاد نہیں رہا کہ انھوں نے اس کے لئے کیا دلیلیں پیش کی تھیں مگر اصل مفہوم یہ تھا کہ اپنی بے تعلقی اور بے غرضی کی وجہ سے کانگرس وزارتوں اور حکومت کے دوسرے محکموں پہ زبردست اخلاقی اثر ڈال سکے گی اور انھیں راہ راست سے ہٹنے نہیں دے گی۔

یہ ایک عجیب و غریب خیال ہے اور میرے لئے اس کا سمجھنا بہت دشوار ہے مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ بہ فرضِ محال اگر اس قسم کی کوئی جماعت ہو بھی تو ارباب غرض اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ مگر عملی پہلو سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو اس سے گاندھی جی کے طرزِ خیال کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو چیز انھیں مدنظر ہے اس کا تصور جدید سیاسی پارٹی کے بالکل برعکس ہے جو اس غرض سے قائم کی جاتی ہے کہ حکومت پر قبضہ کرکے ملک کے سیاسی اور معاشی نظام کی تشکیل اپنے اصولوں کے مطابق کرے اور اس قسم کی پارٹی سے بھی مختلف جو آج کل اکثر دیکھنے میں آتی ہے اور (بہ قول مسٹر ر۔ ہ ٹانی کے) زیادہ سے زیادہ گدھوں کو زیادہ سے زیادہ خشک کھلانے کے سوا کوئی کام نہیں کرتی۔

گاندھی جی کے ذہن میں جمہوریت کا ایک مافوق الطبیعی تصور ہے۔ اسے اکثریت، یا نمائندگی کے رسمی طریقے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی بنا خدمت اور ایثار پر ہے اور اس میں صرف اخلاقی اثر سے کام لیا جاتا ہے۔ اپنے ایک بیان میں جو حال(۱) ہی میں شائع ہوا ہے، انھوں نے جمہوریت پسند کی نئی تعریف کی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پیدائشی جمہوریت پسند ہیں اور اس سلسلے میں فرماتے ہیں "غریب سے غریب آدمیوں کی دل و جان سے حمایت کرنا، ان کی سی زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھنا اور حتی الامکان ان کے معیار تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔ اگر جمہوریت پسندی کا دعویٰ کرنے کے لئے کافی ہے تو میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں پیدائشی جمہوریت پسند ہوں۔" آگے چل کر وہ جمہوریت کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کانگریس کی جمہوریت اور اس کے اثر کی بنا ان نمائندوں

---

(۱) ۱۷ ستمبر ۱۹۳۴ء

کی تعداد پر نہیں جو اس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوتے ہیں بلکہ اس روزافزوں خدمت پہ ہی جو وہ اب تک انجام دیتی رہی ہے۔ مغربی جمہوریت معرض امتحان میں ہے اور اس کی ناکامیابی ثابت ہو چکی ہے۔ خدا کرے ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہو کہ وہ جمہوریت کے ایک صحیح علم کی بنا ڈالے اور اس کی کامیابی آنکھوں سے دکھا دے،،

"بددیانتی اور ریاکاری جمہوریت کا لازمی نتیجہ نہیں ہونا چاہیئے اگرچہ آج کل یقیناً ایسا ہی ہے۔ کثرت تعداد کو جمہوریت کا نفسی معیار قرار دینا غلطی ہے۔ یہ بات جمہوریت کے منافی نہیں کہ چند آدمی اپنی قوم کی روح اس کی امیدوں اور حوصلوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ جمہوریت تشدد کے طریقوں سے نشوونما نہیں پا سکتی جمہوریت کی روح کسی قوم میں باہر سے زبردستی نہیں پھونکی جا سکتی بلکہ اندر سے خود بخود ابھرتی ہے۔"

جیسا کہ گاندھی جی خود تسلیم کرتے ہیں، ان کی جمہوریت مغربی جمہوریت نہیں ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہ کسی حد تک اشتمالیوں کے تصور جمہوریت سے مشابہت رکھتی ہے کیونکہ اس میں بھی مافوق الطبیعی رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اشتمالیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بعض اوقات یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ جمہور کی خواہشات اور ضروریات کی نمائندہ ہے خواہ جمہور کو خود ان چیزوں کا احساس بھی نہ ہو۔ ان کے ذہن میں جمہور کا ایک مافوق الطبیعی تصور ہے اور وہ اسی کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر یہ مشابہت بہت خفیف ہے۔ دونوں کے اصول اور عمل میں خصوصاً طریق کار اور تشدد کے معاملے میں بڑا زبردست اختلاف ہے۔

خواہ گاندھی جی جمہوریت پسند ہوں یا نہ ہوں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے نمائندے ہیں اور محض نمائندے ہی نہیں بلکہ ان کی روح اجتماعی کے اوتار بن گئے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا ذہنی

معیار کسانوں کے برابر ہے۔ وہ اعلیٰ دماغ، لطیف جذبات، نفیس مذاق اور وسیع تخیل رکھتے ہیں۔ ان میں تمام انسانی صفات موجود ہیں، مگر اصل میں وہ ایک سادھو ہیں جس نے ضبطِ نفس کی بدولت اپنی خواہشات اور جذبات کو روحانیت کی بلند سطح پر پہنچا دیا ہے۔ ان کی زبردست شخصیت مقناطیس کی سی کشش رکھتی ہے اور لوگوں کے دل میں محبت اور عقیدت کے شدید جذبات پیدا کرتی ہے۔ بھلا ایک کسان میں یہ باتیں کہاں سے آسکتی ہیں؟ مگر اس کے باوجود وہ مہا کسان ہیں، دنیا کو ایک کسان کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور کسانوں کی طرح زندگی کے بعض پہلوؤں کو دیکھنے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہندوستان کسانوں ہی کا ملک ہے۔ اور گاندھی جی اپنے ملک کے رگ و ریشے سے واقف ہیں۔ ان کا ہاتھ ہندوستان کی نبض پر رہتا ہے اور وہ اس کی خفیف سی حرکت کو پہچانتے ہیں۔ وہ قریب قریب وجدانی طور پر صورتِ حال کا بالکل صحیح اندازہ کر لیتے ہیں۔ انھیں ٹھیک وقت کام کرنے کا ڈھب خوب آتا ہے۔

ان کی ذات نہ صرف برطانوی حکومت کے لئے بلکہ خود ان کے ہم وطنوں اور ہمدموں کے لئے ایک معمّا ہے۔ غالباً موجودہ زمانے میں کسی اور ملک میں ان کا وجود بے محل ہوتا۔ مگر ہندوستان اب تک پاپ اور مکتی اور اہنسا کا نام لینے والے دھرماتماؤں کی بات سمجھتا ہے اور سمجھتا نہیں تو اتنا ضرور ہے۔ اس ملک کی دیو مالا ان سادھوؤں کی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے اپنے تیاگ اور تپسیا کے زور سے "نیکی کا پہاڑ" بنا کر کھڑا کر دیا ہے جس نے بعض چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی حکومت کی جڑیں ہلا دیں اور دنیا میں کایا پلٹ کر دی جب میں گاندھی جی کی حیرت انگیز قوتِ عمل اور قوتِ نفس دیکھتا ہوں جو روحانیت کے کسی لازوال سرچشمے سے ابلتی چلی آتی ہے تو مجھے اکثر ان کہانیوں کا دھیان آجاتا ہے۔

وہ دنیا کی معمولی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ کسی اور ہی نایاب دھات کے بنے ہوئے ہیں اور کبھی ان کی آنکھوں میں ایک نامعلوم حقیقت کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

سارے ہندوستان پر، یہاں تک کہ اس کی شہری زندگی بلکہ اس کی نئی تمدنی زندگی پر بھی کسانوں کا رنگ غالب ہے۔ اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ اس نے اپنے اس سپوت بیٹے کو جو اس سے اس قدر مشابہ ہے اور پھر بالکل الگ بھی ہے اپنا محترم اور محبوب لیڈر بنالیا۔ اس شخص نے ہندوستان کو پرانے بھولے ہوئے نغمے یاد دلائے۔ اور اس کی آنکھوں کو خود اس کی روح کی جھلک دکھادی۔ ہمارا ملک حال کی مصیبتوں کے بوجھ سے دبا ہوا بے کسی کے عالم میں ماضی کی بے جان کہانیوں اور مستقبل کے دھندلے خوابوں سے دل بہلایا کرتا تھا، مگر اس نے آکر اس کے نراس دل کو آس اور اس کے خستہ جسم کو طاقت بخشی اور اس کی نظروں میں مستقبل کا ایک دلکش نقشہ پھرنے لگا۔ دو چہروں والے دیوتا جینس کی طرح وہ ادھر ماضی اور ادھر مستقبل کا منظر دیکھ رہا ہے اور دونوں کو ملا کر ایک ہم آہنگ مرقع بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہم میں سے اکثر کسانوں کے طرز خیال اور قدیم مذہب و معاشرت سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے ہیں ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم جدید زمانے کے لوگ ہیں اور ہمارے ذہن میں "ترقی" مشینوں کی صنعت، بہتر معیار زندگی اور اجتماعی تنظیم کے خیالات بسے ہوئے ہیں ہم کسانوں کے نقطۂ نظر کو رجعت پسندانہ سمجھتے ہیں اور اشتراکیت اور اشتمالیت کی طرف مائل ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم سیاست میں گاندھی جی کے ساتھ شریک ہو گئے اور ہم میں سے بہت سے دل و جان سے ان کے پیرو بن گئے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے اور جو شخص گاندھی جی کو نہیں جانتا اسے

کسی جواب سے تسکین نہیں ہوگی۔ شخصیت ایک سربستہ راز اور ایک عجیب و غریب قوت ہے جو انسانوں کے دلوں کو تسخیر کر سکتی ہے۔ ان میں یہ قوت بدرجہ کمال موجود ہے اور جو لوگ ان سے ملتے ہیں وہ انھیں اور ہی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ پہلے تو ان کی ذاتی کشش اپنا کام کرتی ہے مگر آخر میں لوگ عقلی حیثیت سے قائل ہو کر ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کے فلسفۂ زندگی بلکہ ان کے بعض مقاصد سے بھی متفق نہیں تھے اور اکثر ان کے خیالات کو سمجھنے سے قاصر رہتے تھے مگر جو عملی تجویز انھوں نے پیش کی وہ ایک محسوس چیز تھی اور عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی تھی ہماری مریل سیاست نے بے عملی کی جو روایات ایک عرصے سے قائم کر رکھی تھیں ان کے مقابلے میں ہر عمل غنیمت معلوم ہوتا۔ گاندھی جی کے مردانہ اور مؤثر عمل نے جس کے ساتھ اخلاقیت اور روحانیت کی چمک دمک بھی تھی ہماری عقل اور جذبات دونوں کو مسخر کر لیا۔ انھوں نے ہمیں رفتہ رفتہ اپنی عملی تجویز کے صحیح ہونے کا قائل کر دیا۔ اور ہم ان کے فلسفے سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے ساتھ ہو گئے۔ شاید عمل اور اصول میں یہ تفریق جائز نہ تھی۔ اور اسی وجہ سے بعد میں ذہنی اختلافات اور جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں ایک مبہم سی امید تھی کہ گاندھی جی عملی آدمی ہیں اور حالات کے تغیر سے بہت متاثر ہوتے ہیں اس لئے وہ اسی طریقے سے کام کریں گے۔ جو ہمیں صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کم سے کم اب تک وہ صحیح رستے پر چل رہے تھے ہم نے یہ سوچا کہ اگر آگے چل کر ہماری ان کی رائیں الگ ہوگئیں تو دیکھا جائے گا۔ ابھی سے الگ ہو جانا حماقت ہے۔

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم لوگ معین اور واضح خیالات نہیں رکھتے تھے بلکہ کچھ مذبذب سے تھے۔ ہمیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ چاہے اصولی حیثیت سے ہماری رائے زیادہ صحیح ہو مگر گاندھی جی ہندوستان کو

ہم سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ وہ شخص جس سے عام لوگوں کو اس درجہ عقیدت ہو یقیناً ان کی ضرورتوں اور آرزوؤں کا رازداں ہوگا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر ہم ان کو اپنا ہم خیال بنالیں تو عام لوگ خود بخود ہمارے ہم خیال بن جائیں گے اور گاندھی جی کو ہم خیال بنانا ممکن نظر آتا تھا اس لئے کہ کسانوں کا سا تصورِ حیات رکھنے کے باوجود وہ خلقی طور پر باغی اور انقلاب پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کی زندگی میں زبردست تغیرات پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے اور انجام کے دھڑکے سے ڈرنے والے نہ تھے۔

انھیں کی ذات تھی جس نے ہماری شکست اور پست قوم کو منظم کرکے میدانِ عمل میں کھڑا کر دیا تھا اور پھر کس طرح؟ قوت کے دباؤ سے نہیں، مادی فائدے کی لالچ سے نہیں بلکہ ایک ہلکی سی نظر سے، چند نرم لفظوں سے اور سب سے بڑھ کر اپنی ذاتی مثال سے۔ مجھے یاد ہے کہ ستیاگرہ کے ابتدائی زمانے میں یعنی ۱۹۱۹ء میں بمبئی کے عمر سوبانی انھیں "غلاموں کا محبوب ایک دن" کہا کرتے تھے۔ عمر کی زندگی نے وفا نہیں کی کہ وہ ہندوستان کی بدلی ہوئی حالت کو دیکھتے۔ ہم لوگ زیادہ خوش قسمت تھے جو ۱۹۳۱ء کے آغاز میں فخر و مسرت سے دیکھ رہے تھے کہ بارہ سال میں ملک کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ۱۹۳۰ء ہمارے لئے ایک عجیب و غریب سال تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی نے کچھ ایسا جادو کر دیا ہے کہ ملک کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ہم اتنے بے وقوف نہ تھے جو یہ سمجھتے کہ ہم برطانوی حکومت کے مقابلے میں قطعی طور پر کامیاب ہوگئے۔ ہماری خوشی و مسرت ہم غالب آنے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ہمیں اپنی قوم پر، اپنی عورتوں، اور جوانوں اور بچوں پر فخر تھا جنھوں نے اس تحریک میں کمال کر دکھایا۔ ان کی قوتِ عمل ایک روحانی دولت تھی جو ہر زمانے میں ہر قوم کے لئے قابلِ قدر ہوتی

اور ہماری جیسی محکوم اور مظلوم قوم کے لئے تو اور بھی زیادہ قدر و قیمت رکھتی تھی ہمیں یہ فکر تھی کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے یہ دولت ہمارے ہاتھ سے چلی جائے۔

مجھ پر گاندھی جی ہمیشہ سے مہربان تھے اور میرا بہت خیال کرتے تھے خصوصاً والد کی وفات کے بعد سے مجھے ان سے اور بھی زیادہ تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا وہ ہمیشہ میری بات بہت غور سے سنتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا مانتے بھی تھے اس سے مجھے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ میں اور میرے رفیق انھیں اشتراکیت کی طرف مائل کر سکتے ہیں اور انھوں نے خود یہ کہہ دیا تھا کہ جوں جوں ان کا اطمینان ہوتا جائے گا وہ آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتے جائیں گے۔ مجھے قریب قریب یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اشتراکیت کے بنیادی اصول کو قبول کر لیں گے اس لئے کہ مجھے موجودہ نظام کے تشدد، ناانصافی، اسراف اور مصیبت سے نجات پانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی ممکن ہے کہ انھیں ہمارے طریق کار سے اختلاف ہو لیکن ہمارے مقاصد سے اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرا یہ خیال تھا مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ گاندھی جی کے نصب العین اور اشتراکیوں کے مقاصد میں بنیادی اختلافات ہیں۔

اب میں پھر فروری ۱۹۳۱ء کے واقعات کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ گاندھی جی اور لارڈ ارون میں وقتاً فوقتاً گفتگو ہوتی رہی مگر ایک دن یہ سلسلہ ایک دم سے موقوف ہو گیا۔ کئی روز سے وائسرائے نے گاندھی جی کو نہیں بلایا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ صلح کی بات چیت ختم ہو گئی۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر دہلی سے اپنے اپنے صوبوں کو جانے کی تیاری کرنے لگے۔ روانگی سے پہلے ہم نے اپنے آئندہ منصوبوں اور سول نافرمانی کے متعلق (جو اصولاً اب تک جاری تھی) آپس میں

مشورہ کیا۔ ہمیں یقین تھا کہ صلح کی گفتگو ختم ہونے کا اعلان ہوتے ہی ہمیں آپس میں ملنے اور مشورہ کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ ہم سب گرفتار ہو جائیں گے اور ہم سے لوگوں نے یہ کہا تھا کہ غالباً حکومت کانگریس کے خلاف پہلے سے زیادہ سخت کارروائی شروع کر دے گی اس لئے ہم نے کمیٹی کا ایک جلسہ کیا جو ہمارے نزدیک آخری جلسہ تھا اور اپنی تحریک کو چلانے کے متعلق مختلف رزولیوشن پاس کئے ان میں سے ایک رزولیوشن کسی قدر اہم تھا۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ ہر قائم مقام صدر گرفتار ہونے پہ اپنا جانشین نامزد کرتا تھا اور ورکنگ کمیٹی میں جو جگہیں خالی ہوتی تھیں وہ بھی اسی طرح پُر کی جاتی تھیں۔ یہ قائم مقام ورکنگ کمیٹیاں بہت کم کام کر سکتی تھیں اور ان کے اختیارات بھی بہت محدود تھے وہ بس جیل ہی جانے کے کام کی تھیں۔ اور پھر یہ خوف بھی تھا کہ اگر قائم مقاموں کے نامزد کرنے کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا تو کہیں کانگریس بدنام نہ ہو جائے۔ اس میں طرح طرح کے خطرے تھے اس لئے دہلی میں ورکنگ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ آئندہ قائم مقام صدر اور قائم مقام ممبر نامزد نہ کئے جائیں جب تک اصلی ورکنگ کمیٹی کے چند ممبر (یا ایک ممبر بھی) جیل سے باہر ہوں اس وقت تک وہ پوری کمیٹی کی حیثیت سے کام کرتے رہیں جب وہ سب گرفتار ہو جائیں تو کمیٹی باقی نہیں رہے گی مگر (ہم نے بڑے طمطراق سے کہا) کمیٹی کے اختیارات، ملک کے ہر مرد اور ہر عورت کو حاصل ہوں گے اور وہ لڑائی کو آخر وقت تک جاری رکھیں گے۔

اس رزولیوشن میں بڑی بہادری سے لڑائی کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا اور مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس میں اس بات کا بھی اعتراف تھا کہ کانگریس کے صدر دفتر کے لئے یہ روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے کہ وہ ملک کے سب حصّوں کی خبر رکھے اور باقاعدہ ہدایتیں جاری کر سکے۔ یہ مشکل [illegible]

پیش آتی تھی کہ ہمارے اکثر کارکن مشہور لوگ تھے اور وہ کھلم کھلا کام کرتے تھے۔ انھیں حکومت جب چاہتی گرفتار کر لیتی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں خفیہ قاصدوں کے ذریعے ہدایات بھیجنے، رپورٹیں منگوانے اور معائنہ کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ہوا اور اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہم خفیہ پیام رسانی کا کام بہت اچھی طرح چلا سکتے ہیں مگر یہ بات ایک حد تک ہماری کھلی ہوئی تحریک کے لئے ناموزوں تھی اور گاندھی جی اس کو ناپسند کرتے تھے۔ جب مرکز سے ہدایتیں بھیجنا ناممکن تھا تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ ہم تحریک چلانے کی ذمہ داری مقامی لوگوں کے سپرد کر دیں، ورنہ وہ ہدایتوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے اور کچھ نہ کرتے ظاہر ہے کہ جب کبھی ممکن ہوتا تھا ہدایتیں بھی بھیجدی جاتی تھیں۔

غرض ہم نے یہ اور دوسرے رزولیوشن پاس کئے (جن میں سے کوئی ان واقعات کی وجہ سے جو بعد میں پیش آئے شائع یا نافذ نہیں ہوا) اور سفر کی تیاری کرنے لگے۔ عین اس وقت لارڈ اردن کے ہاں سے پھر طلبی ہوئی۔ اور گفت و شنید کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

۴ مارچ کو رات کے بارہ بجے تک ہم وائسرائے کے ہاں سے گاندھی جی کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ وہ دو بجے شب کو واپس آئے اور ہم لوگوں کو جگا کر کہا گیا کہ معاہدہ ہو گیا۔ ہم نے معاہدے کا مسودہ دیکھا۔ میں اس کی اکثر دفعات سے واقف تھا اس لئے کہ ان پر بار بار بحث ہو چکی تھی مگر شروع ہی دفعہ نمبر ۲[1] کو پڑھ کر

---

(۱) دفعہ ۲ معاہدہ دہلی (مورخہ ۵ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء) جہاں تک دستور اساسی کے مسائل کا تعلق ہے آئندہ بحث کا دائرہ حکومت برطانیہ کی منظوری کی شرط پر معین کیا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کی دستوری حکومت کی تجویز پر جو گول میز کانفرنس میں پیش ہو چکی ہے (باقی)

جس میں تحفظات وغیرہ کا ذکر تھا۔ مجھے سخت دھچکا لگا۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس وقت میں نے کچھ نہیں کہا اور ہم سب جا کر اپنے بستر پر لیٹ رہے۔

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ ہمارا لیڈر قول دے چکا تھا۔ اگر ہمیں اس کی رائے سے اختلاف بھی تھا تو ہم کیا کرتے؟ اس کا ساتھ چھوڑ دیتے؟ اس سے قطع تعلق کر لیتے؟ اختلاف رائے کا اعلان کر دیتے؟ اس سے شاید ذاتی طور پر کسی شخص کو تسکین ہو جاتی مگر آخری فیصلے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ سول نافرمانی کی تحریک کم سے کم اس وقت ختم ہو چکی تھی اور اسے پھر سے اٹھانا خود ورکنگ کمیٹی کے بس کی بات نہ تھی اس لئے کہ حکومت یہ اعلان کر سکتی تھی کہ مسٹر گاندھی تصفیے پر راضی ہو گئے ہیں۔ مجھے اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو اس میں مطلق عذر نہ تھا کہ سول نافرمانی ملتوی کر دی جائے اور حکومت سے کوئی عارضی تصفیہ کر لیا جائے۔ ہمارے لئے یہ بات سہل نہ تھی کہ اپنے رفیقوں کو دوبارہ جیل بھیجدیں یا ان ہزاروں آدمیوں کی رہائی میں مانع ہوں جو اب تک قید میں تھے۔ جیل کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہم آرام سے رات دن گزار سکیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم میں سے بعض اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لیں اور یہ دعویٰ کریں کہ ہم اس جانورانہ زندگی کو کھیل سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تین ہفتے سے گاندھی جی اور لارڈ ارون میں گفتگو ہو رہی تھی اس کی وجہ سے ملک کے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۲۳) مزید غور کیا جا سکے۔ جس تجویز کا خاکہ وہاں تیار ہوا ہے اس کے اہم اجزا حسب ذیل ہیں:- وفاقی نظام۔ ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کا قیام ان تحفظات کے ساتھ جو ہندوستان کے مفاد کے لئے ضروری ہوں مثلاً فوج، امور خارجہ، اقلیتوں کے حقوق ہندوستان کی مالی ساکھ اور قرضوں کی ادائگی۔

یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ تصفیہ ہونے والا ہے۔ اگر ہم صلح سے قطعاً انکار کر دیتے تو لوگوں کو سخت مایوسی ہوتی۔ غرض ہم سب ورکنگ کمیٹی کے ممبر یقیناً یہ چاہتے تھے کہ عارضی تصفیہ ہو جائے (کیونکہ ظاہر تھا کہ قطعی فیصلے کی صورت ہی نہیں) بشرطیکہ ہمیں اپنے کسی اہم مطالبے سے دست بردار نہ ہونا پڑے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اکثر مسائل سے جن پر بڑے زور شور سے بحث ہوتی تھی، کچھ مطلب نہ تھا۔ مجھے تو سب سے زیادہ دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک یہ کہ ہم اپنے کامل آزادی کے مطالبے سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹیں۔ دوسرے یہ کہ اس تصفیے کا صوبہ متحدہ کے کسانوں کی حالت پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ ہماری محصول نہ دینے یا لگان نہ دینے کی تحریک اب تک بہت کامیاب رہی تھی اور بعض علاقوں میں ایک پیسہ بھی وصول نہیں ہوا تھا۔ کسان میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ دنیا کی زراعتی حالت اور بگڑ گئی تھی، قیمتیں اور گر گئی تھیں اس لئے انہیں لگان ادا کرنا پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ ہماری محصول نہ دینے کی تحریک معاشی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ میں یہ کہتا تھا کہ اگر حکومت سے عارضی تصفیہ ہو گیا تو سول نافرمانی بند ہو جائے گی اور محصول نہ دینے کی تحریک کی سیاسی بنا ختم ہو جائے گی، مگر اسکے معاشی پہلو میں کیا فرق پڑے گا؟ قیمتوں کے اس قدر گر جانے کی وجہ سے کسانوں کو مطالبہ ادا کرنے میں جو معذوری ہے وہ تو بدستور باقی رہے گی۔ گاندھی جی نے یہ بات لارڈ اروِن کو بہت وضاحت کے ساتھ سمجھا دی تھی۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ محصول نہ دینے کی تحریک بند کر دی جائے گی مگر ہم کسانوں کو یہ مشورہ ہرگز نہیں دیں گے کہ اپنے مقدور سے زیادہ مطالبہ ادا کریں۔ اس معاملے میں حکومت ہند سے تفصیلی بحث نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے کہ یہ صوبے کا معاملہ تھا۔ ہمیں یہ اطمینان دلایا گیا کہ صوبے کی حکومت بڑی خوشی سے ہم سے اس کے متعلق گفتگو کرے گی

اور کسانوں کی مشکل کو حل کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔ یہ ایک مبہم سا وعدہ تھا مگر ان حالات میں کوئی قطعی فیصلہ ہونا مشکل تھا۔ غرض اس وقت تو یہ مسئلہ اس طرح سے طے کر دیا گیا۔

اب دوسری چیز باقی رہی یعنی ہمارا کامل آزادی کا مقصد۔ معاہدے کی دفعہ ۲ کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس کی بھی خیر نہیں۔ کیا اسی دن کے لئے ہماری قوم اس بہادری سے سال بھر لڑتی رہی؟ کیا ہمارے سارے کارناموں اور لمبے چوڑے دعوؤں کا یہی انجام ہونا تھا؟ کانگریس کا کامل آزادی کا رزولیوشن کہاں گیا؟ ۲۶ جنوری کا عہد کیا ہوا؟ میں مارچ کی اس رات کو اپنے بستر پر پڑا یہ باتیں سوچ رہا تھا اور میرے دل پر اداسی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو اور اس کے ملنے سے قریب قریب مایوسی ہو۔

"دنیا کا انجام یہی ہوتا ہے
نہ دھماکا نہ دھڑاکا بلکہ ٹائیں ٹائیں فش"

(۳۵)

کراچی کانگرس

گاندھی جی کو کسی اور سے میری پریشانی کا حال معلوم ہوا اور دوسرے دن صبح کو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ ٹہلنے چلو۔ ہم دونوں میں بڑی طول طویل گفتگو ہوتی رہی اور انھوں نے مجھے یہ یقین دلانا چاہا کہ ہم نے اپنا کوئی اہم مطالبہ ترک نہیں کیا، کسی اصول سے قدم نہیں ہٹایا۔ انھوں نے معاہدے کی دفعہ ۲ کی ایک خاص تشریح کی اور اسے اس فقرے کی بنا پر "جو ہندوستان کے مفاد کے لئے ضروری ہوں" ہمارے کامل آزادی کے مطالبے سے مطابقت دینا چاہی۔ مجھے یہ زبردستی کی تاویل معلوم ہوئی اور میں نے اسے تسلیم نہیں کیا مگر ان کی باتوں سے میرا غصہ کسی قدر دھیما ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ معاہدے کی اچھائی برائی ایک طرف، میں تو آپ کی اس عادت سے ڈرتا ہوں کہ آپ اچانک کوئی نئی بات کر کے ہمیں چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ آپ کی سیرت میں کوئی نامعلوم چیز ہے جسے چودہ برس کے گہرے تعلقات کے باوجود میں آج تک نہیں سمجھ سکا اور جس سے مجھے بہت اندیشہ ہے۔ انھوں نے اس نامعلوم عنصر کے وجود کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں خود پہلے سے اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ کیا کر گزرے گا اور اس کا کیا نتیجہ ہو گا۔

دو تین روز میں عجب کشمکش و پیچ میں رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اب معاہدے کی مخالفت کرنے یا اسے رد کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہا تھا۔ یہ منزل گذر چکی تھی اور میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ واقعے کی حیثیت سے تو

اسے تسلیم کرلوں مگر اصولاً اپنے اختلاف رائے کا اظہار کردوں۔ اس سے میری خود بینی کو تسکین ہوجاتی۔ مگر اصل معاملے پر کیا اثر پڑتا؟ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ جو کچھ ہوچکا ہے اُسے ہنسی خوشی مان لوں۔ اور گاندھی جی کی طرح اسے اپنے مفید مطلب معنی پہنا دُوں؟ اخباروں کو ایک بیان دیتے ہوئے گاندھی جی نے معاہدے کی اس تاویل پر زور دیا تھا اور یہ کہہ دیا تھا کہ ہم پوری طرح کامل آزادی کے مطالبے پر قائم ہیں۔ انھوں نے لارڈ اروِن سے مل کر انھیں یہ بات اچھی طرح جتادی تاکہ اس وقت یا آئندہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ اگر کانگرس نے گول میز کانفرنس میں نمائندہ بھیجا تو وہ اسی بنا پر اور اسی دعوے کے پیش کرنے کے لیے بھیجا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ لارڈ اروِن اس دعوے کو تسلیم کر نہیں سکتے تھے مگر انھوں نے کانگرس کا یہ حق تسلیم کرلیا کہ وہ یہ دعوے پیش کرسکتی ہے۔

غرض میں نے سخت ذہنی کش مکش اور جسمانی تکلیف کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس معاہدے کو تسلیم کرلوں اور دل و جان سے اسے پورا کرنے کی کوشش کروں۔ کوئی درمیانی صورت مجھے نظر نہیں آتی تھی۔

معاہدے سے پہلے اور اس کے بعد گاندھی جی اور لارڈ اروِن میں جو ملاقاتیں ہوئیں ان میں گاندھی جی نے بہت اصرار کیا تھا کہ علاوہ سول نافرمانی کے قیدیوں کے جو اس معاہدے کی رو سے رہا ہونے والے تھے، دوسرے سیاسی قیدی بھی چھوڑ دئیے جائیں۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ان میں سے بعض کو تحقیقات کے بعد سزا دی گئی تھی اور بعض بغیر الزام، تحقیقات یا اثبات جرم کے یوں ہی نظر بند کردئیے گئے تھے ان میں سے لوگ سالہا سال سے نظر بند تھے اور اس طرح بغیر تحقیقات قید کردینے کے طریقے کے خلاف سارے ہندوستان خصوصاً بنگال میں جہاں اس کا سب سے زیادہ زور تھا بہت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ چٹاگانگ میں آئی لینڈ کے نائب سپہ سالار (یا ڈرائی فہم کے مقدمے کے مدعیوں)

کی طرح حکومت ہند کا یہ خیال تھا کہ ثبوت نہ ہونا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ان نظر بندوں کے متعلق حکومت کا خیال تھا کہ یہ لوگ بالفعل یا بالقوۃ تشدد پسند قسم کے انقلابی ہیں۔ گاندھی جی نے بہت زور دیا کہ چاہیے یہ معاہدے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے مگر ان کی رہائی سیاسی کشیدگی کو دور کرنے اور بنگال میں طبعی فضا قائم کرنے کے لیے ضروری ہے مگر حکومت اس پر راضی نہیں ہوئی۔

اسی طرح بھگت سنگھ کی سزائے موت کو بدلوانے کے لیے گاندھی جی نے پورا زور لگایا مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسے بھی معاہدے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ گاندھی جی سارے ہندوستان کی خواہش کے مطابق اس کے لئے علیحدہ کوشش کر رہے تھے مگر ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ اسی زمانے میں یعنی میرے والد کی وفات سے چند روز پہلے یا چند روز کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے مجھے ہندوستان کی تخریب پسند جماعت کی طبیعت کا اندازہ ہوا۔ ہمارے گھر ایک اجنبی شخص مجھ سے ملنے کے لئے آیا جس کا نام چندر شیکر آزاد تھا۔ میں پہلے اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔ البتہ دس برس ہوئے ۱۹۲۱ء میں ترک موالات کی تحریک کے زمانے میں جب وہ اسکول چھوڑ کر جیل خانے گیا تھا تو میں نے اس کا نام سنا تھا۔ ان دنوں وہ پندرہ برس کا لڑکا تھا اور اسے جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کے الزام میں کوڑے لگائے گئے تھے۔ آگے چل کر وہ تخریب پسندوں کی طرف ڈھل گیا اور شمالی ہند میں ان کا ممتاز لیڈر بن گیا۔ میں نے اس قسم کی افواہیں سنی تھیں مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس کے آنے سے مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ وہ میرے پاس اس لئے آیا تھا کہ ہم لوگوں کی رہائی کی وجہ سے لوگوں کو عام طور پر یہ توقع تھی کہ حکومت اور کانگریس میں صلح کی بات ہونے والی ہے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اگر صلح ہو گئی تو اس کی جماعت کو بھی امن نصیب ہو گا یا نہیں۔ کیا وہ

لوگ اب بھی اسی حال میں رہیں گے کہ راندۂ قانون بنا کر کھدیڑے جائیں، ان کے سروں کی قیمت مقرر ہو اور انھیں ہر وقت موت کا خوف رہے؟ یا اس کا کچھ امکان ہے کہ انھیں امن وامان کی زندگی بسر کرنی نصیب ہو؟ اس نے کہا کہ وہ اور اس کے بہت سے ساتھی اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ خالی تخویف کے طریقے بیکار ہیں اور ان سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ مگر وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ صرف پرامن جدوجہد کے ذریعہ سے ہندوستان کو آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آگے چل کر تشدد سے کام لینا پڑے گا، مگر تخویف کی صورت میں نہیں، بہرحال وہ تخویف کو ہندوستان کی آزادی کے لئے نامناسب سمجھتا تھا مگر وہ پوچھتا تھا کہ جب اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے اور لوگ اس کی جان لینے کے درپے ہوں تو آخر وہ کیا کرے۔ اس کے قول کے مطابق حال میں جو قدرے تخویف کی وارداتیں ہندوستان میں ہوئیں وہ لوگوں نے صرف اپنی جان بچانے کے لئے کیں۔

میں آزاد سے یہ بات سن کر خوش ہوا اور آگے چل کر اس کی تصدیق بھی ہو گئی کہ تخویف پسندی کا عقیدہ اٹھتا جاتا ہے۔ اجتماعی حیثیت سے یہ چیز قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ انفرادی طور پر کہیں کہیں اس قسم کے واقعات پیش آتے تھے مگر ان کی کوئی خاص وجہ ہوتی تھی مثلاً ذاتی انتقام، یا افراد کی کج رائی۔ ان کی تہ میں کوئی عام اصول نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس کے یہ معنی نہ تھے کہ پرانے تخویف پسند یا ان کے نئے رفیق عدم تشدد کے قائل ہو گئے ہیں یا برطانوی حکومت کے قدر دان بن گئے ہیں۔ البتہ تخویف پسندی کا خیال ان کے دل سے نکل گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے اکثر فاشستی ذہنیت رکھتے ہیں۔

میں نے چند رشیکر آزاد کو اپنا سیاسی جدوجہد کا نظریہ سمجھانے اور اپنا ہمخیال بنانے کی کوشش کی۔ مگر اصل سوال یہ تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ اس کا میرے

پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کوئی ایسی صورت نہیں نظر آتی تھی کہ اسے یا اس جیسے اور لوگوں کو چین سے بیٹھنا نصیب ہو۔ میں اسے بس اتنا ہی مشورہ دے سکا کہ اپنے اثر سے کام لے کر آئندہ تخریف کے واقعات کو روکے اس لئے کہ ان سے قومی مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا اور خود اس کی جماعت کو بھی۔

دو تین ہفتے کے بعد گاندھی اردن گفت و شنید کے دوران ہی ہم نے دہلی میں سنا کہ الہ آباد میں چندر شیکر آزاد کو پولیس نے گولی مار دی۔ وہ دن کے وقت ایک پارک میں پہچانا گیا اور پولیس کے ایک بہت بڑے دستے نے اسے گھیر لیا۔ اس نے ایک درخت کی آڑ لے کر بچنا چاہا، دونوں طرف سے گولیاں چلیں، پولیس کے دو ایک سپاہی زخمی ہوئے اور چندر شیکر مارا گیا۔

عارضی تصفیہ ہونے کے چند روز بعد میں دہلی سے لکھنؤ آ گیا۔ ہم نے فوراً سول نافرمانی کو روکنے کی کارروائی شروع کر دی تھی اور کانگریس کی کل شاخوں نے قابل تعریف انضباط کے ساتھ ہماری نئی ہدایات کی پابندی کی تھی۔ ہماری جماعت میں بہت سے جنگجو اشخاص اس تصفیے سے ناراض تھے اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے ہم انھیں جد و جہد کے روکنے پر مجبور کر سکتے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے بلا استثنا پوری جماعت نے عملاً نئی پالیسی کو قبول کر لیا اگرچہ بہت سے لوگ اصولاً اس کے مخالف تھے مجھے سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ دیکھیں ہمارا صوبہ کیا کرتا ہے اس لئے کہ یہاں بعض علاقوں میں محصول نہ دینے کی تحریک زور شور سے چل رہی تھی۔ ہمارا پہلا کام یہ تھا کہ سول نافرمانی کے قیدیوں کو چھڑائیں۔ ہزاروں قیدی روزانہ رہا ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ کچھ دن کے بعد بجز چند آدمیوں کے جن کے بارے میں کچھ جھگڑا تھا سب چھوٹ گئے۔ ظاہر ہے کہ ہزارہا نظر بند اور وہ لوگ جنھیں تشدد آمیز جد و جہد کے الزام میں سزا ہوئی تھی اس زمرے میں شامل نہیں تھے۔

جب یہ رہا شدہ قیدی اپنے اپنے شہر یا گاؤں میں گئے تو قدرتی طور پر ان کے عزیزوں اور دوستوں نے بڑے جوش وخروش سے ان کا استقبال کیا۔ اکثر مقامات پر جھنڈیوں وغیرہ سے آرائش کی گئی، جلوس نکلے۔ جلسے ہوئے۔ تقریریں کی گئیں، خیر مقدم کے ایڈریس پڑھے گئے۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی اور یہ ہونا ہی چاہیے تھی لیکن اس زمانے سے مقابلہ کیا جائے جب پولیس کی لاٹھی ہر جگہ دکھائی دیتی تھی اور جلسے اور جلوس زبردستی منتشر کر دیے جاتے تھے تو تعجب ہوتا تھا کہ ایک دم سے یہ کیسی کایا پلٹ ہو گئی۔ پولیس کچھ پریشان سی تھی اور غالباً ہمارے آدمیوں میں جو جیل سے چھوٹ کر آئے تھے ایک تفاخر کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ فخر کی کوئی بات نہ تھی مگر قید سے چھوٹنے کے بعد (اگر جیل میں روح بالکل کچل نہ گئی ہو) طبیعت میں ایک ترنگ ہوا ہی کرتی ہے اور جب ہزاروں آدمی ایک ساتھ چھوٹیں یہ ترنگ اور بڑھ جاتی ہے۔

میں اس واقعے کا ذکر اس لیے کرتا ہوں کہ چند مہینے کے بعد حکومت نے ان "فخر کے انداز پر" بہت اعتراض کیا اور اسے ہمارے خلاف ایک الزام قرار دیا۔ اس نے تحکم کی فضا میں نشوونما پائی ہے اور اس کے ذہن میں فوجی حکومت کا تصور ہے۔ اس کی جڑیں لوگوں کے دلوں میں قائم نہیں ہیں اس لیے جس چیز کو وہ اپنا مخالف سمجھتی ہے اس کے چھوٹے سے اشتعال کا بھی سخت صدمہ ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہم میں سے کسی شخص کو اس کا خیال بھی نہ آیا تھا اور ہمیں یہ سنکر سخت تعجب ہوا کہ حکومت کے ملازم شملہ کی چوٹیوں سے لے کر نیچے کے میدانوں تک، لوگوں کی ان تالیوں پر، نعروں اور خیر مقدم سے کھول رہے ہیں۔ وہ اخبار جو حکومت کی آواز کو ظاہر کرتے ہیں اس صدمے سے آخر تک نہیں سنبھلے، اور اب ساڑھے تین برس کے بعد اس ابتری اور شورہ پشتی کے زمانے کا نام آتے ہی کانپ جاتے ہیں جب بقول

ان کے کانگریس والے فتح کی خوشی میں اکڑتے پھرتے تھے۔ حکومت اور اس کے اخباری دوستوں کا یہ غیظ و غضب دیکھ کر ہم حیرت میں رہ گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اعصاب کی کیا حالت تھی اور انھوں نے اپنے جذبات کو کتنا دبایا ہو گا جس سے ان کے نفس میں طرح طرح کی گرہیں پڑ گئیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ہمارے معمولی آدمیوں کے دو چار جلوسوں اور تقریروں نے انھیں اس قدر برہم کر دیا۔

سچ پوچھیے تو لیڈروں کا کیا ذکر ہے، کانگریس کے عام ممبروں کا بھی ان دنوں مطلق یہ خیال نہیں تھا کہ انھوں نے حکومت کو "شکست" دی ہے۔ البتہ ہمیں اپنی قوم کی قربانیوں اور اس کی بہادری پر ضرور فخر تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ہمارے ملک نے جو کر دکھایا اس سے ہماری عزت خود اپنی نظروں میں بڑھ گئی۔ ہمیں اپنے اوپر بھروسا ہو گیا اور ہمارا چھوٹے سے چھوٹا والنٹیر بھی تن کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگا ہمیں یہ احساس بھی تھا کہ ہماری اس جد و جہد سے جس نے دنیا کو ہماری طرف متوجہ کر دیا، برطانوی حکومت پر دباؤ پڑا اور ہم منزل مقصود سے قریب تر ہو گئے۔ ان سب باتوں میں حکومت کو شکست دینے کا کوئی ذکر نہ تھا بلکہ سچ پوچھیے تو ہم میں سے اکثر اچھی طرح جانتے تھے کہ دہلی کے معاہدے میں حکومت نفع میں رہی۔ جب ہم میں سے کوئی یہ کہتا تھا کہ ہم اپنے مقصد سے بہت دور ہیں اور ابھی ہمیں بڑی کشمکش اور مشکلات کا سامنا کرنا ہے تو اس پر لڑائی کی ترغیب دینے کا، دہلی کے معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگایا جاتا تھا۔

صوبہ متحدہ میں ہمیں کاشتکاروں کے مسئلے سے نبٹنا تھا۔ اب ہماری پالیسی یہ تھی کہ جہاں تک ہو سکے حکومت سے اتحاد عمل کریں۔ اور ہم نے فوراً صوبہ متحدہ کی حکومت سے بات چیت شروع کر دی۔ ایک مدت کے بعد (کوئی بارہ برس سے ہمیں ان لوگوں سے سرکاری طور پر سابقہ نہیں پڑا تھا)

میں صوبے کے چند بڑے افسروں سے ملنے گیا تاکہ ان سے کاشتکاروں کے مسئلے پر گفتگو کروں۔ ہماری صوبے کی کمیٹی نے اپنے ایک ممتاز رکن گووند ولبھ پنت کو خاص طور پر اس کام کے لئے مقرر کیا کہ وہ صوبے کی حکومت سے تعلقات قائم رکھیں۔ کاشتکاروں کی نازک حالت، زراعتی پیداوار کی قیمت کا گرجانا، عام کاشتکاروں کا مطلوبہ لگان ادا نہ کرسکنا یہ سب باتیں مسلم تھیں۔ سوال یہ تھا کہ چھوٹ کتنی ہونی چاہیئے اور اس معاملے میں پہلا قدم حکومت ہی اٹھاسکتی تھی۔ معمولاً حکومت کو صرف زمینداروں سے واسطہ ہوتا تھا۔ اسامیوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا اور لگان کو گھٹانا یا معاف کرنا زمینداروں کا کام تھا۔ مگر زمیندار کہتے تھے کہ جب تک حکومت مالگذاری میں رعایت نہیں کرے گی ہم چھوٹ نہیں دے سکتے۔ اور یوں بھی زمیندار عموماً خوشی سے چھوٹ دینے پر تیار نہیں تھے۔ اس لئے فیصلہ حکومت کے ہاتھوں میں تھا۔

صوبہ کانگریس کمیٹی نے کاشتکاروں کو سمجھایا کہ محصول نہ دینے کی تحریک ختم ہوگئی اب تم جتنا لگان دے سکتے ہو دے دو۔ مگر ان کی طرف سے کمیٹی نے بہت سی چھوٹ کا مطالبہ کیا تھا۔ ایک مدّت تک حکومت نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ غالباً اسے یہ مشکل درپیش تھی کہ صوبے کے گورنر سر مالکم ہیلی موجود نہیں تھے بلکہ کارِ خاص پہ انگلستان گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بڑی مستعدی اور دوررسی سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر قائم مقام گورنر اور ان کے رفیق اپنے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ ساری کارروائی گرمی کے موسم تک جب سر مالکم ہیلی واپس آنے والے تھے ملتوی کردی جائے۔ اس حیص بیص اور ڈھیل سے معاملہ اور بگڑ گیا اور اسامیوں کو بڑی تکلیفیں پہنچیں۔

معاہدۂ دہلی کے بعد میں بیمار پڑ گیا۔ جیل ہی میں میری طبیعت اچھی نہیں رہتی تھی اس کے بعد والد کے وفات کے صدمے سے اور دلّی کی طول طویل گفت و شنید

کے بوجھ سے میری صحت نے جواب دے دیا۔ کراچی کانگریس کے زمانے میں کسی قدر طبیعت سنبھل گئی تھی۔

کراچی ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے اور اس کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اس کے اور بقیہ ہندوستان کے بیچ میں ریگستانی خطے حائل ہیں۔ پھر بھی ہزاروں آدمی دور دور سے آکر جمع ہو گئے۔ یہ مجمع صحیح معنی میں ہندوستان کی اس وقت کی مزاجی حالت کو ظاہر کرتا تھا۔ ایک تو قومی تحریک کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر ہمیں خاموش مگر گہری مسرت تھی، کانگریس کی تنظیم پر ناز تھا جس نے اپنے بھاری فرائض کو اس خوبی سے ادا کیا اور انضباط اور قربانی کا حق ادا کر دیا۔ ہمیں اپنی قوم پر بھروسا تھا اور ہمارے دل ایک دبے ہوئے جوش سے معمور تھے۔ دوسری طرف ہمیں اپنی ذمہ داری کا اور ان مسئلوں اور خطروں کی اہمیت کا جو ہمیں درپیش تھے پورا احساس تھا۔ اب ہمارے الفاظ اور ہماری تجویزیں قومی عمل کی تمہید تھیں اور ہم بے سوچے سمجھے نہ کوئی لفظ زبان سے نکال سکتے تھے اور نہ کوئی رزولیوشن پاس کر سکتے تھے۔ دہلی کا معاہدہ اکثریت نے منظور تو کر لیا تھا مگر لوگ اسے عام طور پر پسند نہیں کرتے تھے اور انھیں خوف تھا کہ اس میں ایسی صورتیں پیدا ہو جائیں گی جن میں کانگریس کی بدنامی ہو گی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ مسائل جو ملک کے سامنے درپیش ہیں الجھ کر رہ جائیں گے۔ کانگریس سے چند ہی روز پہلے ناراضی کی ایک نئی وجہ پیدا ہو گئی تھی اور وہ بھگت سنگھ کی سزائے موت تھی۔ یہ احساس شمالی ہندوستان میں بہت نمایاں تھا اور چونکہ کراچی شمال میں واقع ہے اس لئے وہاں پنجاب کے لوگ بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔

کراچی کانگریس میں شخصی طور پر گاندھی جی کو اتنی بڑی فتح حاصل ہوئی کہ کسی اور کانگریس میں نہ ہوئی ہو گی۔ اس اجلاس کے صدر سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے جو ہندستان

کے نہایت با اثر اور ہر دلعزیز لیڈروں میں سے تھے مگر اصل میں گاندھی جی سب کہیں چھائے ہوئے تھے۔ پشاور کے سُرخ پوشوں کی ایک جماعت بھی خان عبدالغفار خاں کی سرکردگی میں کانگرس میں شرکت کرنے کے لئے آئی تھی۔ یہ سُرخ پوش بہت ہر دلعزیز تھے اور جہاں کہیں جاتے تھے لوگ آفرین کے نعرے بلند کرتے تھے۔ اس لئے کہ اپریل ۱۹۳۰ء کے بعد سے لوگ ان کی بے نظیر ہمت اور ان کی امن پسندی کو جس پر وہ باوجود سخت اشتعال کے قائم رہے، دیکھ کر بہت متاثر تھے۔ "سرخ پوش" کے نام سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ کوئی اشتمالیوں یا انتہا پسند مزدوروں کی جماعت ہے اصل میں ان کا نام "خدائی خدمتگار" تھا اور ان کی جماعت کانگرس کی رفیق کار بن گئی تھی (۱۹۳۱ء میں اس جماعت کا کانگرس سے باضابطہ الحاق ہوگیا) سُرخ پوش وہ محض اس وجہ سے کہلاتے تھے کہ ان کی قدیم وضع کی وردیاں سُرخ رنگ کی تھیں۔ ان کا لائحہ عمل محض قومی آزادی اور معاشرتی اصلاح پر مبنی تھا اور وہ کوئی سیاسی پالیسی نہیں رکھتے تھے۔

کراچی کانگرس کا سب سے اہم رزولیوشن معاہدۂ دہلی اور گول میز کانفرنس سے متعلق تھا جب یہ رزولیوشن ورکنگ کمیٹی میں منظور ہوگیا تو میں نے بھی اسے قبول کرلیا۔ مگر جب گاندھی جی نے مجھ سے فرمائش کی کہ تم اسے کانگرس کے کھلے اجلاس میں پیش کرو تو میں ہچکچایا۔ یہ میری طبیعت کے خلاف تھا۔ اس لئے پہلے میں نے انکار کیا مگر پھر سوچا کہ یہ بڑی کمزوری ہے۔ یا تو مجھے اس کی موافقت کرنا چاہیئے یا مخالفت۔ بات کو ٹالنے سے اور لوگوں کو شبہے میں ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں عین وقت پر یعنی رزولیوشن کے پیش ہونے سے چند منٹ پہلے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں خود اسے پیش کروں گا۔ اپنی تقریر میں میں نے یہ کوشش کی کہ اس عظیم الشان مجمعے کے سامنے اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کردوں اور یہ بتادوں کہ میں نے

اس رزولیوشن کو کیوں قبول کرلیا اور لوگوں سے اس کی وکالت کیوں کررہا ہوں یہ تقریر جو میں نے وقت کے وقت کی تھی اور جس کا ہر لفظ میرے دل سے نکلا تھا بالکل کھری سیدھی سادی تقریر تھی مگر غالباً یہ میری اور تقریروں سے جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر کی تھیں، زیادہ کامیاب رہی۔

میں نے اور تجویزوں پر بھی تقریریں کیں خصوصاً اس رزولیوشن پر جو بھگت سنگھ سے متعلق تھا اور اس پر جس میں بنیادی حقوق اور معاشی پالیسی کی بحث تھی۔ اس دوسرے رزولیوشن سے مجھے نہ صرف اس کے مضمون کے سبب سے بلکہ اس وجہ سے بھی خاص دلچسپی تھی کہ یہ کانگرس کے نئے طرز خیال کو ظاہر کرتا تھا۔ اب تک کانگرس خالص قومی خیالات رکھتی تھی اور معاشی مسائل سے بچتی تھی۔ بجز اس کے کہ وہ گھریلو صنعتوں کی اور علی العموم سودیشی صنعتوں کی حامی تھی۔ کراچی کے رزولیوشن میں اس نے اشتراکیت کی طرف ایک چھوٹا سا قدم اٹھایا۔ یعنی بنیادی صنعتوں وغیرہ کے قومی ملک قرار دیے جانے اور غریبوں کا بوجھ گھٹا کر امیروں کا بوجھ بڑھانے کی مختلف تدابیر کی وکالت کی۔ یہ ہرگز اشتراکیت نہیں اور ایک سرمایہ داری سلطنت کو بھی اس رزولیوشن کی تمام باتوں کے منظور کر لینے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔

ایک ہلکے سے کیش یا افتادہ رزولیوشن نے حکومت ہند کے اعلیٰ افسروں میں ہلچل ڈال دی۔ شاید انھیں اس قوت تخیل کے زور سے جو ان کے حصے میں آئی ہے یہ نظر آنے لگا کہ بالشویکوں کا سرخ سونا پوشیدہ طریقے سے کراچی پہنچ گیا اور اس نے کانگرس کو پھسلا لیا۔ یہ لوگ بیرونی دنیا سے الگ حریم سیاست کی چاردیواری میں رہتے ہیں، جہاں رازداری کی فضا چھائی ہوئی ہے اور ان کی اثرپذیر طبیعتیں مزے لے لے کر پراسرار خیالی قصے سنا کرتی ہیں۔ اور پھر ان کہانیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بڑے پراسرار انداز میں ان اخباروں میں چھپتے ہیں،

جنھیں حکومت کا تقرب حاصل ہے اور اشارۃً یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر حقیقت کے رُخ سے پردہ اٹھا دیا جائے تو نہ جانے کیا کیا طلسمی منظر دکھائی دیں۔ اس انوکھے ہوئے طریقے سے کراچی کے بنیادی حقوق وغیرہ کے رزولیوشن کا بارہا ذکر کیا گیا جس کے معنی یہی تو یہی سمجھوں گا کہ یہ حکومت اس رزولیوشن کے متعلق یہ خیالات رکھتی تھی کہا جاتا ہے کہ کسی پُراسرار شخص نے جو بالشویکوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس رزولیوشن یا اس کے بڑے حصے کا مسودہ بنایا اور اسے کراچی میں میرے سر منڈھ دیا اس کے بعد میں نے مسٹر گاندھی کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر آپ نے یہ رزولیوشن قبول نہ کیا تو میں دہلی کے معاہدے کی مخالفت کروں گا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی میری تالیف قلب کے لئے اسے مان گئے۔ اور آخری دن نقلی ماندی سبجکٹس کمیٹی اور کانگرس سے زبردستی یہ رزولیوشن پاس کرا لیا۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس "پراسرار شخص" کا نام صاف صاف نہیں لیا گیا۔ مجھے پُراسرار طریقوں اور اینچ پینچ کی باتوں کی عادت نہیں اس لئے میں صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ میرے خیال میں یہ اشارہ ایم۔ این۔ رائے کی طرف ہے بڑا لطف آئے اور شملے اور دہلی کے اعلیٰ حکام کی آنکھیں کھل جائیں اگر انھیں یہ معلوم ہو کہ ایم۔ این۔ رائے یا کوئی اور اشتمالی خیالات رکھنے والا شخص کراچی کے اس ریزولیوشن کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ انھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس خیال کے لوگ اس رزولیوشن کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے خیال میں یہ متوسط طبقے کے شہریوں کی اصلاح پسندانہ ذہنیت کا خاص نمونہ ہے۔ اب رہا گاندھی جی کا معاملہ تو مجھے ان سے سترہ برس سے بہت اچھی طرح سے نیاز حاصل ہے اور یہ بات قیاس ہی میں نہیں آسکتی کہ میں ان کو الٹی میٹم دوں یا ان سے سودا چکاؤں۔ خواہ ہم میں اتفاق رائے ہو یا کسی خاص معاملے میں اختلاف ہو

بہرصورت ہمارے تعلقات میں بازاری لین دین کے طریقے کو دخل نہیں ہو سکتا۔

کانگریس سے اس قسم کا رزولیوشن پاس کرانے کا خیال پہلے سے موجود تھا۔ کئی سال سے صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی یہ کوشش کر رہی تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے ایک اشتراکی رنگ کا رزولیوشن پاس کرائے۔ ۱۹۲۹ء میں اسے اشتراکیت کا اصول منوا لینے میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سول نافرمانی کا قصہ چھڑ گیا۔ فروری اور مارچ ۱۹۳۱ء میں جب میں دلی میں صبح کی چہل قدمی کے وقت گاندھی جی سے گفتگو کیا کرتا تھا، میں نے ان سے اس معاملے کا ذکر کیا تھا اور انھوں نے بڑی خوشی سے اسے منظور کر لیا تھا کہ معاشی مسائل کے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ تم کراچی میں اس مسئلے کو پیش کرنا اور ایک رزولیوشن کا مسودہ بنا کر مجھے دکھانا۔ چنانچہ میں نے کراچی میں ایک رزولیوشن ترتیب دیا اور انھوں نے اس میں کچھ تغیر و تبدل بھی کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ رزولیوشن کو کمیٹی میں پیش کرنے سے پہلے ان میں اور مجھ میں الفاظ کے متعلق اتفاق رائے ہو جائے۔ سب مجھے کئی مسودے بنانے پڑے جس کی وجہ سے کئی روز کی دیر ہوئی اور یوں بھی ہم اور کاموں میں الجھے رہے۔ آخر کار ایک ایسا مسودہ بن گیا جس پر گاندھی جی کا اور میرا اتفاق ہو گیا اور پہلے ورکنگ کمیٹی اور پھر سبجکٹس کمیٹی میں پیش کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سبجکٹس کمیٹی کے لیے بالکل نئی چیز تھی اور بعض ممبروں کو اس پر حیرت ہوئی۔ بہرحال کمیٹی اور کانگریس میں یہ رزولیوشن بڑی آسانی سے پاس ہو گیا اور آل انڈیا کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر جو اس میں قائم کئے گئے ہیں، اس کی توضیح اور تفصیل کرے۔

جب میں اس رزولیوشن کو ترتیب دے رہا تھا تو مختلف لوگوں سے جو

میرے خیمے میں آتے تھے، اس کے بارے میں مشورہ بھی کرتا تھا مگر م۔ن۔ رائے کو اس سے مطلق کوئی تعلق نہ تھا اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کریں گے۔ اور اس کی ہنسی اڑائیں گے۔

مجھے کراچی آنے سے چند دن پہلے الہ آباد میں م۔ن رائے سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایک روز شام کو وہ اچانک ہمارے یہاں آپہنچے اور اگرچہ مجھے شان گمان بھی نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں ہیں مگر میں نے انھیں پہچان لیا اس لیے کہ ۲۷ء میں انھیں ماسکو میں دیکھ چکا تھا۔ کراچی میں بھی ان سے ملاقات ہوئی مگر صرف پانچ منٹ کے لئے۔ پچھلے چند سال کے عرصے میں رائے نے میرے سیاسی رویے کی مذمت میں بہت کچھ لکھا تھا اور کبھی کبھی "مجھے" اس سے کسی قدر تکلیف بھی پہنچی تھی ہم دونوں میں بہت کچھ اختلافات تھے مگر اس کے باوجود مجھے ان سے ایک تعلق خاطر تھا اور جب وہ گرفتار کئے گئے تو جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے ان کی مدد کی۔ میں ان کی ذہنی قابلیت کی وجہ سے ان کی قدر کرتا تھا اور مجھے ان سے اس وجہ سے اور بھی ہمدردی ہو گئی تھی کہ انھیں سب نے چھوڑ دیا تھا اور وہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ برطانوی حکومت ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے قومیت پسندوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ لوگ جو اپنے آپ کو اشتمالی کہتے ہیں ان پر غدّاری کا الزام لگاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ برسوں روس میں رہنے اور اشتمالیوں کی بین الاقوامی مجلس سے اتحاد عمل کرنے کے بعد وہ اس سے الگ ہو گئے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی کیا وجہ تھی اور نہ مجھے اب تک مبہم افواہوں کے سوا یہ معلوم ہے کہ ان کے موجودہ خیالات کیا ہیں اور انھیں اشتمالیوں سے کس بات میں اختلاف ہے۔ مگر مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوئی کہ ان جیسے شخص کا کوئی ساتھ دینے والا

نہیں تھا اس لئے اپنی عادت کے خلاف میں ان کی طرف سے پیروی کرنے والی کمیٹی میں شریک ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں انھیں سزا ہو گئی۔ اب تین سال سے وہ قریب قریب قید تنہائی میں ہیں اور ان کی صحت اچھی نہیں رہتی۔

کراچی کانگریس کی آخری کارروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے آئندہ سال کے لئے نئی ورکنگ کمیٹی منتخب کی۔ اس کمیٹی کا انتخاب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کرتی ہے مگر کچھ عرصے سے یہ طریقہ رائج ہو گیا ہے کہ جو شخص کانگریس کا صدر ہوتا ہے وہ (گاندھی جی اور کبھی کبھی بعض اور رفیقوں کے مشورے سے) ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے نام تجویز کرتا ہے۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس تجویز کو منظور کر لیتی ہے۔ کراچی میں ورکنگ کمیٹی کا جو انتخاب کیا گیا اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بعض ممبروں کو اس انتخاب پر خصوصاً ایک (مسلمان کے) نام پر اعتراض تھا۔ شاید انھیں یہ شکایت بھی تھی کہ ان کے حلقے میں سے کوئی نہیں لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ آدمیوں کی آل انڈیا کمیٹی میں ہر گروہ کی نمائندگی ناممکن تھی اور اصل نزاع جس کا ہمیں کچھ علم نہیں تھا محض ذاتی اور مقامی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتراض کرنے والا گروہ رفتہ رفتہ کانگریس سے علیحدہ ہو گیا۔ اور اس نے "مجلس احرار" کے نام سے اپنی ایک انجمن بنا لی۔ پنجاب کے بعض نہایت سرگرم اور ہر دلعزیز مسلمان کانگریسی کارکن اس انجمن میں شریک ہو گئے اور انھوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت کو اپنی طرف کھینچ لیا یہ لوگ زیادہ تر نیچے اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عام مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔ یہ ایک زبردست انجمن بن گئی جو اونچے طبقے کے فرقہ پرست مسلمانوں کی فرسودہ جماعت سے کہیں زیادہ قوت رکھتی تھی اس لئے کہ اس جماعت کی کارروائیاں محض ہوائی

تھیں یا یوں کہنا چاہیئے کہ محض دیوان خانوں اور کمیٹی کے کمروں تک محدود تھیں لازمی طور پر احرار کی انجمن رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کی طرف مائل ہو گئی مگر چونکہ ان کا تعلق عام مسلمانوں سے تھا اس لئے وہ ایک زندہ جماعت تھی اور بعض مبہم معاشی خیالات بھی رکھتی تھی۔ آگے چل کر دیسی ریاستوں خصوصاً کشمیر کے مسلمانوں کی شورشوں میں جہاں بدقسمتی سے معاشی شکایتیں فرقہ پرستی میں گڈمڈ ہو گئی تھیں، احرار نے بہت اہم حصہ لیا۔ احرار پارٹی کے بعض لیڈروں کے کانگرس سے الگ ہو جانے سے پنجاب کی کانگرس کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر کراچی میں ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے الگ ہونے کی وجہ صرف وہ ناراضی ہی نہیں تھی جو ورکنگ کمیٹی کے انتخاب سے پیدا ہوئی۔ یہ تو محض ایک علامت تھی جس سے صورت حال کا اظہار ہو گیا۔ اصل اسباب کچھ اور تھے۔

کراچی میں ہمیں کانپور کے ہندو مسلمانوں کے فساد کی اطلاع پہنچی، اور اس کے بعد ہی یہ خبر بھی آئی کہ گنیش شنکر ودیارتھی کو عوام کے غضبناک مجمع نے جس کی وہ مدد کرنا چاہتے تھے قتل کر دیا۔ یہ خوفناک اور وحشیانہ فسادیوں ہی کیا کم تھا مگر ہمیں اس سے کہیں زیادہ نتائج کا اندازہ اس سے زیادہ گنیش جی کی موت سے ہوا۔ کانگرس کے کیمپ میں ہزاروں آدمی ان کے جاننے والے تھے اور ہم صوبہ متحدہ والوں کے تو وہ عزیز ترین دوست اور رفیق تھے۔ یہ بہادر اور نڈر جوان دوراندیشی اور اصابت رائے میں بوڑھوں کو مات کرتا تھا۔ وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا تھا اور چپ چاپ اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ شہرت، اور عزت، عہدے اور منصب کی اسے ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ جوانی کی ترنگ میں اس نے جان بوجھ کر اس مقصد کے لئے جس کی محبت اور خدمت کو وہ اپنا دھرم جانتا تھا اپنی جان جوکھم میں ڈالی۔ نادانوں نے اسے مار کر گرا دیا اور کانپور کیا

سارے صوبے کو اس گوہرِ تاباں سے محروم کر دیا جس کی جودت کا ان کے پاس اور کوئی ہیرا نہ تھا۔ اس خبر کے آتے ہی کراچی کے صوبہ متحدہ کے کیمپ میں اداسی چھا گئی اور اس کی ساری چمک دمک ماند پڑ گئی۔ مگر اسی کے ساتھ ہمیں اس پہ ناز بھی تھا کہ اس نے اس آن بان سے موت کا سامنا کیا اور اس شان سے جان دی۔

(۳۶)

لنکا کی سیر

میرے معالج ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ تم کچھ دن آرام کرو اور تبدیل آب و ہوا کے لئے کہیں چلے جاؤ۔ چنانچہ میں نے یہ طے کیا کہ ایک مہینہ سیلون میں گزاروں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے مگر اس میں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی تھی جہاں میرے مشاغل بدل سکیں یا میرے دماغ کو آرام مل سکے۔ اس لئے کہ میں جہاں کہیں جاتا وہاں میرے سیاسی رفیق کار موجود ہوتے اور میں ایک ہی قسم کے مسائل میں الجھا رہتا۔ سیلون ہندوستان کے باہر بھی ہے اور سب سے قریب بھی اس لئے ہم (یعنی کملا، اندرا اور میں) سیلون چلے گئے۔

سنہ ۲۷ء میں یورپ سے واپس آنے کے بعد میں نے یہ پہلی چھٹی لی تھی اور بہت دن کے بعد موقع ملا تھا کہ میں ہر قسم کی فکروں سے محفوظ ہو کر اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دن امن اور سکون سے بسر کروں۔

مگر سچ پوچھئے تو نہیں نوارا ایلیا کے دو ہفتے کے قیام کے سوا سیلون میں کبھی چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ وہاں ہر طبقے کے لوگوں نے ہماری اس قدر خاطر تواضع کی کہ ہم بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی ان عنایتوں سے جی بہت خوش ہوتا تھا لیکن بعض وقت بڑی مشکل پڑ جاتی تھی۔ نوارا ایلیا میں روزانہ چائے کے باغ میں کام کرنے والوں اور دوسرے مزدوروں کی ٹولیاں میلوں چل کر ہم سے ملنے آتی تھیں اور ہمارے لئے جنگلی پھول، ترکاریاں، گھر کا بنا ہوا مکھن لاتی تھیں۔ عموماً ہم آپس میں گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ بس ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ ہمارا

چھوٹا سا مکان ان تحفوں سے بھر جاتا تھا جو وہ اپنی ذرا سی پونجی میں سے ہمیں دیتے تھے اور ہم انھیں مقامی اسپتال اور یتیم خانوں میں بھیجدیا کرتے تھے۔

ہم جزیرے کی بہت سی قابل دید چیزیں، تاریخی عمارتیں، بودھ مذہب کی خانقاہیں اور گرم خطے کے ہرے بھرے جنگل دیکھنے جایا کرتے تھے۔ انورودھ پور میں مجھے بودھ کی ایک پرانی بیٹھی مورت بہت پسند آئی۔ ایک سال بعد جب میں دہرہ دون کے جیل میں تھا سیلون سے ایک دوست نے مجھے اس مورت کی تصویر بھیجی جو میں نے اپنی کوٹھری میں میز پر رکھ لی۔ وہ میرے لئے ایک قابل قدر رفیق ثابت ہوئی۔ بودھ کے باوقار اور پرسکون چہرے کو دیکھ کر مجھے تسکین اور تقویت ہوتی تھی اور بارہا مجھے اس سے اپنی افسردگی اور اداسی کو دور کرنے میں مدد لی۔

بودھ کا مجھ پر ہمیشہ سے بہت اثر ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اثر کس قسم کا ہے اسے مذہبی عقیدت نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ بودھ مذہب کے عقائد سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے جو چیز کھینچتی ہے وہ بودھ کی شخصیت ہے۔ اسی طرح مسیح کی شخصیت بھی میرے لئے بڑی کشش رکھتی ہے۔

میں نے خانقاہوں میں اور شاہراہوں پر بہت سے بودھ بھکشو (راہب) دیکھے۔ ان کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے۔ قریب قریب ان سب کے چہرے پرسکون اور اطمینان کا رنگ چھایا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی فکروں سے آزاد ہیں۔ عموماً ان کے بشرے سے ذہانت ظاہر نہیں ہوتی اور شدید ذہنی کشمکش کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے لئے زندگی ایک سبک رو ندی ہے جو سرمدی سمندر کی طرف بہتی چلی جارہی ہے۔ انھیں دیکھ کر مجھے کسی قدر رشک آتا تھا اور میرے دل میں امن و عافیت کی ایک خفیف سی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ مگر میں خوب جانتا تھا کہ یہ زندگی میرے حصے میں نہیں آئی ہے۔ میری کشتی حیات طوفان

تلاطم کے لئے وقف ہے۔ میرے لئے امن کی کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے کہ میرے اندر ویسا ہی شدید طوفان برپا ہے جیسا باہر ہے۔ اور فرض کیجئے میں کسی پُرامن بندرگاہ میں پہنچ جاؤں، جو تند و تیز ہواؤں سے محفوظ ہو، تو کیا میں وہاں خوش اور مطمئن رہ سکوں گا؟

کچھ دنوں کے لئے یہ گوشۂ عافیت ضرور خوش گوار تھا۔ جہاں میں آرام سے لیٹا، خواب و خیال کا لطف اٹھاتا تھا اور میں نے اپنے آپ کو اس دلفریب پرسکون اور طاقت بخش خطے کے آغوش میں دے دیا تھا۔ سیلون اس زمانے میں میری قلبی کیفیت سے مناسبت رکھتا تھا اور اس کے خوش نما مناظر میرے دل کو راحت و مسرت بخشتے تھے۔ ہمارا چھٹی کا مہینہ بہت جلد گذر گیا اور ہم حسرت و افسوس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے۔ مجھے سیلون اور اس کے باشندوں کی بہت سی باتیں اب تک یاد آتی ہیں۔ ان کی یاد قید کی لمبی کٹھن اور سنسان گھڑیوں میں میری مونس اور ہمدم رہی۔ ایک چھوٹا سا واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ شاید ہم جافنا کے قریب تھے کہ ایک مدرسے کے استادوں اور لڑکوں نے ہماری موٹر روکی اور خیر مقدم کے چند الفاظ کہے۔ لڑکوں کے چہرے جوش اور شوق سے تمتما رہے تھے۔ یکایک ان میں سے ایک میرے پاس آیا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور آپ ہی آپ بغیر کسی تمہید کے کہا "میرا قدم نہیں ڈگمگائے گا۔" اس بچے ہونہار چہرہ جس کی آنکھوں سے عزم و استقلال ٹپک رہا تھا میرے دل پر نقش ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا میں اس کا پتہ نہیں چلا سکا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے دل سے یقین ہے کہ وہ اپنے قول پر قائم رہے گا اور جب اسے زندگی کی مشکلات کا سامنا ہوگا تو اس کا قدم نہیں ڈگمگائے گا۔

سیلون سے چل کر ہم ہندوستان کے آخری جنوبی سرے راس کماری

پر اُترے۔ وہاں ایک حیرت انگیز سکون کا عالم تھا۔ اس کے بعد ٹراونکور، کوچین، ملابار، میسور، حیدرآباد سے گذرے۔ ان میں سے اکثر دیسی ریاستیں ہیں بعض بہت ترقی کر رہی ہیں اور بعض انتہائی پستی کی حالت میں ہیں۔ ٹراونکور اور کوچین تعلیم میں اور میسور غالباً صنعت و حرفت میں برطانوی ہند سے کہیں آگے ہیں۔ حیدرآباد جاگیرداری نظام کے زمانے کی قریب قریب مکمل نشانی ہے۔ ہمارا خیر مقدم ہر جگہ رعایا اور حکام دونوں کی طرف سے بڑے اخلاق اور تپاک سے کیا گیا مگر حکام کے اس تپاک میں یہ بات صاف جھلک رہی تھی کہ وہ بہت پریشان ہیں کہ کہیں ہمارے آنے کی وجہ سے لوگوں میں خطرناک خیالات نہ پیدا ہو جائیں۔ میسور اور ٹراونکور میں ان دنوں رعایا کو کسی قدر قانونی آزادی اور سیاسی کام کے مواقع حاصل تھے۔ حیدرآباد میں یہ بھی نہ تھا۔ بعد میں میسور اور ٹراونکور کی حکومتوں نے وہ تھوڑی بہت قانونی آزادی اور سیاسی جدوجہد کی اجازت بھی واپس لے لی جو انھوں نے پہلے دے رکھی تھی۔

میسور کی ریاست میں بنگلور کے مقام پر میں نے ایک عظیم الشان جلسے میں لوہے کے ایک بہت بڑے کھمبے پر قومی جھنڈا چڑھا دیا تھا۔ میرے وہاں سے آنے کے تھوڑے ہی دن بعد یہ کھمبا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا۔ اور قومی جھنڈے کا لگانا اور لے کر چلنا جرم قرار دے دیا گیا۔ مجھے اس جھنڈے کی توہین سے جو میں نے نصب کیا تھا سخت تکلیف ہوئی۔

ٹراونکور میں آج بھی کانگرس خلاف قانون جماعت ہے اور کوئی شخص لوگوں کو اس کا ممبر نہیں بنا سکتا حالانکہ برطانوی ہند میں سول نافرمانی کے موقوف ہو جانے کے بعد کانگرس مطابق قانون قرار دے دی گئی ہے۔ غرض میسور اور ٹراونکور دونوں ریاستیں پُرامن سیاسی جدوجہد کو کچل رہی ہیں اور انھوں نے وہ رعایتیں جو پہلے

دے رکھی تھیں واپس لے لی ہیں۔ حیدرآباد کو پیچھے ہٹنے یا رعایتوں کو واپس
لینے کی ضرورت ہی نہ تھی اس لئے کہ وہ نہ کبھی آگے بڑھا تھا اور نہ اس نے کوئی
رعایتیں دی تھیں۔ سیاسی جلسوں کا تو حیدرآباد میں کوئی نام تک نہیں جانتا تھا۔
بلکہ سماجی اور مذہبی جلسے بھی شبہے کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کے لئے خاص
طور پر اجازت لینی پڑتی ہے۔ خود وہاں سے کوئی معقول اخبار نہیں نکلتا اور باہر کے
زہر کو روکنے کے لئے بہت سے اخباروں کا جو ہندوستان کے مختلف حصّوں سے
شائع ہوتے ہیں داخلہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس میں یہاں تک سختی کی جاتی ہے کہ
اعتدال پسند اخبار بھی نہیں آنے پاتے۔

کوچین میں ہم "گورے یہودیوں" کے محلے میں گئے اور انھیں ان کے
قدیم "خیمۂ عبادت" میں عبادت کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک بہت پُرانا اور
عجیب و غریب چھوٹا سا فرقہ ہے اور اب اس کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی
ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ کوچین کا وہ حصہ جس میں یہ لوگ رہتے ہیں قدیم یروشلم سے
شابہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دیکھنے میں بہت قدیم معلوم ہوتا ہے۔ ہم
ن قصبوں میں بھی گئے جو ملابار کی اندرونی کھاڑیوں کے کنارے آباد ہیں۔
ن میں زیادہ تر شامی کلیسا کے پیرو عیسائی رہتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم
ہے کہ عیسائی مذہب ہندوستان میں پہلی صدی عیسوی ہی میں پہنچ گیا تھا اور
ں نے جنوبی ہند میں مضبوطی سے قدم جما لیا تھا۔ اگرچہ ان عیسائیوں کا مذہبی پیشوا
ظاکیہ یا شام کے کسی شہر میں رہتا ہے لیکن ان کا مذہب قریب قریب دیسی ہے
ر اسے باہر کے لوگوں سے بہت کم واسطہ ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جنوب میں نسطوریوں کی بھی ایک آبادی ہے۔ ان کے
نیپ نے کہا کہ ان لوگوں کی تعداد دس ہزار ہے۔ میں یہی سمجھا کرتا تھا کہ نسطوری مدت سے

دوسرے فرقوں میں ضم ہو چکے ہیں اور مجھے خبر نہ تھی کہ اس مذہب نے کبھی ہندوستان میں بھی فروغ پایا تھا۔ مگر مجھے یہ بتایا گیا کہ کسی زمانے میں ہندوستان میں بھی اس کے بہت پیرو تھے اور شمال میں بنارس تک پھیلے ہوئے تھے۔

ہم حیدرآباد خاص طور پر سروجنی نائڈو اور ان کی لڑکیوں پدمجا اور لیلامنی سے ملنے کے لئے گئے تھے اور انھیں کے یہاں ٹھہرے تھے۔ ہمارے قیام کے زمانے میں وہاں پردہ نشین خواتین کا ایک چھوٹا سا جلسہ میری بیوی سے ملنے کے لئے منعقد ہوا۔ معلوم ہوا کہ کملا نے ان کے سامنے ایک تقریر بھی کی اور شاید اس میں عورتوں کی جنگ آزادی کا ذکر کیا جو وہ مردوں کے بنائے ہوئے رسوم و قوانین سے کر رہی ہیں (یہ موضوع اسے بہت پسند تھا) اس سلسلے میں اس نے ان سے کہا کہ تمھیں اپنے مردوں کی حد سے زیادہ اطاعت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کا ایک بڑا دلچسپ نتیجہ ہوا۔ دو تین ہفتے کے بعد حیدرآباد سے کسی شخص نے بڑی پریشانی کی حالت میں کملا کو خط لکھا کہ آپ کے یہاں آنے کے بعد سے میری بیوی کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے وہ خلاف معمول اب میری کوئی بات نہیں مانتی۔ ہر کام میری مرضی کے خلاف کرتی ہے۔ ہر وقت بحث کرتی رہتی ہے بلکہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

جس دن ہم بمبئی سے سیلون روانہ ہوئے تھے اس کے سات ہفتے بعد وہاں واپس پہنچ گئے اور میں پھر کانگرس کی سیاست کے بھنور میں پڑ گیا۔ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہو رہا تھا اور اس میں بعض نہایت اہم مسائل پر غور کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان کی بدلتی ہوئی حالت، صوبہ متحدہ کے کسانوں کی مشکلات، صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خاں کی قیادت میں سُرخ پوشوں کی حیرت انگیز ترقی بنگال کی برہمی، دبا ہوا غصہ اور بے چینی، سدابہار فرقہ وارانہ مسئلہ، چھوٹی چھوٹی

مقامی نزاعیں، کانگریس اور ملازمان سرکار کے بہت سے جھگڑے جن میں ایک دوسرے پر معاہدہ دہلی کی خلاف ورزی کا الزام لگاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سوال تھا جو ایک مدت سے بار بار اُٹھ رہا تھا۔ کیا کانگریس کی نمائندگی گول میز کانفرنس میں ہونی چاہیئے؟ کیا مہاتما گاندھی کو اس میں شرکت کرنی چاہیئے؟

(۳۷)

صلح کے زمانے میں حکومت اور کانگریس کے جھگڑے

گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن جائیں یا نہ جائیں؟ یہ سوال بار بار اٹھتا تھا اور اس کا کوئی صاف جواب نہیں ملتا تھا۔ آخر وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا فیصلہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ورکنگ کمیٹی اور خود گاندھی جی کو بھی خبر نہ تھی۔ فیصلہ بہت سی باتوں پر موقوف تھا اور نئے نئے واقعات کی وجہ سے صورت حال روز بدلتی رہتی تھی۔ اس سوال اور اس کے جواب کی تہ میں بہت سے مشکل سوال پوشیدہ تھے۔

برطانوی حکومت اور اس کے دوستوں کی طرف سے ہم سے بار بار کہا جاتا تھا کہ گول میز کانفرنس پہلے ہی دستور اساسی کا ڈھانچا بنا چکی ہے۔ تصویر کا خاکہ تیار ہے۔ صرف رنگ بھرنے کی کسر ہے۔ مگر کانگریس کا یہ خیال نہیں تھا۔ اس کی طرف سے تو تصویر کو رہے پڑے پر نئے سرے سے بنائی جانے والی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ دہلی کے معاہدے میں وفاق اور تحفظات کے اصول تسلیم کرلئے گئے تھے۔ گر وفاق کو تو ہم میں سے اکثر بہت پہلے سے ہندوستان کے دستور اساسی کا بہترین حل سمجھتے تھے اور اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ اس خاص وفاقی نظام کو تسلیم کرلیا ہے جو پہلی گول میز کانفرنس نے تجویز کیا تھا۔ وفاقی حکومت میں سیاسی آزادی اور سماجی تبدیلیوں کی پوری طرح گنجائش تھی مگر تحفظات کا اس کے ساتھ کھپنا بہت مشکل تھا۔ معمولی صورت میں تحفظات کا وجود ملک کے اقتدار اعلیٰ

میں بہت کچھ کمی کر دیتا مگر چونکہ ان کے ساتھ "ہندوستان کے فائدے" کی شرط لگی ہوئی تھی اس لئے یہ مشکل کسی قدر آسان ہو گئی تھی مگر پھر بھی پوری طرح حل نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال کراچی کانگریس نے اس بات کو صاف کر دیا تھا کہ وہی دستور قابل قبول ہوگا جس کی رو سے ہندوستان کو فوج، امور خارجہ، مالی اور معاشی پالیسی پر پورے پورے اختیارات دے جائیں گے اور وعدہ کیا جائے کہ بیرونی قرضوں کی ذمہ داری ہندوستان پر ڈالنے سے پہلے اس کی اچھی طرح چھان بین کر لی جائیگی کہ اس پر دوسرے ملکوں (خصوصاً انگلستان) کا واقعی قرضہ کتنا ہے۔ اس کے علاوہ بنیادی حقوق کے رزولیوشن میں بھی بعض معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کا جو ہمیں مطلوب تھیں ذکر کر دیا گیا تھا۔ یہ سب چیزیں گول میز کانفرنس کے بہت سے فیصلوں اور ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔

کانگریس اور برطانوی حکومت کے نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق تھا اور یہ بات قیاس میں نہیں آتی تھی کہ موجودہ صورت میں یہ فرق دور ہو سکتا ہے۔ بہت کم کانگریسیوں کو یہ توقع تھی کہ گول میز کانفرنس میں حکومت اور کانگریس کے درمیان کسی قسم کی مفاہمت ممکن ہے اور گاندھی جی کو بھی باوجود اپنی امید پروری کے کچھ زیادہ امید نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھے اور انھوں نے ٹھان لی تھی کہ آخر تک کوشش کرتے رہیں گے۔ ہم سب کی رائے تھی کہ خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو دہلی کے معاہدے کے مطابق ایک بار کوشش ضرور کرنی چاہیئے مگر دو اہم مسئلے تھے جن سے اندیشہ تھا کہ ہمارے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے میں حائل ہوں گے ہم اسی صورت میں جا سکتے تھے کہ ہمیں گول میز کانفرنس میں اپنے پورے مطالبات پیش کرنے کی آزادی دی جائے اور یہ کہہ کر کہ معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے یا کسی اور بہانے سے ہماری زبان بند نہ کی جائے۔ پھر اس کا بھی امکان تھا کہ [illegible]

حالات ہمیں گول میز کانفرنس میں نہ جانے دیں۔ شاید یہاں ایسی صورت پیش آتی کہ حکومت سے جنگ چھڑ جاتی اور ہم پر سختیاں شروع ہو جاتیں۔ اگر ہندستان میں ایسا واقعہ ہو جاتا اور ہمارے گھر میں آگ لگ جاتی تو یہ کتنی نامناسب بات ہوتی کہ ہمارا کوئی نمائندہ گھر کو جلتا چھوڑ کر لندن میں بیٹھا دستور اساسی وغیرہ کے متعلق نظری بحثیں کرتا رہے۔

ہندوستان میں صورت حال روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی۔ اس کے آثار ہر جگہ نظر آتے تھے مگر بنگال، صوبہ متحدہ اور صوبہ سرحد میں خاص طور پر نمایاں تھے۔ بنگال میں دہلی کے معاہدے کا کوئی اثر نہیں ہوا، جو حالت تھی وہی رہی۔ بلکہ اور بدتر ہو گئی۔ سول نافرمانی کے کچھ قیدی چھوڑ دیئے گئے تھے مگر ہزارہا سیاسی کارکن جو اصطلاحی طور پر سول نافرمانی کے قیدی نہیں تھے، اب تک جیل میں تھے ان کے علاوہ بہت سے نظربند قیدخانوں میں یا نظربندوں کے کیمپ میں قید تھے۔ لوگ اب تک "باغیانہ" تقریریں کرنے یا کسی اور قسم کی سیاسی جدوجہد کے الزام میں برابر گرفتار ہو رہے تھے۔ غرض عام طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ حکومت کی سختیوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کانگرس کے لئے بنگال کا مسئلہ غیر معمولی طور پر مشکل تھا اس لئے کہ وہاں تخویف پسندی اب تک موجود تھی۔ سچ پوچھئے تو کانگرس کی معمولی جدوجہد اور سول نافرمانی کے مقابلے میں تخویف پسندوں کی سرگرمیاں وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے بہت کم تھیں مگر ان کا شور بہت تھا اور اس لئے لوگوں کو ان کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ پھر ان کی وجہ سے کانگرس کے کام میں بھی دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں اس لئے کہ تخویف پسندی کی فضا پر امن عملی جدوجہد کے لئے سازگار نہیں تھی۔ حکومت کو ان کی وجہ سے انتہائی تشدد کا موقع مل گیا اور اس نے بلاتفریق تخویف پسندی

اور غیر تخویف پسندوں سب پر سختی شروع کردی۔

بہت مشکل تھا کہ پولیس اور مقامی انتظامی افسران خاص قوانین اور ضوابط سے جو تخویف پسندوں کے لئے بنائے گئے تھے، کانگریسیوں، کسان اور مزدور کارکنوں اور دوسرے لوگوں کے خلاف، جن کی سرگرمیاں انھیں ناپسند تھیں، کام نہ لیں۔ ممکن ہے کہ بہت سے نظر بندوں کا جو بغیر کسی الزام یا تحقیقات یا سزا کے برسوں سے قید تھے، اصلی جرم تخویف پسندانہ جدوجہد نہیں بلکہ کسی اور قسم کی موثر سیاسی جدوجہد ہو۔ انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ انھوں نے کون سا گناہ کیا ہے ان پر مقدمہ اسی لئے نہیں چلایا جاتا ہوگا کہ پولیس کے پاس انھیں سزا دلانے کے لئے کافی شہادت نہ ہوگی حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ برطانوی ہند میں جرائم خلاف سرکار کے متعلق بہت مکمل اور جامع قوانین موجود ہیں جن کے جال سے نکلنا مشکل ہے اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص عدالت سے رہا ہوجاتا ہے مگر فوراً ہی دوبارہ گرفتار کرکے نظر بند کردیا جاتا ہے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی بنگال کے اس پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے سے معذور تھی وہ ہمیشہ اسی الجھن میں رہتی تھی اور آئے دن بنگال کا کوئی نہ کوئی معاملہ کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے رہا کرتا تھا۔ اس سے جو کچھ ہوسکتا تھا کرتی تھی مگر اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اصل میں اس جھگڑے کو نبٹانا اس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اس نے واقعات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس سے اس کی کمزوری ضرور ظاہر ہوتی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ موجودہ صورت میں وہ اور کیا کرسکتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے اس رویے سے بنگال میں ناراضی پھیل گئی اور لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ کانگریس کی مجلس عاملہ اور دوسرے صوبے بنگال سے بے پروائی برت رہے ہیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نازک وقت میں سب بنگال کو چھوڑ کر الگ ہو گئے یہ خیال بالکل غلط تھا اس لئے کہ سارے ہندوستان کو بنگال سے انتہائی ہمدردی تھی مگر اس ہمدردی کو عملی صورت میں لانے کی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر صوبے کے لوگ خود اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔

صوبہ متحدہ کے کاشتکاروں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ صوبے کی حکومت ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی اور لگان اور مالگذاری کی تخفیف کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرتی تھی اس نے جبریہ وصولی شروع کر دی تھی ہر جگہ بے دخلیاں اور قرقیاں ہو رہی تھیں جن دنوں ہم جیلوں میں تھے یہاں دو تین جگہ جبریہ وصولی کی وجہ سے بلوے بھی ہو گئے تھے۔ یہ بلوے یوں تو بہت معمولی تھے مگر بدقسمتی سے ان میں کوئی زمیندار یا اس کا کارندہ مار ڈالا گیا تھا۔ گاندھی جی اسی زمانے میں نینی تال گئے اور انہوں نے صوبہ متحدہ کے گورنر سر مالکم ہیلی سے کاشتکاروں کے معاملے میں گفتگو کی۔ مگر اس گفتگو کا خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ جب حکومت نے تخفیف کا اعلان کیا تو وہ لوگوں کی توقعات سے بہت کم تھی۔ دیہات میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور روز بروز بڑھتی جاتی تھی کاشتکاروں پر حکومت اور زمینداروں کا متحدہ دباؤ پڑ رہا تھا۔ ان کے کھیت چھینے جا رہے تھے، اور ان کے برتن بھانڈے قرق ہو رہے تھے۔ یہ صورت اگر کسی اور ملک میں ہوتی تو کاشتکاروں میں عام شورش پھیل جاتی۔ میرے خیال میں یہ زیادہ تر کانگریس کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کسان تشدد سے باز رہے مگر ان پر دل کھول کر تشدد کیا جا رہا تھا۔

کاشتکاروں کی بے چینی اور مصیبت کا ایک روشن پہلو بھی تھا۔ زراعتی پیداوار کی ارزانی کی وجہ سے غریبوں کو پیٹ بھر کھانے کو مل جاتا تھا جو انھیں مدت سے نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس سے کاشتکار بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔

سو ان بیچاروں کے جن کی ساری پونجی ضبط ہو گئی تھی۔

بنگال کی طرح صوبہ سرحد کو بھی دہلی کے معاہدے سے امن نصیب نہیں ہوا۔ وہاں ہر وقت ایک کشاکش کی حالت رہتی تھی۔ حکومت فوجی طریقے کی تھی، جس میں خاص قوانین اور ضوابط سے کام لیا جاتا تھا اور ذرا ذرا سے قصور پر بہت سخت سزائیں دیجاتی تھیں۔ اس استبداد کا مقابلہ کرنے کے لئے عبد الغفار خاں نے ایک زبردست تحریک اٹھائی اور تھوڑے دن میں حکومت انھیں ہوّا سمجھنے لگی۔ چھ فٹ تین انچ کا یہ شاندار پٹھان گاؤں گاؤں پیدل پھرتا تھا اور سُرخ پوشوں کے مرکز قائم کرتا تھا۔ جہاں جہاں یہ سردار یا اس کے خاص خاص مددگار پہنچتے تھے وہاں سُرخ پوشوں کا ایک سلسلہ بنتا جاتا تھا اور تھوڑے دن میں خدائی خدمتگاروں کی انجمن کی شاخیں سارے صوبے میں پھیل گئیں۔ یہ لوگ بالکل با امن تھے اور باوجودیکہ ان پر بہت سے بہم الزامات لگائے گئے لیکن کسی طرح یہ ثابت نہ ہو سکا کہ انھوں نے ایک بار بھی تشدد سے کام لیا۔ مگر وہ با امن ہوں یا نہ ہوں یہی کیا کم تھا کہ وہ جنگ جدل کی روایات کے وارث ہیں اور سرحد کے قریب رہتے ہیں ان کی منضبط تحریک کو، جو ہندوستان کی قومی تحریک سے وابستہ تھی۔ اس تیزی سے بڑھتے دیکھ کر حکومت بدحواس ہو گئی۔ شاید اسے یقین نہ آتا تھا کہ ان کا امن اور عدم تشدد کا دعویٰ سچا ہے۔ لیکن اگر وہ اسے یقین بھی کر لیتی تب بھی اسے خوف اور پریشانی ضرور ہوتی۔ ان کی تحریک کی واقعی اور امکانی قوت اتنی بڑی تھی کہ حکومت اسے سکون قلب کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس عظیم الشان تحریک کے مسلمہ رہنما عبد الغفار خاں تھے جو "فخر افغان" اور "سرحدی گاندھی" کہلاتے تھے۔ انھیں صرف اس وجہ سے صوبہ سرحد میں حیرت انگیز ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی تھی کہ وہ خاموشی اور استقلال سے

کام کرتے تھے اور کسی قسم کی مشکلات اور حکومت کی سختیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے
آج کل کی سیاست کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں ان کے لحاظ سے وہ کوئی سیاسی آدمی
نہیں ہیں انھیں سیاست کے داؤں پیچ اور چالیں نہیں آتیں وہ ایک راست قامت
راستباز آدمی ہیں۔ شور مچانا اور باتیں بنانا نہیں جانتے۔ وہ ہندستان کی آزادی کے
ساتھ اپنے صوبہ سرحد کی آزادی چاہتے ہیں مگر دستور اساسی کے مسائل اور قانونی
موشگافیوں میں نہ انھیں کچھ دخل ہے اور نہ ان چیزوں سے کوئی دلچسپی ہے۔
انھوں نے دیکھا کہ کامیابی کے لئے عمل کی ضرورت ہے اور مہاتما گاندھی نے
با امن عمل کی جو عجیب و غریب مثال قائم کی تھی وہ انھیں پسند آ گئی اس لئے بحث
مباحثے اور قواعد و ضوابط کے بغیر انھوں نے اپنی قوم کی تنظیم شروع کر دی اور
اس میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

انھیں گاندھی جی سے ایک خاص اُنس ہے مگر ان کی طبیعت میں حجاب
بہت ہے اور وہ اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرنا چاہتے اس لئے ابتدا میں وہ ان سے
الگ الگ رہے۔ آگے چل کر دونوں کو مختلف معاملات پر گفتگو کرنے کے لئے ایک
دوسرے سے ملنے کی ضرورت پیش آئی اور پھر تعلقات کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ تعجب ہوتا ہے
کہ کس طرح اس پٹھان نے عدم تشدد کو نہ صرف عملی طور پر اختیار کیا بلکہ اس کے
اصول کو بھی تسلیم کر لیا جو ہم میں سے اکثر نے پورے طور پر نہیں کیا تھا۔ اسی خلوص
کی وجہ سے انھیں اس میں کامیابی ہوئی کہ انھوں نے صوبہ سرحد کے لوگوں کو سخت
اشتعال کے باوجود تشدد سے باز رکھا۔ یہ کہنا تو بالکل فضول ہے کہ صوبہ سرحد کے
باشندوں نے تشدد کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔ ایک اسی پر کیا موقوف ہے
کسی صوبے کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ عوام جذبات کے جوش میں
کام کرتے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ جوش میں آ کر کیا کچھ نہ کر گذریں گے۔

مگر جس ضبط نفس سے صوبہ سرحد کے باشندوں نے ۱۹۳۰ء میں اور اس کے بعد کام لیا وہ ایک حیرت انگیز چیز ہے۔

سرکاری ملازم اور ہمارے بعض ڈرپوک ہم وطن سرحدی گاندھی کو شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھیں یقین نہیں آتا کہ وہ اپنے قول پر عمل کریں گے اور سمجھتے ہیں کہ اس میں ضرور کوئی گہری سازش ہے۔ مگر پچھلے چند سال میں ہندوستان کے اور حصوں کے کانگریسی کارکنوں کو عبدالغفار خاں اور سرحد کے دوسرے رفیقوں سے بہت کچھ سابقہ رہا ہے۔ ان میں آپس میں گہری دوستی ہو گئی ہے اور ایک دوسرے کی بڑی قدر اور عزت کرنے لگے ہیں۔ یوں تو عبدالغفار خاں کو کانگریس والے برسوں سے جانتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں مگر اب ان کی حیثیت محض انفرادی نہیں رہی بلکہ وہ سارے ہندوستان کی نظر میں اس بہادر اور جرّار قوم کی شجاعت اور قربانی کے مظہر بن گئے ہیں جو ملک کی جنگ آزادی میں ہمارے دوش بدوش رہی۔

ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب میں نے عبدالغفار خاں کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ جن دنوں میں کیمبرج میں پڑھتا تھا وہ لندن کے سینٹ ٹامس اسپتال میں طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بعد جب میں لندن میں آیا اور بیرسٹری کے لئے انر ٹیمپل میں داخل ہوا تو ہم دونوں میں بڑی دوستی ہو گئی اور کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ میں لندن میں موجود ہوں اور ان سے ملاقات نہ ہو۔ میں انھیں انگلستان میں چھوڑ کر ہندوستان آگیا اور وہ بہت عرصے تک وہاں رہے اور جنگ کے زمانے میں ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد پھر ان سے نینی جیل میں ملاقات ہوئی۔

صوبہ سرحد کے سرخ پوش کانگریس کے ساتھ کام کرتے تھے مگر ان کی انجمن اب تک علیحدہ تھی۔ یہ ایک انوکھے قسم کا تعلق تھا جس میں عبدالغفار خاں کی ذات

واسطے کا کام دیتی تھی۔ ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں ورکنگ کمیٹی نے صوبہ سرحد کے لیڈروں کے ساتھ مل کر اس مسئلے پر اچھی طرح غور کیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ "سرخ پوش" کانگرس میں ضم کر لیے جائیں۔ اس طرح "سرخ پوشوں" کی تحریک کانگرس کے نظام کا ایک جزو بن گئی۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ کراچی کانگرس کے بعد سیدھے صوبہ سرحد جائیں۔ مگر حکومت نے اسے پسند نہیں کیا۔ آئندہ مہینوں میں جب سرکاری ملازم "سرخ پوشوں" کی جد و جہد سے نالاں تھے انھوں نے بار بار اصرار کیا کہ مجھے صوبہ سرحد جانے کی اجازت دی جائے تاکہ میں خود وہاں کی حالت کو دیکھوں مگر حکومت نے ایک نہیں سنی۔ میرا وہاں جانا بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ معاہدہ دہلی کی وجہ سے ہم یہ مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ حکومت کی ممانعت کے باوجود صوبہ سرحد میں داخل ہوں۔

ایک اور مسئلہ جو ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش تھا، فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ یہ وہی پرانا قصہ تھا جو نئے نئے بھیس بدل کر آتا تھا۔ گول میز کانفرنس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ برطانوی حکومت اسے سب پر مقدم رکھے گی اور ہر چیز کو اسی پر منحصر کر دے گی۔ کانفرنس کے ممبر جو سب کے سب حکومت کے نامزد کیے ہوئے تھے۔ اسی نظریے سے منتخب کیے گئے تھے کہ فرقہ وارانہ مسائل کی اہمیت بڑھ جائے۔ اور مشترک اغراض کے بجائے اختلافات پر زور دیا جائے۔ یہاں تک کہ حکومت نے بڑی دیدہ دلیری سے قوم پرور مسلمانوں کے کسی لیڈر کو نامزد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اگر کانفرنس برطانوی حکومت کے اشارے سے سب سے پہلے فرقہ وارانہ مسئلے میں الجھ گئی تو اصل سیاسی اور معاشی مسائل پر خاطر خواہ غور نہیں کیا جا سکے گا۔ ان حالات میں انکا کانفرنس میں شریک ہونا بیکار ثابت ہوگا۔ اس لئے انھوں نے ورکنگ کمیٹی سے کہا

کہ انھیں لندن اسی صورت میں جانا چاہیئے جب فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ سب فریقوں کی رضامندی سے ہو جائے۔ ان کا یہ خیال آگے چل کر صحیح ثابت ہوا، مگر اس وقت کمیٹی نے ان کی رائے کو نہیں مانا اور یہ فیصلہ کیا انھیں محض اس بنا پر لندن جانے سے انکار نہیں کرنا چاہیئے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل نہیں کر پائے۔ کمیٹی نے یہ کوشش کی کہ مختلف فرقوں کے نمائندوں سے مشورہ کر کے کوئی متفقہ تجویز پیش کی جائے۔ مگر اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

یہ ان بڑے مسئلوں میں سے چند مسئلے تھے جو ۱۹۳۱ء کی گرمیوں میں ہمارے سامنے پیش تھے۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، ملک کے ہر حصے کی مقامی کانگریس کمیٹیوں کی شکایتیں آرہی تھیں کہ سرکاری ملازموں نے فلاں فلاں موقع پر دہلی کے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ ان میں سے جو زیادہ اہم تھیں وہ ہم حکومت کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ادھر سے کانگریس والوں پر معاہدے کی خلاف ورزی کے الزام لگائے جاتے تھے۔ غرض دونوں طرف سے شکایتیں ہو رہی تھیں جو آگے چل کر اخباروں میں شائع کر دی گئیں ظاہر ہے کہ اس کا کانگریس اور حکومت کے تعلقات پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا مگر سچ پوچھیئے تو یہ چھوٹے چھوٹے جھگڑے بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اہمیت یہ تھی کہ ان سے ایک بنیادی کش مکش کا پتہ چلتا تھا۔ یہ کش مکش افراد پر منحصر نہ تھی بلکہ اس کی بنا ہماری قومی تحریک کی نوعیت اور ہمارے زرعی معیشت کی خرابی تھی اور اس کو دور کرنے کے لئے ادھوری کارروائیاں کافی نہیں تھیں بلکہ سارے نظام کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ ہماری تحریک کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی ہندوستان کا اونچا اوسط طبقہ اظہار خودی اور نشو و نما کے ذریعے ڈھونڈھتا تھا اس کی تہہ میں سیاسی اور معاشی محرکات پوشیدہ تھے۔ پھر اس تحریک

میں نچا اوسط طبقہ بھی شامل ہوگیا اور اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔ اس کے بعد یہ لہر دیہات کے عام طبقے میں پہنچی جو بحیثیت مجموعی انتہائی پستی کی حالت میں تھا اور جسے اس کے لیے اس پست ترین معیار زندگی کو قائم رکھنا بھی روز بروز دشوار ہوتا جاتا تھا۔ پرانی دیہی معیشت جس میں ہر گاؤں اپنی کل ضرورتیں خود پوری کرلیتا تھا کب کی ختم ہو چکی تھی۔

گھریلو صنعتیں جو زراعت کی معاون تھیں اور کسی حد تک زمین کا بوجھ بٹاتی تھیں مٹ چکی تھیں۔ اس میں کچھ تو حکومت کی پالیسی کو دخل تھا مگر بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ صنعتیں مشین کی بڑھتی ہوئی صنعت کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔ غرض زمین کا بوجھ بڑھتا جاتا تھا اور ہندوستان کی صنعتی ترقی کی رفتار اس قدر سست تھی کہ اس سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی تھی۔ ہمارے بے ساز و سامان گاؤں کو یکایک دنیا کے بازار سے سابقہ پڑا اور وہ تنکے کی طرح اس سمندر میں جھکولے کھانے لگا۔ وہ حریفوں سے برابر کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے پیداوار کے ذرائع ناقص تھے اور اس کے نظام آراضی نے کھیتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر ڈالے تھے جس کی وجہ سے کسی بنیادی اصلاح کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ زراعت پیشہ طبقے، یعنی زمیندار اور کسان، دونوں کی حالت گرتی جاتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی چند روزہ کی گرم بازاری کے زمانے میں کچھ سنبھل جایا کرتی تھی۔ بڑے زمیندار اس بوجھ کو اپنے اسامیوں پر ڈالنا چاہتے تھے۔ کسان اور چھوٹے زمیندار بڑھتے ہوئے افلاس سے تنگ آکر قومی تحریک کی طرف ڈھل گئے تھے۔ دیہات کے بے مایہ طبقے یعنی بے شمار زرعی مزدور بھی ادھر کھنچ رہے تھے۔ ان سب دیہاتی طبقوں کے نزدیک "قومیت" یا "سوراج" کے معنی یہ تھے کہ نظام اراضی میں کوئی بنیادی تبدیلی ہو جس سے ان کا بوجھ ہلکا ہو اور ان لوگوں کو جو زمین سے محروم ہیں، زمینیں مل جائیں۔ مگر ان خواہشات کا اظہار واضح طور پر نہ تو

خود کاشتکاروں کی طرف سے ہوا تھا اور نہ قومی تحریک کے لیڈروں کی طرف سے جو اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اتفاق سے ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک اور عالمگیر کساد بازاری کا ساتھ ہوگیا جس کا احساس ابتدا میں خود اس کے لیڈروں کو بھی نہ تھا۔ دیہات کے باشندوں پر اس کساد بازاری کا بہت شدید اثر پڑا اور کانگریس اور سول نافرمانی کی طرف دوڑے۔ ان کے لئے اس کا سوال نہ تھا کہ لندن میں یا کسی اور جگہ ایک عمدہ سا دستور اساسی مرتب کیا جائے بلکہ اس کا کہ نظام اراضی میں بنیادی تبدیلی ہو خصوصاً ان صوبوں میں جہاں زمینداری طریقہ رائج ہے۔ سچ پوچھئے تو زمینداری نظام اپنا وقت پورا کر چکا ہے اور اب اس میں کچھ جان نہیں رہی ہے مگر برطانوی حکومت اپنی مصلحتوں کے لحاظ سے نظام اراضی میں اس بنیادی تبدیلی کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے شاہی زرعی کمیشن مقرر کیا تو ملکیت اراضی یا طریق لگان داری کا سوال اس کے موضوع بحث سے خارج کر دیا گیا۔

غرض ہندوستان میں اس وقت جو کشمکش تھی وہ ایک بنیادی چیز تھی اور الفاظ کے منتر یا سمجھوتے کے جادو سے دور نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ مشکل تبھی آسان ہو سکتی تھی جب (علاوہ اور اہم قومی مسائل کے) زمین کا بنیادی مسئلہ حل کیا جائے اور برطانوی حکومت کی مدد سے اس مسئلے کے حل ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ عارضی تدبیروں سے لوگوں کے کچھ آنسو پونچھ جائیں یا انتہائی سختی کرکے ان کی زبانیں بند کر دی جائیں مگر اس سے مسئلہ تو حل ہونے سے رہا۔

برطانوی حکومت کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سارا جھگڑا چند شورش برپا کرنے والوں کی وجہ سے ہے۔ شاید اکثر حکومتوں کی سمجھ ایسی ہی ہوتی ہے یہ خیال بالکل بے سروپا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کو پندرہ برس سے ایک

بہت بڑا لیڈر مل گیا ہے جس سے اس کے کروڑوں باشندوں کو محبت اور عقیدت ہو گئی ہے اور وہ بہت سے امور میں اس کی مرضی پر چلتے ہیں۔ اسے ہماری موجودہ تاریخ میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے مگر اس سے بھی زیادہ اہم وہ قوم ہے جو بظاہر آنکھ بند کر کے اس کا حکم مانتی ہے۔ کام جو کچھ کیا ہے وہ قوم ہی نے کیا ہے اور اس کے عمل کی محرک تاریخی قوتیں ہیں جنھوں نے اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ اپنے لیڈر کی بات سنیں اور سمجھیں۔ لیڈر کی حیثیت سے گاندھی جی کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ لوگوں کی نبض پہچانتے ہیں اور یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ کام کس وقت شروع کرنا چاہیئے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی قومی تحریک کچھ دنوں کے لئے ابھرتی ہوئی سماجی قوتوں سے مل گئی تھی، اس وجہ سے اس کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور اس میں اصلیت کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تاریخ کے ساتھ قدم ملا کر چل رہی ہے کانگریس اس قومی تحریک کی حامل تھی اور اس کی قوت نے کانگریس کے اثر کو بہت بڑھا دیا تھا۔ یہ ایک مبہم اور غیر متعین چیز تھی مگر اس کے وجود میں کوئی شبہ نہ تھا کسانوں کے شریک ہو جانے سے کانگریس کو بڑی تقویت پہنچی تھی اور نیچا اوسط طبقہ تو اس کے لئے قلب لشکر کا کام دیتا تھا۔ شہر کا اونچا اوسط طبقہ بھی زمانے کے رنگ کو دیکھ کر اپنی سلامتی اسی میں سمجھتا تھا کہ کانگریس سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ ہندوستان کے پارچہ بافی کے اکثر کارخانوں نے کانگریس کے مجوزہ اقرار نامہ پر دستخط کر دیئے تھے اور کوئی ایسی بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے جس میں کانگریس کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ادھر لندن میں لوگ گول میز کانفرنس میں قانونی باریکیاں چھانٹ رہے تھے اور ادھر اصل قوت کا دھارا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر کانگریس کی طرف بہتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ فریب نظر معاہدہ دہلی کے بعد اور بھی بڑھ گیا۔

دھواں دھار تقریروں کی وجہ سے نہیں بلکہ سنہ ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کے واقعات کی وجہ سے سچ پوچھئے تو آنے والی مشکلوں اور خطروں کا اندازہ صرف کانگریس کے لیڈروں کو تھا اور وہی ان کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے تھے۔

لوگوں کے ذہن میں ایک مبہم سا احساس تھا کہ ملک میں دو برابر کی قوتیں کارفرما ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات حکومت کو بہت ناگوار تھی۔ واقعی حیثیت سے یہ خیال بالکل بے بنیاد تھا۔ اس لئے کہ ظاہری قوت سراسر حکام کے ہاتھ میں تھی مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دلوں پر کانگریس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک تحکم پسند غیر ذمہ دار حکومت کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی اور یہی چیز تھی جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ دیہات میں چند تقریریں ہوتے یا دو چار جلوس نکلنے کی شکایت جو اس کی طرف سے کی گئی محض ایک بہانہ تھا۔ غرض یہ صاف نظر آرہا تھا کہ لڑائی ہو کر رہے گی۔ اس لئے کہ نہ تو کانگریس خودکشی کی مرتکب ہو سکتی تھی اور نہ حکومت اس دوعملی کو برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ کانگریس کو کچل کر رکھ دے گی دوسری گول میز کانفرنس کی وجہ سے یہ لڑائی کچھ دن کے لئے ٹل گئی۔ خدا جانے کیوں برطانوی حکومت گاندھی جی کو لندن بلانے کے لئے بے چین تھی اور یہاں تک ممکن تھا کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ان کا جانا رک جائے۔

پھر بھی لڑائی کے آثار بڑھتے جاتے تھے اور یہیں حکومت کی کشیدگی صاف محسوس ہو رہی تھی معاہدہ دہلی کے تھوڑے ہی دن بعد لارڈ اروِن ہندوستان سے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ پر لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہو کر آئے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ نئے وائسرائے بہت سخت آدمی اور اپنے پیشرو کی طرح مصالحت کو پسند نہیں کرتے۔ ہمارے اکثر لیڈروں نے لبرل پارٹی کی یہ عادت سیکھ لی ہے کہ سیاسی معاملات کو اصول کے لحاظ سے نہیں بلکہ اشخاص کے لحاظ سے دیکھتے ہیں۔

وہ یہ نہیں جانتے کہ برطانوی حکومت کی عام پالیسی وائسرائوں کے شخصی خیالات پر منحصر نہیں ہوتی۔ اس لئے وائسرائے کے بدل جانے کا نہ کوئی اثر ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ اتفاقی بات تھی کہ واقعات کی رفتار کے لحاظ سے حکومت نے رفتہ رفتہ اپنی پالیسی بدل دی۔ سول سروس والوں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ حکومت کانگرس سے معاہدہ کرے۔ ان کی ساری تربیت اور تحکم پسندانہ خیالات اس کے مخالف تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی سے برابری کا برتاؤ کر کے حکومت نے ان کا رعب اور کانگرس کا اثر بہت بڑھا دیا اور اب اس کی ضرورت ہے کہ ذرا ان کا دماغ درست کر دیا جائے۔ یہ ایک احمقانہ خیال تھا اگر ہندوستان کی سول سروس کی پرواز فکر کچھ بہت اونچی نہیں ہوا کرتی۔ بہر حال کسی نہ کسی وجہ سے حکومت تن کر بیٹھ گئی اور اس نے سختی سے کام لینا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ توریت کے الفاظ میں ہم سے کہہ رہی ہے "میری چھنگلی میرے باپ کی رانوں سے زیادہ موٹی ہے، اس نے تو تمھیں کوڑے ہی لگائے تھے میں بچھوؤں سے کٹواؤں گا"

مگر ابھی سزا کا وقت نہیں آیا تھا۔ یہ کوشش ہو رہی تھی کہ کانگرس کا نمائندہ گول میز کانفرنس میں بھیجا جائے۔ گاندھی جی نے دو بار شملے جا کر وائسرائے اور دوسرے حکام سے مختلف مسائل پر خصوصاً صوبہ سرحد کی سرخ پوشوں کی تحریک اور صوبہ متحدہ کے کاشتکاروں کی حالت پر گفتگو کی۔ بنگال کے مسائل کے علاوہ یہی دو مسائل حکومت کو سب سے زیادہ پریشان کر رہے تھے۔

گاندھی جی نے مجھے شملے بلوالیا اور میں بھی حکومت ہند کے بعض اراکین سے ملا۔ میری ان کی گفتگو صرف صوبہ متحدہ تک رہی۔ ان سے صاف صاف باتیں ہوئیں اور ان اصل نزاعی معاملات پر بحث ہوئی جو چھوٹی چھوٹی شکایتوں کی تہ میں پوشیدہ تھے۔ ہم سے یہ کہا گیا کہ فروری ۱۹۳۱ء میں حکومت چاہتی تو سول نافرمانی کی تحریک

تین مہینے میں مکمل کر کے وہی سیاست کی مشین کپل کانٹے سے درست تیار کھڑی
تھی صرف ایک بٹن دبانے کی دیر تھی مگر یہ سمجھ کر کہ باہمی رضامندی سے تصفیہ ہو جائے
تو اچھا ہے اس نے تجربے کے طور پر گفت و شنید کا سلسلہ چھیڑا جس سے دہلی کے
معاہدے کی صورت نکل آئی۔ اگر معاہدے میں کامیابی نہ ہوتی تو وہ بٹن تو موجود
ہی تھا، فوراً دبا دیا جاتا۔ اس میں اشارہ بھی تھا کہ اگر تم نے شرارت کی تو بہت جلد
اس بٹن کو دبانے کی ضرورت پڑے گی۔ یہ سب باتیں بڑے شائستہ الفاظ
میں کہی گئیں۔ مگر دونوں فریق اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کچھ بھی کہیں، اور
کچھ بھی کریں لڑائی تو ہو کر رہے گی۔

ایک اور اعلیٰ حاکم نے کانگرس کی بڑی تعریف کی۔ ہم اس وقت
بیچ ترغیر سیاسی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ
است سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو کانگرس نے ہندوستان کی
ی خدمت کی ہے۔ ہندوستانیوں پر عموماً یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان
ں تنظیم کا مادّہ نہیں مگر ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے سخت مشکلات اور مخالفت
ے باوجود تنظیم کا حیرت انگیز نمونہ دکھا دیا۔

جب گاندھی جی پہلی بار شملے گئے تو ان کے گول میز کانفرنس میں جانے
سلہ طے نہیں ہو سکا تھا۔ اگست کے دوسرے ہفتے میں وہ دوبارہ وہاں
لیف لے گئے۔ اب ادھر یا ادھر فیصلہ کرنا تھا۔ مگر وہ اب بھی ہندوستان
ں حالت میں چھوڑ کر جاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ بنگال، صوبہ سرحد
ہ متحدہ میں آثار اچھے نظر نہیں آتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ جبتک
ن نہ ہو جائے کہ ہندوستان میں امن قائم رہے گا اس وقت تک نہ
ں۔ آخر حکومت سے کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو گیا جو ایک اعلان یا چند

خطوط کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ بہت تنگ وقت میں ہوا جب گول میز کانفرنس کے نمائندوں کا آخری جہاز روانہ ہونے ہی کو تھا۔ ایک اسپیشل ٹرین شملے سے کالکا روانہ ہوئی اور دوسری گاڑیاں روک دی گئیں تاکہ گاندھی جی کو ہر جگہ گاڑی ملتی جائے۔

میں ان کے ساتھ شملے سے بمبئی گیا اور وہاں اگست کے آخر کی ایک روشن صبح کو انھیں خدا حافظ کہا اور ان کے جہاز کو بحرِ عرب میں مغرب کے سمت جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد دو برس تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

مصنّف کی دوسری کتاب

تاریخِ عالم

Glimpses of World History.

کا ترجمہ

یہ پنڈت جی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو موصوف وقتاً فوقتاً اپنی عزیز بیٹی اندرا دیوی کو بھیجتے رہے ہیں۔ اس میں تاریخ کے ادوار کو تاریخی انداز میں بیان کرتے ہوئے واقعات کی مفید اور سبق آموز تعبیر بھی پیش کی گئی ہے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

RULES:

1. The book must be returned on the date stamped above.

2. A fine of Re. 1/- per volume per day shall be charged for text-books and 10 P. per vol. per day for general books kept over-due.